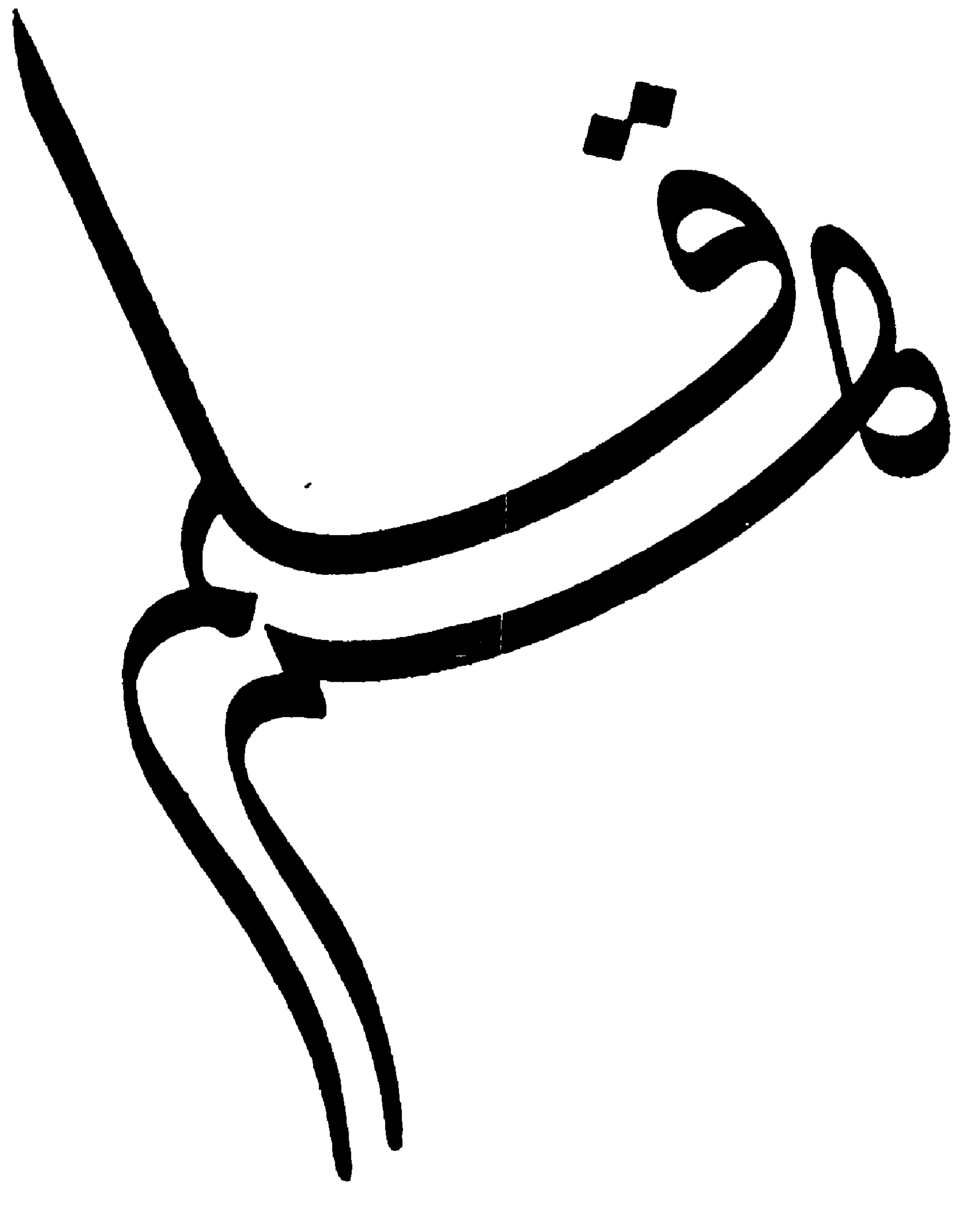
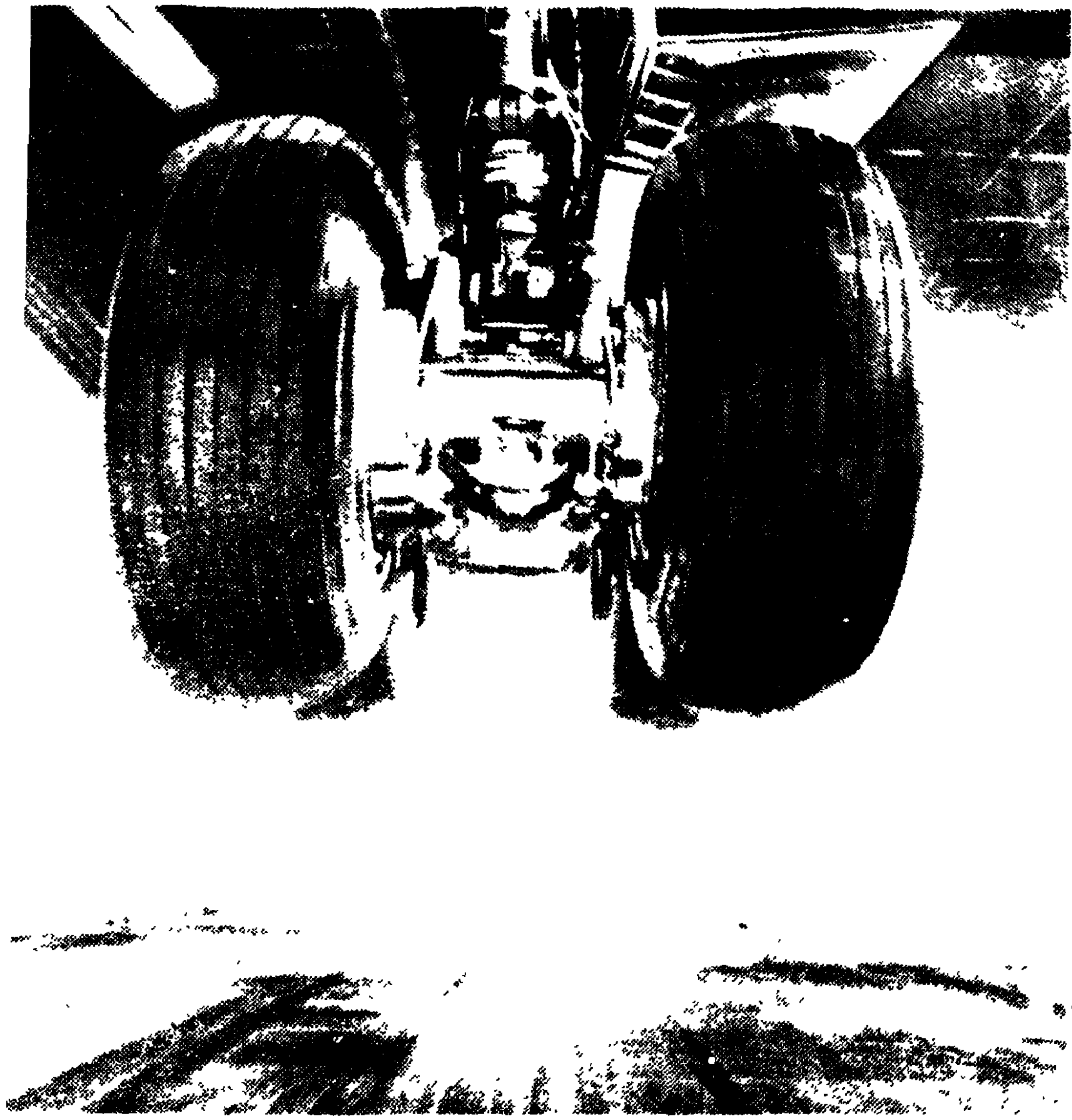




پی آئی اے کی بے مثال پابندیٔ وقت

۱۹۶۳ میں پی آئی اے کے ہوائی جہازوں کی بر وقت آمد و رفت کا اوسط ۸۹ فیصد تھا جو ہوابازی کی تاریخ میں مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ پی آئی اے کے ہوائی جہازوں کو ۱۹۶۵ء تک ہر وقت پرواز کرنا پڑتی ہے۔ کارکردگی کا اتنا اعلیٰ معیار یوں ہی حاصل نہیں ہوتا بلکہ مسلسل محنت اور بہتر سے بہتر نتائج حاصل کرنے کے لئے اس جدید و ترقی پذیر ایرلائن کی انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ پی آئی اے گو شروع ہی سے منفعت بخش ایرلائن رہی ہے لیکن پچھلے سال اس کے ذریعے سفر کرنے والوں کی تعداد میں ۴۸ فی صد سے بھی زیادہ کا اضافہ ہوا انہی باتوں کو دیکھتے ہوئے تجربہ کار مسافر کہہ اٹھتے ہیں کہ پی آئی اے واقعی بڑے لوگوں کی پرواز ہے، لاجواب پرواز ہے

شنگھائی ۔ کینٹن ۔ ڈھاکہ ۔ کراچی ۔ تہران ۔ بیروت ۔ روم ۔ جنیوا ۔ ماسکو ۔ فرینکفرٹ ۔ لندن



پاکستان
انٹرنیشنل
ایرلائنز

باکمال لوگ
لاجواب پرواز


دورانِ خون کے
حیرت انگیز حقائق!
کیا آپ جانتے ہیں کہ
• ہمارے خون میں ۳۰ ہزار ارب سرخ ذرات ہوتے ہیں۔ ان کی فنا و بقا کا سلسلہ ہر لحظہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ محض ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ ذرات ختم ہو کر اُن کی جگہ نئے ذرات پیدا ہو جاتے ہیں۔
• ہمارا خون ایک لاکھ میل لمبی شریانوں اور وریدوں میں چودہ ہزار پائنٹ یومیہ کے حساب سے گردش کرتا ہے حالانکہ ہمارے جسم میں صرف چودہ پائنٹ خون ہوتا ہے۔
• ہمارے ذرات کی اقسام اس قدر ممیز اور متعدد ہیں کہ انگوٹھے کے نشان کی طرح ان کی الگ الگ شناخت ممکن ہے۔
• ہمارا خون ہر وقت جراثیم سے برسرِپیکار رہتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں جو فاسد مادے پیدا ہوتے ہیں ان کو جسم سے خارج کرتا رہتا ہے۔ اس کارکردگی پر بیماری سے بچاؤ کا انحصار ہے۔
صافی کے مستقل استعمال سے خون کی اس قدرتی کارکردگی کو تقویت پہنچایئے۔
صافی خون کو فاسد مادوں سے پاک کرتی ہے اور اس طرح سرخ ذرات کی پیدائش اور افزائش کے موانع کو دور کر کے صحت کو برقرار رکھتی ہے۔
صافی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
SAFI
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرشں اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوقِ انسانی پر ایمان رکھتے ہیں جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے ہمیں اپنی عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حُبِ وطن کی قدروں کی نشوونما بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے کماحقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرہ کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں اور جہاں دولت واقتدار انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں اسی لئے ہم علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوشحالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بتاریخ ۳۱ جنوری ۵۹ء منظور ہوا)

ہم قلم

جلد ——— ۵

شمارہ ——— ۲-۳

ستمبر، اکتوبر ۱۹۶۴ء

قیمت ایک پرچہ :- ۷۵ پیسے
سالانہ :- ۶ روپے

(اراکین ادارہ مصنفین پانچ روپے)

ادارۂ مصنفین پاکستان

پاکستان رائٹرز گلڈ

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

چائے والا

ناول

اے حمید

ے حمید کی نثر اردو ادب میں منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے
ھوں نے تھوڑے ہی عرصے میں کئی زندہ رہنے والی تخلیقات پیش
ے ہیں اور "چائے والا" انہیں تخلیقات میں سے ایک ہے

قیمت چار روپے

گلڈ انجمن کتاب گھر وکٹوریہ روڈ صدر
کراچی

فہرست

مستقل عنوانات

مضامین

نظمیں

افسانے

لوک کہانی

غزلیں

طابع و ناشر اسد جمیل احسن عالی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارہ مصنفین پاکستان (مرکز) اسٹریٹ چمن روڈ
کراچی سے شائع کیا

گلڈ کی سرگرمیاں

سلسلہ روز و شب

افروایشیائی مصنفین کا پانچ نفری وفد جولائی ۱۹۶۷ء کو رات ۱۰ بجے کراچی پہنچا۔ ہوائی اڈے پر اس کا استقبال پاکستان رائٹرز گلڈ کے مرکزی خزانچی جناب ابن انشاء، افسر انتظامیہ مسٹر شوکت صدیقی اور دیگر ممبران نے کیا۔ اس وفد میں چین، انڈونیشیا، گھانا اور کیمرون کے نمائندے شامل تھے۔ انڈونیشیا کے مسٹر رفاعی اس وفد کے سربراہ تھے۔

مسٹر رفاعی تقریباً ایک درجن سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ انڈونیشیا کی سب سے بڑی ثقافتی تنظیم "لیکرا" کے ممبر ہیں اور سرکاری اخبار "زمان بارو" کے ایڈیٹر ہیں۔ انڈونیشیا کی ثقافتی سرگرمیوں میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ جکارتہ کی میونسپل کونسل کے ۱۹۵۱ء سے ممبر چلے آرہے ہیں۔

مسٹر توشان تنگکھائی چین کی ڈرامہ ایسوسی ایشن کے وائس پریسیڈنٹ ہیں اور چین کی افروایشیائی کانفرنس کے رابطہ ممبر ہیں۔

گھانا کے مسٹر جوزف ایڈورڈ لانگ ڈان ایک مشہور ناول نگار اور شاعر ہیں۔ گھانا کے مصنفین کی سوسائٹی کے سکریٹری جنرل اور "زیانو" کے ادارہ کے پبلیکیشن افسر ہیں۔

عبدالقادر مگنڈی کیمرون کے ایک نوجوان ادیب ہیں وہ شاعر بھی ہیں اور ناول نگار بھی۔

افروایشیائی مصنفین کے اس وفد کا سب سے پہلا پروگرام ۱۱ جولائی ۱۹۶۷ء کی صبح کو قائداعظم کے مزار پر حاضری دینا تھا۔ وفد نے قائداعظم کے مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ قائداعظم کے مزار کی تعمیر میں خاصی دلچسپی کا اظہار کیا اور مزار کے منشی معمار سے تفصیلات معلوم کیں۔ وفد کے ساتھ قائداعظم کے مزار پر انجمن مصنفین پاکستان کے افسر انتظامیہ مسٹر شوکت صدیقی تھے۔ اس کے بعد انجمن مصنفین پاکستان نے وفد کے اعزاز میں میٹروپول ہوٹل میں استقبالیہ دعوت دی جس میں تقریباً ۳۰ مہمان شامل تھے۔ ان مہمانوں میں ادیب، شاعر، دانشور، سفارتی نمائندے اور اعلیٰ سرکاری حکام شامل تھے۔ انجمن مصنفین پاکستان کے قائم مقام سکریٹری جنرل جناب جمیل الدین عالی نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ پاکستان ایک نصب العینی ریاست ہے۔ آپ اپنے دورہ کے دوران جہاں جائیں گے دیکھیں گے کہ اس نصب العین کا تجربہ ہو رہا ہے۔ کشمیر کا ذکر کرتے ہوئے جناب جمیل الدین عالی نے کہا کہ یہ مسئلہ سیاسی ہی نہیں بلکہ ایک انسانی مسئلہ بھی ہے۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ اس کا ذکر کرنا پڑتا ہے کہ افروایشیائی مصنفین کے یہاں اس کا ذکر بہت کم ہوتا ہے جبکہ الجیریا، فارموسا، کانگو، انگولا اور کیوبا جیسے مسائل آپ کے یہاں زیر بحث آتے ہیں تو کیا مسئلہ کشمیر زیر بحث نہیں آسکتا۔ انہوں نے افروایشیائی مصنفین کے وفد سے اپیل کی کہ اس معاملہ پر غور کریں اور اس مسئلہ کو انسانی قدروں کے ساتھ دیکھیں کہ کشمیری عوام کس قدر مصائب میں مبتلا ہیں اور کس طرح ہندوستانی انہیں حق خوداختیاری سے پچھلے ۱۹ سال سے محروم کئے ہوئے ہیں کتنے مظالم ان پر توڑے جا رہے ہیں۔

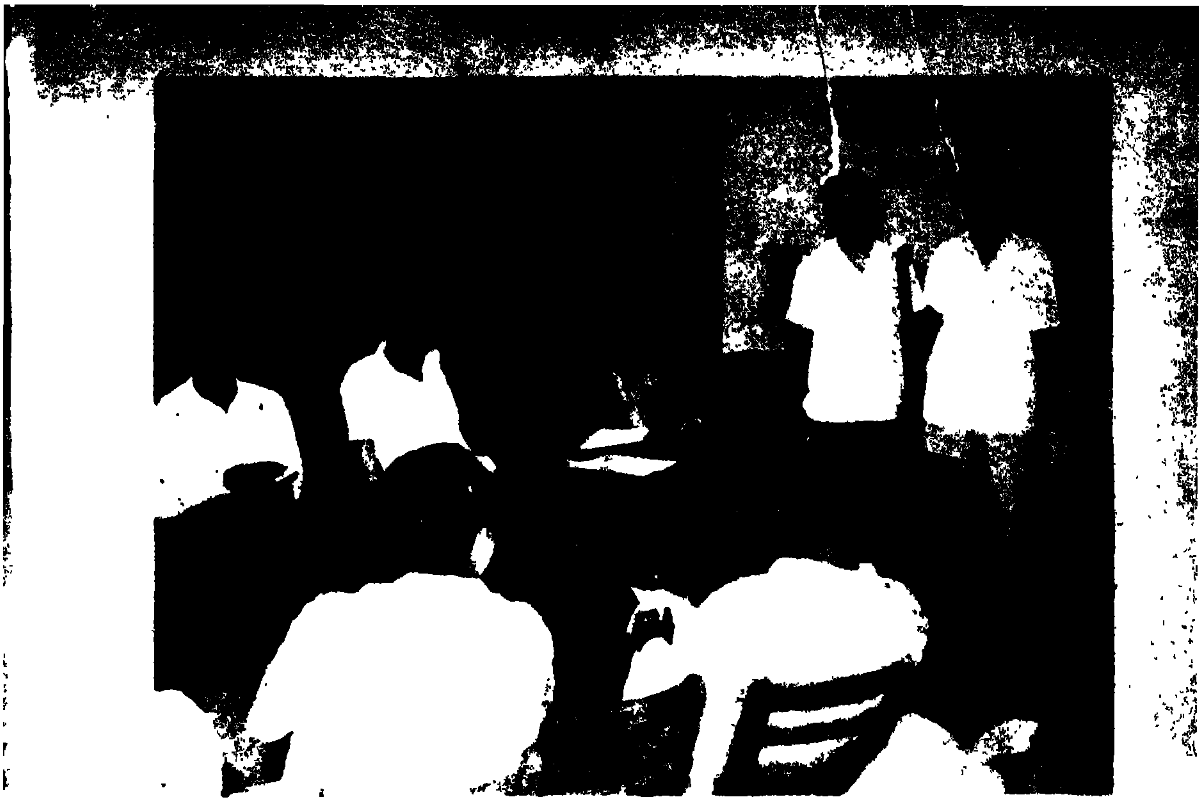
مسٹر جمیل الدین عالی نے افروایشیائی وفد کو یقین دلایا کہ



(دائیں) وفد کے اراکین مزار قائد اعظم پر، بائیں آخر میں گلڈ کے اعزازی افسر
انتظامیہ شوکت صدیقی ہیں (بائیں) لاہور میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی استقبالیہ
تقریب میں وفد کے سربراہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں

(نیچے) وفد کے سربراہ ہوٹل میٹروپول کراچی میں حاضرین سے خطاب کر رہے ہیں،
دائیں طرف پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری جنرل جمیل الدین عالی ہیں





(اوپر) ڈھاکہ میں وفد کے ایک رکن اپنی نظم سنا رہے ہیں، ساتھ میں بنگالی ترجمہ سنایا جا رہا ہے

(نیچے) وفد کے اراکین شوکت صدیقی، فضل شفائی اور مقامی شعرا کے ساتھ پشاور میں



مصنفین پاکستان افروایشیائی استحکام امن اور دوستی کے نصب العین پر گامزن رہے گا۔ اور ہر اس ادارے سے تعاون کرے گا جسکا نصب العین بھی یہی ہو۔

جناب عالی کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے وفد کے سربراہ جناب رفائی نے کہا کہ افروایشیائی ممالک میں اتحاد کی بڑی ضرورت ہے تاکہ نوآبادیاتی نظام اور سامراج کی پیدا کردہ رکاوٹیں دور کی جائیں دنیا میں امن اور خوشحالی کا راستہ ہموار ہو۔ انہوں نے کہا کہ اس دورے کا مقصد بھی باہمی تعاون اور اشتراک کو فروغ دینا ہے۔

میٹروپول کی دعوت استقبالیہ تقریباً ساڑھے سات بجے ختم ہوئی۔ اس کے بعد ادارہ مصنفین پاکستان نے وفد کے ممبران کے اعزاز میں ایک عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد شریک تھے۔ مہمانوں نے اپنی قومی زبان میں نظمیں پیش کیں اور اسکے بعد پاکستانی شعراء نے بھی قومی زبان میں اپنی اپنی نظمیں سنائیں۔

۱۲ جولائی کو وفد کے اعزاز میں پھر ایک ظہرانہ کا اہتمام تھا۔ اس میں بھی نامور شعراء اور ادیب شریک تھے۔ شام کو ان کے اعزاز میں سرکاری مہمان خانے میں ایک عشائیہ کا انتظام تھا۔ جس میں جناب ... ز حسن منیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک آف پاکستان نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ افریقہ اور عرب کی دوستی کوئی نئی بات نہیں ہے یہ صدیوں پرانی دوستی ہے انہوں نے اس سلسلے میں عرب تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مسلمان تبلیغ اسلام کے لئے افریقی ممالک پہنچے تھے اس سلسلے میں انہوں نے چین کا خاص طور پر ذکر کیا اور رسول اللہ صلعم کی وہ حدیث بھی بیان کی جس میں انہوں نے فرمایا تھا کہ "علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین ہی کیوں نہ جانا پڑے"۔

اگلی صبح وفد پی۔ آئی۔ اے۔ کے ذریعہ لاہور روانہ ہوا۔ مصنفین پاکستان کے افسر انتظامیہ جناب شوکت صدیقی وفد کے ہمراہ تھے۔ لاہور کے ہوائی اڈے پر وفد کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ان کے استقبال کرنے والوں میں مغربی پاکستان ریجن کے سیکریٹری جناب قتیل شفائی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، میرزا ادیب اور دیگر مشہور شعراء اور ادبا شامل تھے۔ ان کے قیام کا انتظام ہوٹل ایمبیڈر میں تھا۔ لاہور میں قیام کے دوران وفد علامہ اقبال کے مزار پر بھی حاضر ہوا اور پھولوں کی چادر چڑھائی تاریخی عمارتیں دیکھیں اور مقامی ادیبوں سے ملاقاتیں کیں۔ مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ نے وفد کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا جس میں مقامی شعراء صحافی اور دیگر سرکاری حکام شریک تھے۔ پروفیسر وقار عظیم نے اس تقریب کی صدارت کی۔ انہوں نے افروایشیائی ادیبوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا "افریقہ اور ایشیا کی مملکتوں کے درمیان دوستی کی مضبوط بنیادیں موجود ہیں۔ انمیں بیشتر حال ہی میں سامراج کے چنگل سے آزاد ہوئی ہیں اور وہ ایک دوسرے کے لئے ہمدردی اور خلوص رکھتی ہیں۔ انہوں نے کہا جسمانی آزادی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی، ذہنی آزادی اصل ضرورت ہے۔ اور اس کے لئے سب سے زیادہ ذمہ داری اہل قلم پر عائد ہوتی ہے —— انہوں نے افروایشیائی ادیبوں سے درخواست کی کہ وہ پاکستان کے اہل قلم کا یہ پیغام دونوں براعظموں تک پہنچا دیں۔

انڈونیشی شاعر مسٹر رفائی نے خطبہ استقبالیہ کے جواب میں کہا افروایشیائی ممالک کی سامراج شہنشاہیت اور نئے سامراج کے خلاف جدوجہد جاری ہے۔ اور عوام مکمل قومی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کوئی سچا ادیب اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا، کیونکہ ادیب عوام ہی میں سے ہیں انہیں لازمی طور پر عوام کی امنگوں آرزوؤں اور عزائم کی ترجمانی کرنی چاہیئے۔ مسٹر رفائی نے مزید کہا کہ سامراجی طاقتوں نے افروایشیائی ممالک میں قومی ثقافت کی نشو و نما کو دبایا ہے اور عوام کے اندر رنگ و نسل کے امتیازات پیدا کئے ہیں۔

گھانا کے ادیب اور ناول نگار جوزف ایڈورڈ لانگ ڈان نے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ افریقہ و ایشیا میں ایک خاموش انقلاب جاری ہے۔ اور یہ ایک ایسا انقلاب ہے جسے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

چینی ڈرامہ نویس ٹو ہسوان نے اپنی تقریر میں کہا کہ درۂ خیبر کے ذریعہ چین اور پاکستان کے درمیان جو ثقافتی اور اقتصادی رشتے دو ہزار سال پہلے قائم تھے بعد میں سامراجی طاقتوں نے منقطع کر دیئے تھے۔ اب جبکہ دونوں ملکوں نے غلامی کا طوق اتار کر پھر آزادی اور ترقی کے راستہ پر قدم رکھا ہے، وہ اپنے پرانے رشتوں کو دوبارہ استوار

کر رہے ہیں اور اب کوئی طاقت ان کو ایک دوسرے کے قریب آنے سے نہیں روک سکتی۔

۴ار جولائی کو افروایشیائی مصنفین کا یہ وفد بذریعہ طیارہ راولپنڈی پہنچا۔ چک لالہ کے ہوائی اڈے پر راولپنڈی کے مقامی صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور معززین نے ان کا استقبال کیا۔ پاکستان کے نئے دارالحکومت اسلام آباد میں نو تعمیر شدہ پاکستان ہاؤس میں وفد کی رہائش کا انتظام تھا۔ تھوڑی دیر بعد وفد اسلام آباد کے آس پاس کے علاقوں کی سیر کو گیا۔ اور اراکین نے اسلام آباد کی تعمیر کا خاص طور پر جائزہ لیا وفد کے اراکین اسلام آباد کے علاقے اس کی آب و ہوا اور طرزِ تعمیر سے بے حد متاثر ہوئے۔ مسٹر رفائی نے اخباری نمائندوں سے ملاقات کے دوران اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا کہ میرا وفد نئے دارالحکومت کے ماحول اور اسکے ڈزائن سے بے حد متاثر ہوا ہے، انہوں نے کہا حسین نظاروں میں گھرا ہوا یہ جدید دارالحکومت بہت ہی اچھا مقام ہے۔"

شام کو وفد کے اراکین دو ہزار سال پرانے کھنڈرات دیکھنے ٹیکسلا گئے وہاں انہوں نے سکندرِ اعظم کے زمانے کے آثار قدیمہ دیکھے۔ شام کو ان کے اعزاز میں راولپنڈی کلب میں ادارۂ مصنفین پاکستان کی شاخ نے ایک عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں مقامی شعراء و صحافی اور اعلیٰ سرکاری حکام اور عمائدین شہر شریک تھے۔

اگلی صبح یعنی ۱۰ جولائی کو یہ وفد پشاور روانہ ہوا پشاور میں وفد نے تاریخی مقامات کی سیر کی اور وہاں کے مقامی کھانوں میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا خصوصاً چپلی کباب اور وہاں کے نان بہت پسند کئے۔

شام کو وفد کے اعزاز میں ٹاؤن ہال میں ایک عشائیہ ترتیب دیا گیا۔ مہمان شعراء و مقامی شعراء نے اپنا اپنا کلام اپنی اپنی قومی زبانوں میں سُنایا۔

اگلی صبح یہ وفد افغانستان جانے کے لئے کابل روانہ ہو گیا۔ ہوائی اڈے پر مقامی صحافیوں، شاعروں، ادیبوں اور معززین شہر کی کثیر تعداد موجود تھی۔

۱۲ جولائی کو یہ وفد اپنا افغانستان کا دورہ ختم کر کے کراچی پہنچا۔ اور دو دن کے قیام کے دوران اراکین نے انجمن ترقی اردو کے دفاتر اور کتب خانۂ خاص دیکھا۔ بعد میں وفد کے اراکین نیشنل بک سینٹر گئے اور وہاں انہوں نے سینٹر کے مختلف شعبے دیکھے اور سینٹر کی کارکردگی سے بے حد متاثر ہوئے۔ جناب ابن انشاء جو سینٹر کے ایگزیکٹو سیکریٹری بھی ہیں نے بعد میں مہمانوں کی مشروبات سے تواضع کی۔

اس کے بعد یہ وفد مشرقی پاکستان کے دورے پر روانہ ہو گیا تیج گاؤں کے ہوائی اڈے پر وفد کا استقبال صوبے کے نامور شعراء، ادیبوں، صحافیوں، دانشوروں اور معززین شہر نے کیا۔ اس دورے کے دوران وفد کے اراکین نارائن گنج گئے اور وہاں صنعتی ترقی کی رفتار دیکھی اور بے حد متاثر ہوئے۔ بوڑھی گنگا میں انہوں نے کشتی رانی بھی کی جسے انہوں نے بہت پسند کیا۔

اگلی صبح وفد کے اراکین ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن گئے۔ جہاں انہوں نے اپنے دورے کے تاثرات ریکارڈ کرائے۔ شام کو وفد کے اعزاز میں بنگالی اکیڈمی میں ایک استقبالیہ دیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر شہید اللہ اور ڈاکٹر انعام الحق نے صوبے کے ادارۂ مصنفین پاکستان کی طرف سے وفد کا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد وفد کے اراکین بلبل اکیڈمی گئے جہاں ان کے اعزاز میں ایک ثقافتی پروگرام کا انتظام کیا گیا تھا۔ جسے دیکھ کر تمام اراکین بے حد محظوظ ہوئے۔ اس کے بعد وفد کے اراکین ایک ڈنر میں شریک ہوئے۔ جہاں اُن کو مختلف تحائف پیش کئے گئے جسکی انہوں نے بے حد تعریف کی۔ اس کے بعد نصف رات کے وقت افروایشیائی مصنفین کا یہ وفد اپنا کل پاکستان دورہ ختم کر کے شنگھائی جانے کیلئے ٹوکیو روانہ ہو گیا۔ ڈھاکہ کے ہوائی اڈے پر صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور بہت سے معززین شہر نے انھیں رخصت کیا۔

ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی حُبِ وطن کی قدروں کی نشو و نما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور دوستانہ تعلقات کے قیام سے متعلق ہے کما حقہٗ آگاہ ہیں"

(اقتباس از منشور انجمن مصنّفین)

امیر حمزہ شنواری

مقصدِ حیات

مقصدِ حیات کو اگر مادّی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے۔ تو زندگی امن مقصد سے خالی ہی نظر آئے گا۔ جیسے کہ کسی ایک مغربی فلاسفر یال ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان کائنات میں پھینک دیا گیا ہے۔ لیکن اس کا پھینکنے والا ہی کوئی ہے۔ اور نہ اس کی زندگی کے متعلق ہی ں مقصد کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اور ان کا یہ خیال ان کے نظریات پیشِ نظر صحیح بھی ہے۔ اس لئے کہ مقصد کا تعین تو ایک خالق، صانع جد ہی کی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ جو عالم اور حکیم بھی ہو۔ اور جہاں ے خالق صانع یا موجد ہی کو غیر موجود سمجھا جائے۔ تو پھر مقصدیت کا وال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان کے خیال میں جب مادۂ عالم بخود بغیر کسی محرک کے وجودِ انسانی تک پہنچتا ہے۔ تو اس میں عقل خود بخود ہی پیدا ہو جاتی ہے۔ بعینہٖ سنگِ مقناطیس کی مانند جس کے قوتِ تجاذب خود بخود پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ تو وہ اپنے ماحول سے مادہ کرنے لگ جاتا ہے۔ اور زندگی کے دوران اسے جن ضروریات تضیات کا سامنا ہوتا ہے ان کے مطابق اپنے لئے زندگی کا ایک مدتعین کر لیتا ہے۔ اور چونکہ مرنے کے بعد اس کی ہستی ختم ہو جاتی ہے۔ لئے بقول چکبست ؎

زندگی کیا ہے، عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے، انہی اجزاء کا پریشاں ہونا

کے ساتھ ہی اس کا مقصدِ حیات بھی ختم ہو کر رہ جاتا ہے، لیکن کے خلاف دنیا کے دوسرے دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ زندگی ایک مقصد کے گرد گھومتی ہے۔ اور کائنات کی تمام اشیاء ایک غایت اور مقصدیت کا تعاقب کر رہی ہیں۔ علامہ اقبال مرحوم نے ایک خطبہ میں تحریر فرمایا ہے کہ ”چونکہ فطرت کے عوامل میں پیش بینی اور تناسب کارفرما ہے۔ اس لئے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زندگی ایک مقصد ہی کے تحت کارفرما ہے۔“

اس کے متعلق مذاہبِ عالم خصوصاً اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ وجودِ انسانی کی دو حیثیتیں ہیں۔ مادّی اور روحانی۔ یعنی وجودِ انسانی دو چیزوں سے مرکب ہے۔ روح اور مادّہ۔ اور یا دورِ جدید کی اصطلاح میں، شعور اور مادّہ۔ اس لئے انسان کی ذمہ داریاں بھی دو ہی طرح کی ہیں۔ بہ حیثیت ایک مادّی وجود اس کی حیثیت محدود ہے۔ کیونکہ وہ فطرتِ مادّیہ کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے مجبور ہے۔ کہ وہ قانونِ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرے۔ وہ کسی طور بھی قانونِ فطرت کے خلاف ورزی کر کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کی زندگی مشین کے ایک پرزے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔

اس کی دوسری حیثیت روحانی ہے۔ اس لحاظ سے وہ آفاقیت کا حامل ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ کیلئے فطرتِ مادّیہ کا متبع ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس کا مزاج تخلیقی ہوا کرتا ہے۔ وہ اپنی تخلیقی فعالیت کے دوران عالمِ فطرت میں تصرف کرتا ہے۔ اور اشیائے عالم کو اپنے مقصد کے پیشِ نظر چھانٹتا ہے۔ وہ فطرت کی چھانٹ پر قطعاً قانع نہیں ہو سکتا۔ اسکی تخلیق اکثر فطرت کی تخلیق سے حسین تر اور مقصدیت لئے ہوتی ہے۔ اس لئے کہ وہ شعوری اور عقلی ہوتی ہے۔ سارتر کہتا ہے ”انسانی وجود کے اندر

یقیناً ایک ایسا عنصر موجود ہے۔ جو فطرتِ مادّیہ کی اصل سے نہیں۔ وہ وجودِ انسانی میں ایک اجنبی اضافہ ہے۔ وہ فطرتِ مادّیہ کا حاکم اور آمر ہے۔"

قرآن حکیم نے انسان کی ان دونوں حالتوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے "عالمِ خلق اور عالمِ امر صرف خدا ہی کے لئے ہیں۔" گویا انسان عالمِ امر اور عالمِ خلق کا ایک حسین امتزاج ہے۔ اور وجودِ انسانی کے ان اجزا میں اگر اعتدال و توازن ہوگا تو وہ ایک کامیاب زندگی سے ہمکنار ہوگا۔ اور جب وہ افراط و تفریط کا شکار ہوگا۔ اس کی زندگی بحران کی نذر ہوگی۔ اور وہ اس قابل ہی نہ ہوگا کہ اپنے لئے کسی واضح اور صحیح مقصد کا تعین کر سکے۔

انسانی وجود کے اندر کسی ایسی روح کا اثبات جو فطرتِ مادّیہ کی اصل سے نہ ہو۔ کچھ مشکل ہی ہے۔ لیکن چند باتوں کو زیرِ غور لانے سے اس کا ایک دھندلا سا تصور قائم ہو ہی جاتا ہے۔ جو عام وجدانِ انسانی کے لئے آگہی کا ایک ہلکا سا سایہ مہیا کر جاتا ہے۔ مثلاً ہم یہ مانے لیتے ہیں کہ انسان ایک مکمل مادّی وجود ہے۔ اور مادّیت کے علاوہ کسی روح وغیرہ سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ کوئی جزو اپنے کل سے اختلاف نہیں کر سکتا، اور نہ ہی اپنے کل پر غالب آسکتا ہے۔ فطرت کے مظاہر مجبور ہیں کہ وہ فطرت کے منشار کے مطابق ہی کار فرما ہوں۔ اور وہ اپنے کل سے کسی حالت میں سرتابی نہ کرنے پائیں، وہ یقیناً مشین کے پرزوں کی مانند ہونگے جو اضطراراً متحرک ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہم خود دیکھتے ہیں کہ دنیائے آب و گل میں اشیائے عالم کا عمل وہی کچھ ہوتا ہے جو مقتضائے فطرت ہو۔ ایک حیوان کو جب پیاس لگتی ہے تو وہ پانی کو دیکھتے ہی بے اختیار ہو کر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے، اسے پانی کی نوعیت کا بھی مطلق علم نہیں ہوتا۔ کہ وہ گرم سرد یا پینے کے قابل بھی ہے یا نہیں۔ اور جب اُسے بھوک ستاتی ہے، تو جہاں بھی اسے اپنی خوراک نظر آتی ہے بے اختیار ہو کر اسی طرف چل دیتا ہے۔ علیٰ ہٰذا وہ تمام حیوانی تقاضے فطرت مادّیہ کی تحریک کے تحت ہی پورا کرتا ہے۔ اور وہ کسی طور بھی فطری تقاضوں کو ضابطہ میں لانے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ لیکن اس کے بالکل خلاف انسان ان تمام فطری تقاضوں کو لگام دے سکتا ہے۔ وہ شدید پیاس کی حالت میں بھی پانی پینے کی خواہش کو روک سکتا ہے۔ وہ بھوکا ہوتے ہوئے بھی کھانے کا ارادہ ملتوی کر سکتا ہے۔ وہ فطری تحریکات کو قابو میں رکھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ وہ فطری ہیجان کو ضابطہ میں لاکر معتدل صورت دے سکتا ہے۔ جوش و غضب کی حالت میں ضبط و نظم برقرار رکھ سکتا ہے۔ وہ دیگر حیوانات کے بالکل خلاف اپنے بدن میں ترمیم کر سکتا ہے۔ اور اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ، اس کے اندر بقول سارتر ایک ایسا عنصر موجود ہے، جو فطرتِ مادیہ کا جزو نہیں، بلکہ فطرت میں ایک اجنبی اضافہ ہے جو فطرت کا حاکم اور منتظم ہے، اور یہی وہ عنصر ہے جسکی قسمت میں تسخیرِ کائنات کا افتخار لکھا جا چکا ہے۔ اور یہی وہ عنصر ہے کہ اگر وہ آزاد اور خود ارادیت کا حامل ہو تو انسان کے لئے زندگی کا صحیح مقصد متعین کر سکتا ہے۔ لیکن جب تک یہ عنصر آزاد اور خود ارادیت کا حامل نہ ہو۔ انسان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ اپنے لئے زندگی کا ایک ایسا مقصد متعین کر سکے، جس پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں وہ ایک کامیاب زندگی سے بہرہ مند ہو سکے۔

ادراک کے سلسلہ میں آپ فکر و وجدان کا جائزہ لیجئے۔ اور قوتِ حافظہ کو مدِ نظر رکھئے۔ اشیاء کا ادراک صرف وہی عنصر کر سکتا ہے جو خود مادّہ سے مجرد ہو۔ جزدیات کو کلیات میں تبدیل کرنا حیوانات کے بس کا روگ نہیں ایک ہی حافظہ میں بے شمار عکوس کا ایک ساتھ رہتے ہوئے آپس میں گڈمڈ نہ ہو جانا مادّی ذہن کا کام نہیں۔ اگر ذہن کلّی طور پہ مادّی ہوتا تو اس پر اس قدر لاتعداد بے شمار عکوس و نقوش کا آپس میں ملتے ہی یہ حال ہو جاتا۔ کہ کوئی نقش بھی اپنی صحیح حالت پہ قائم نہ رہنے پاتا۔ اگر ہم ذہن یا حافظہ کو مادّی ہی تسلیم کریں تو ضروری ہوگا کہ ہم نے ابتدائے زندگی سے کر آج تک جن اشیا کا مشاہدہ کیا ہے، اور ان کے نقوش بتدریج ہمارے حافظہ پر ثبت ہو چکے ہیں تو تذکرے کے موقع پر بھی وہ ہم کو حسبِ ترتیب یاد آتے رہیں گے۔ لیکن یہ بدیہی ہے کہ ہم اپنی منشار کے مطابق ارادہ کر کے خاص نقش حافظہ سے حاصل کر سکتے ہیں چاہے وہ ترتیب کے لحاظ سے پانچ برس پہلے کے ہوں یا پانچ برس بعد کے۔ پھر اُن ہزاروں نقوش میں سے مطلوبہ نقش کو ہی ڈھونڈ نکالنا؛

کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ انسانی وجود کے اندر ایک ایسا عنصر روحانی یقیناً وجود رکھتا ہے ۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے ۔ میں نے زید کو پندرہ برس کی عمر میں پہچان لیا تھا ۔ اور بکر کو بیس برس کی عمر میں ۔ اب اگر زید کی صورت میرے حافظہ میں اُبھر آئے تو لازم ہے کہ بکر کی صورت اس وقت تک نہ اُبھرنے پائے جب تک وہ تمام نقوش باری باری سے اُبھر کر ختم نہ ہوں جو زید اور بکر سے ملاقات کے درمیانی عرصہ یا پانچ سال میں حافظہ پر ثبت ہو چکے تھے ۔ یا اگر انسان صرف ایک مادی اضطراری وجود ہوتا اور مادہ بھی ہر لحظہ متغیر اور ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہوتا، جیسا کہ یقیناً ہو رہا ہے ۔ تو ہم زید کو پہچاننے کے لئے دوسری بار ملاقات کرتے کیونکہ اس کا پہلا نقش مادہ کے مسلسل تغیر اور تبدیلی کی وجہ سے بہ کلی محو ہوا ہوگا ۔ ایسی حالت میں انسان یقیناً کوئی علم و فن حاصل نہ کر سکتا اور ہم انسان اور اس کی آزادانہ فعالیت کا انکار کرنے میں حق بجانب ہوتے ۔ چونکہ یہ مضمون بڑا شرح و بسط کا محتاج ہے اس لئے اسی پر اکتفا کی جاتی ہے ۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ انسانی وجود سے جوہرِ روحانی کا تعلق حقیقت میں موجود ہے، تو وہ آزاد اور خود ارادیت کا حامل کیوں نہیں؟ جواب یہ ہے کہ روح کی مادہ سے متعلق ہو جانے کے بعد وہ حالت باقی نہیں رہتی جو عالمِ تجرد میں ہوتی ہے، ایسی حالت میں اسے نفس کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے ۔ اور اب وجودِ انسانی کی تین حالتیں سامنے آتی ہیں، ملکیت، انسانیت، اور حیوانیت ۔ اور جب تک اُسکے ان تینوں عناصر میں ہم آہنگی اور اعتدال نہیں رہتا ۔ وہ نہ تو اپنے لئے زندگی کا کوئی ٹھوس مقصد ہی متعین کر سکتا ہے اور نہ ہی انسانی یا مادی فطرت کے مطابق کامل زندگی بسر کر سکتا ہے، چونکہ وہ عالم مادیت میں موجود ہوتا ہے، اس لئے طبعاً اسے مادی ضروریات کا سامنا ہوتا ہے ۔ اور وہ اُن میں کھو جاتا ہے ۔ ایسی حالت میں وہ زندگی کا مقصد ہی صرف وہی سمجھتا ہے، وہی ضروریات اس کا مقصدِ حیات بن جاتی ہیں ۔ وہ بقائے حیات کے لئے دوسروں کی زندگی کو ختم کر دینا ضروری خیال کرتا ہے جیسے کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں ـــــ یہی تنازعۃ البقاء ہے جس کا تعلق مکمل طور پر حیوانیت سے ہے ۔ یہی داروِن کی تھیوری سے حاصل ہوتا ہے ۔ اگر نوع انسان اس نظریہ کو اصول کے طور پر قبول کرے تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہوگا ۔

اور اگر عنصرِ ملکیت کا غلبہ ہو جائے ۔ تو انسان وارداتِ عشق کی شدت سے مجذوب ہو کر تارک الدنیا بن جائے ۔ ایسی حالت میں وہ مادیت سے کچھ استفادہ کر ہی نہیں سکتا ۔ اس لئے وہ مقصدِ حیات کے صحیح تعین سے بھٹک جاتا ہے ۔ اور اگر عنصر انسانیت کا غلبہ ہو جائے اور آدمی انسان بن جائے تو کچھ شک نہیں کہ وہ اپنے لئے زندگی کا ایک واضح مقصد متعین کر سکتا ہے ۔ اس لئے کہ اس کی صحیح حیثیت انسانیت ہی کی ہے اور جب تک اس کی انسانیت عنصر ملکیت و حیوانیت ہر دو پر غالب نہ ہو ۔ وہ کسی طور بھی صحیح مقصدیت کی طرف گامزن نہیں ہو سکتا ۔ اسلامی تصوف نے انسان کی ان تینوں حالتوں کو "فرق" "جمع" اور "جمع الجمع" سے موسوم کیا ہے ۔ ان میں سے انسان کی صحیح حالت جمع الجمع کی ہے، فرق اور جمع مطلوب انسانیت ہے، فرق کا تعلق حیوانیت یا بہیمیت سے ہو ۔ جس کے زیرِ اثر انسان کا مقصدِ حیات کمزوروں کو ان کی جگہ سے ہٹانا اور ان کی جگہ خود بیٹھ جانا ہوتا ہے ۔ اور "جمع" کا تعلق عشق یا ملکیت سے ہے، جس کے تحت انسان مجذوب اور دیوانہ سا ہو جاتا ہے ۔ اس حالت میں بھی انسان صحیح مقصدیت سے بھٹک جاتا ہے ۔ صرف "جمع الجمع" کا تعلق انسانیت کاملہ سے ہے ۔ "فرق" کی حالت میں انسان صرف مادیت ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے ۔ خالق سے اسکا کوئی تعلق نہیں رہتا ۔ اور "جمع" میں وہ صرف خالق ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے ۔ اور مادیت سے منقطع ہو جاتا ہے ۔ مگر "جمع الجمع" میں مادی اشتغال اُسے خالق کے تصور سے بیگانہ نہیں کر سکتے ۔ اور خالق کا تصور اسے مادیت سے کنارہ کش نہیں کرتا ۔ رومی اور اقبال کا مردِ مومن اور نطشے کا فوق البشر یہی تو ہے، گو نطشے کا فوق البشر ہمارے جیسے معمولی عقل و فکر رکھنے والوں کی دسترس سے بلند ہی ہے، نہ جانے اس کی تخلیق نطشے کے ذہن میں کس طرح ہوئی تھی جو عالم انسانیت میں کچھ محال سی نظر آتی ہے ۔

لیکن "جمع الجمع" کی یہ حالت مکمل تربیت حاصل کئے بغیر

حاصل نہیں ہو سکتی۔ افلاطون کے نزدیک انسانی تربیت کی منشأ انسان کو اس کے فطری جمال و کمال تک پہنچانا ہے۔ اور اسی طرح دانشورانِ عالم نے انسانی تربیت کے مختلف طریقے بیان کئے ہیں۔ لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی تربیت کی غایت کیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ کامیاب زندگی کے لئے اگرچہ چند دانشوران کے نزدیک انسان کو اپنی فطرت پر آزاد چھوڑ دینا چاہیئے۔ تاکہ وہ خود فطری طور پر اپنی جبلت کے تحت ترقی کرے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ بھی تربیت ہی کا ایک طریقہ ہے۔ اچھا تو۔ کامیاب زندگی سے کیا مراد ہے۔؟ — یعنی مقصدِ حیات کیا ہے؟۔ یہ سوال اتنا مشکل ہے کہ اس کا جواب ایک مکمل انسان ہی دے سکتا ہے۔ مکمل انسان بن جانے کے بعد ہی اس کا صحیح جواب سوچا اور دیا جا سکتا ہے۔ ہم صرف اس قدر عرض کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اگر ہم مکمل طور پر مادیت کے زیر اثر ہونگے تو اس سوال کا جواب یوں دیا جائے گا۔ کہ انسان کا مقصدِ حیات اصولی اور دائمی طور پر تو کچھ نہیں، اور اگر فی الحال کچھ ہے بھی تو یہ کہ اپنی زندگی کے دن عیش و راحت سے گذار دیئے جائیں۔ اور اسکے لئے کسی خاص ضابطۂ اخلاق کو بھی ضروری نہ سمجھا جائے۔ اور اگر ہم روحانیت سے زیادہ متاثر ہوں گے تو مقصدِ حیات صرف خدا کی ذات سے لَو لگانا اور تارک الدنیا ہو کر بیٹھ جانا ہوگا۔ اور اگر ہم کامل انسان ہوں گے۔ تو ہمارا مقصدِ حیات تخلقوا باخلاق اللہ ہوگا اس لئے کہ انسان خلیفۃ اللہ اور دنیا کا منتظم ہے۔ اور اگر وہ اپنے منیب کی صفات کا حامل نہ ہوگا، تو نیابت کی ذمہ داریوں سے کیونکر عہدہ برآ کیسے ہو سکے گا۔ قرآن حکیم کے مطالعہ سے بھی اسی حقیقت کی تائید ہوتی ہے۔ خدا نے اپنی ہستی کو انسان سے مشابہ فرمایا ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں اور نفس کا ذکر کیا ہے۔ انسان کو بھی سمیع اور بصیر اور رؤف و رحیم کے خطاب سے نوازا ہے۔ اور رسول اللہ کا ارشاد بھی تخلقوا باخلاق اللہ، اور خلق آدم علیٰ صورتہٖ اس کا مؤید ہے۔ یہ اس لئے کہ انسان ہی تو ہے جو مظاہر فطرت کی غایات کو مدِنظر رکھتے ہوئے۔ مظاہر و اشیاء کے لئے مقاصد کا تعین کرتا ہے۔ چنانچہ اب تک انسان نے حقیقت الاشیاء کے سلسلہ میں چند معلومات

کو فراہم کیا ہے۔ وہ ظاہر ہی ہے، لیکن یہ کیا ہے کہ وہ آج تک زندگی کا ایک ایسا مقصد متعین نہ کر سکا جس پر نوعِ بشر کے تمام افراد متفق ہو سکیں۔ ہاں۔ انسان البتہ ایک بات میں متفق ہے۔ اور وہ یہ کہ زندگی کا مقصد حصول لذت و مسرت ہے اور بس۔ لیکن ہر ایک کے نزدیک لذت و مسرت کے حصول کا طریقہ کار جدا اور ذرائع مختلف ہیں، اور یہ اختلاف آج تک چلا آرہا ہے۔ لیکن ذرا سوچیئے تو کیا انسان بذاتِ خود زندگی نہیں ہے؟ یقیناً ہے، پھر زندگی خود اپنے لئے ایک متفقہ مقصد کا تعین کیوں نہیں کر سکتی؟ کیا زندگی چند اجزاء سے مرکب ہے؟ اور وہ اجزاء باہمی تصادم کا شکار ہیں؟ ہرگز نہیں۔ زندگی ایک منفرد شئے ہے، وہ تعدد قبول نہیں کرتی۔ اسی طرح انسانیت بھی انسانوں کے مابین قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور جب زندگی بھی منفرد اور انسانیت بھی ایک ہی شئے کا نام ہے تو اس اختلاف اور تصادمِ باہمی کا کیا مطلب؟ صاف ظاہر ہے کہ حیاتِ انسانیہ ایک جزو ہے حقیقت انسانیہ، نفسِ کلیہ کا۔ اس لئے اس کا ادراک بھی جزوی ہے۔ وہ اپنی حقیقتِ کلیہ کا ایک قطرہ ہے، لیکن مزاج سمندر کا رکھتا ہے۔ وہ عالمِ مادیت سے متاثر ہے۔ وہ نہ تو اس سے اپنا دامن چھڑا سکتا ہے اور نہ ہی اس کے اندر حقیقی لذت و مسرت سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ اس کی پیاس بجھتی ہی نہیں، اس لئے کہ اس کی پیاس تو صرف اُس سمندر ہی سے بجھ سکتی ہے جس کا یہ ایک قطرہ ہے۔ وہ اپنے لئے مقصد حیات کا تعین کر بھی کیسے سکتا ہے۔ جبکہ وہ خود بحرانی حالت کا شکار اور وجودی حیثیت سے تکمیل طلب ہے، صحیح مقصدیت کا تصور تو تب ہی ہو سکتا ہے۔ جب وہ اپنے حقیقی وجود کا راز پا جائے۔ پہلے اپنے آپ کو پہچان لے اور بعد میں اپنے لئے زندگی کا مقصد متعین کرے۔ اور وہ راز یہ ہے کہ وہ اپنی حقیقت کلیہ سے متحد ہونے کی کوشش کرے۔ جب وہ مادیت کے غلبہ سے آزاد ہوگا تو اس قابل ہوگا کہ اپنی حیثیت یا نفسِ کلیہ کی طرف کلی طور پر متوجہ ہو سکے۔ اب اسکا آئینۂ ادراک اس قابل ہوگا کہ حقیقتِ انسانیہ سے وہ اکتسابِ علوم

(باقی ص۲۳ پر)

الوالجوہر۔

اقبال اور نوبل پرائز

برصغیر پاک و ہند نے اس صدی میں تین عظیم شاعر پیدا کیئے۔ اقبال۔ تامل شاعر سوم سندر بھارتی جن کا وطن تامل نار تھا (برصغیر میں انگریزوں کی آمد سے قبل یہ علاقہ مدراس کا نام تھا)

رابندر ناتھ ٹیگور میری نظر میں بلحاظ عظمت کمتر تھے لیکن نوبل کا شہرۂ آفاق ادبی انعام انہیں ہی ملا۔ کہا جاتا تھا کہ اقبال کا نام بھی ان کے آخری ایام میں نوبل پرائز کے لیئے تجویز کیا گیا تھا نوبل اکیڈمی بھارتی سے یکسر ناواقف تھی۔ کسی فرد یا ادارہ نے اس تامل شاعر کو مغرب میں متعارف کرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

میں نے اکثر ادیبوں سے دریافت کیا کہ ٹیگور کو نوبل پرائز ان کی کس تصنیف پر ملا۔ سب نے ٹیگور کی منظوم تصنیف "گیتانجلی" کا نام لیا۔ حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے۔ اس بات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اکثر اہل قلم کی معلومات معاصرین کے متعلق کس قدر ناقص ہیں۔

اقبال نے اپنی فطری شاعرانہ صلاحیت کو محسوس کیا اور اپنے احساسات و جذبات کا اظہار اردو شاعری میں کیا۔ یہ کلام رسالوں میں شائع ہوا۔ ان کی نظمیں مشاعروں میں پڑھی گئیں۔ اقبال نے انگریزی نظموں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا۔ حُبِ وطن کے ترانے بھی کہے اور اسلامی افکار کو بھی شاعری کے دامن میں سمیٹا۔

اردو کے ادبی حلقوں میں اقبال کی حیثیت ایک جدید تخلیقی شاعر کی تھی۔ انہوں نے اپنی نظم انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں پڑھی۔ یہ لاہور کا قدیم اسلامی تعلیمی اور رفاہی ادارہ ہے۔

مسلمانوں میں قبول عام کا خاص باعث ان کی نظم "شکوہ" ہوئی۔ جس میں اقبال نے بڑی جرأت سے خدا کے خلاف گلہ و شکایت کا ایک کیس بنایا ہے کہ خدا مسلم ملت کی سرپرستی سے دست بردار ہو گیا ہے۔

امتیں اور بھی ہیں ان میں گنہگار بھی ہیں
عجز والے بھی ہیں مست مئے پندار بھی ہیں
ان میں کاہل بھی ہیں غافل بھی ہیں، ہشیار بھی ہیں
سینکڑوں ہیں کہ تیرے نام سے بیزار بھی ہیں
رحمتیں تیری ہیں اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر

شکوہ کا آسمانی جواب بھی اقبال کی زمزمہ سنجی کا نتیجہ ہے۔

اس دور میں اقبال کی فکر قدرتی طور پر برصغیر کے مسلم سیاسی افکار سے ہم آہنگ تھی۔ جس کے متعلق مولانا محمد علی نے کہا تھا کہ بیک وقت میرا تعلق دو حلقوں سے ہے۔ ایک دائرۂ اسلام ہے۔ دوسرا حلقہ ہندوستان کا ہے۔ حلقہ ہندوستان کے رکن کی حیثیت سے اقبال نے ترانۂ وطن لکھا۔ "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" حُبِ وطن کے ترانوں میں ترانۂ اقبال کی شیرینی سب سے بڑھی ہوئی ہے۔ دائرۂ اسلام کے رکن کے طور پر اقبال نے ترانۂ ملی لکھا۔ "چین و عرب ہمارا، ہندوستان ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا" بین الاسلامی (پین اسلامی) ترانوں میں اس کا جواب

نہیں۔ لیکن اس دور تک اقبال کو مغرب میں مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔

سفر انگلستان میں اقبال کی ملاقات پروفیسر نکلسن سے ہوئی۔ اس کے بعد اقبال نے فارسی زبان کو ذریعہ اظہار بنا لیا (میری نظر میں یہ بات شاعرانہ ارتقا کے لئے سازگار نہیں۔ پروفیسر نکلسن نے اقبال کی شاعری کو اردو سے فارسی کی طرف متوجہ کر دیا۔ اقبال نے اب اردو کی بجائے فارسی میں مثنوی "اسرار خودی" لکھی جس میں فلسفۂ رومی اور نیٹشے کی آمیزش کو منظوم کیا گیا ہے۔ نکلسن نے از راہ قدر دانی اس مثنوی اسرار خودی کا انگریزی نظم میں ترجمہ کیا۔ اور اس پر مقدمہ لکھا۔ یہی کتاب مغرب میں اقبال کے اولیں تعارف کا سبب ہوئی۔ لیکن مغرب کو زیادہ متاثر کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کے بعد اقبال نے فارسی نظم میں کئی کتابیں لکھیں "رموز بیخودی" وغیرہ۔ ان کے اردو نظموں کے مجموعے بانگ درا، ضرب کلیم اور بال جبریل ہیں، ان کے آخری ایام کا کلام ارمغان حجاز ہے۔ جس میں بیشتر فارسی کلام ہے۔ اقبال ہی پہلے ممتاز قائد تھے جنہوں نے نظریۂ پاکستان کی حمایت و تائید کی اس تصور کے پہلے محرک نوجوان رحمت علی تھے جنہیں بھلا دیا گیا ہے۔

حکومت پاکستان نے صرفِ کثیر سے اقبال اکیڈمی قائم کی ہے جو پاکستان اور خارجی دنیا میں پیام اقبال کو متعارف کرانے میں کوشاں ہے۔

رابندر ناتھ ٹیگور ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ انہیں بنگلہ سنسکرت اور انگریزی میں مہارت حاصل تھی جس طرح ابوالکلام آزاد نے سلیس اردو میں افکار ابن تیمیہؒ کی ترجمانی کی ساتھ عربی سے ابن تیمیہ کے افکار کو اردو میں منتقل کیا۔ ٹیگور نے بنگلہ اشعار میں ویدانتی شاعری کے حسین افکار کو منظوم کیا۔ تصوف کی شاعری کی طرح ہندوستان میں بھی ویدک عہد کے بعد ہندی رہبانیت اور خانقاہیت کے مفکرین نے سنسکرت شاعری میں اپنی ترجمانی کی تھی سانچے اور صوفیوں کی طرح یہ بھی آزادیٔ فکر کے حامی اور مذہبی تنگ نظری سے باغی تھے۔ اور حقیقت یا سچائی کو سمجھنے میں کوشاں تھے۔ ٹیگور کو بنگال میں بڑی مقبولیت حاصل تھی۔ سنسکرت کی حسین ترین شاعری کی ترجمانی بنگالی زبان میں گیتا نجلی ہے۔ ٹیگور کو انگریزی پر بڑا عبور حاصل تھا۔ انہوں نے خود اپنی منظومات کو انگریزی میں منتقل کیا۔ انگلستان کا سفر کیا۔ وہاں مشہور شعراء سے ملے اور گیتا نجلی کے انگریزی ترجمہ کا تعارف آئرلینڈ کے ملک الشعراء ڈبلیو بی ییٹس (W.B. YEATS) سے لکھوایا۔ یہ ٹیگور کی خوش قسمتی تھی۔ اس سے پہلے بلبلِ ہند مسز سروجنی نائیڈو نے اپنی نظموں کا تعارف اسکاٹ لینڈ کے ملک الشعراء ای گوس (E. GOOSE) سے حاصل کیا تھا۔ ٹیگور کو نوبل انعام گیتا نجلی کے ترجمۂ انگریزی پر نہیں ملا تھا جیسا کہ مشہور ہے۔ نوبل پرائز بنگالی نظم پر ملا تھا۔ انگریزی ترجمہ محض اس کا تعارف تھا جس طرح نکلسن کا ترجمہ اور مقدمہ اقبال کا مغرب میں تعارف تھا۔ یہ بات واضح نہیں ہے کہ نوبل اکیڈمی نے ٹیگور کو انعام دیا ٹیگور نے قدیم سنسکرت ادب کے حسین قطعے منتقل کئے تھے۔ اقبال کی ملی شاعری اور اسلامی افکار و حکمت کی ترجمانی بھی ٹیگور کے مقابل تھی۔

ٹیگور نظمیں ڈرامے، اور افسانے لکھتے رہے۔ اور بنگلہ کے علاوہ انگریزی میں بھی ترجمے کرتے رہے۔ ان کی ایک بعد کی شاعرانہ تصنیف ہلال (THE CRESCENT MOON) ہے بچہ کی معصوم مسکراہٹ میں ٹیگور کو تخلیق خداوندی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس نظم میں بچے کے تبسم میں خدا کی تخلیقی درخشانی کا اثر دکھایا گیا ہے اس تحریر کا انسانی عنصر واضح ہے۔ یہ نہ تو ہندو فلسفہ ہے نہ قومی ادب۔ بلکہ انسانی ادب ہے۔ ہر ملک و ملت کے لئے۔ ہر انسان کے لئے اسی سے نوبل اکیڈمی متاثر ہوئی اور بجا طور پر ادبی انعام دیا گیا۔ مثال کے لئے ایک مغربی کہانی "بھوک" (HUNGER) کو لیں۔ اسے بھی نوبل پرائز ملا تھا۔ اس میں نسل انسانی کے ایک عام اور مشترک مسئلہ کی حقیقت پسندانہ عکاسی ہے۔

میں نے جنوبی ہند کے تامل شاعر، غریب اور غیر معروف

انسان بھارتی کا نام بھی لیا۔ بھارتی اپنی زندگی میں اپنے وطن تامل ناو (مدراس کے تامل علاقہ) میں بھی غیر معروف تھا۔ اس کا معاملہ ان پیغمبروں کا سا تھا جن کو اپنے وطن میں احترام حاصل نہیں ہوتا یا ان اولیا کی طرح جن پر ان کی زندگی میں سنگ باری ہوتی ہے۔ اور بعد کی نسلیں ان کا انکشاف کرتی ہیں اور ان کی قبر کو اپنی پرستش کا مرکز بنا لیتی ہیں۔ جن کے مدفنوں پر خیرات کے حلوہ پر حرام خور عیاشی کرتے ہیں بھارتی نے اپنی نظموں کا ترجمہ نہیں کیا۔ نہ اس کا تعارف مغرب میں کسی نے کرایا۔ اس کا ایک شاہکار ہے جس میں اسے نہ صرف بچہ کی معصومیت میں جلوۂ خداوندی نظر آتا ہے بلکہ متعدد زاویہ ہائے نگاہ سے اس نے جلوۂ تخلیق دیکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے طائر خیال کی پرواز کس قدر بلند ہے۔

مجھے امید ہے کہ تامل ناد کے ادیب اپنے اس ادبی فریضہ کو جلد سرانجام دیں گے کہ بھارتی کی ادبی میراث کی طرف اہل مغرب کی توجہ مبذول کریں اور نوبل کے ادبی انعام کے لئے اس کا استحقاق ثابت کریں۔ شاعر کی موت کے بعد بھی اس کے لئے نوبل پرائز کی تجویز و تحریک کا کیس تیار کر کے پیش کریں۔ میں اقبال اکیڈمی کو بھی اس طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ اقبال کی نظموں کی ادبی عظمت اور انسانی عنصر کو نمایاں کریں۔ اس کا عالمگیر انسانی پیغام پیش کریں، بانگ درا، ضرب کلیم۔ بال جبریل وغیرہ کی نظموں کے انتخاب اور مجموعے مغرب میں شائع کریں اور پس مرگ نوبل پرائز کی تجویز اور تحریک کا کیس پیش کریں۔

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم
بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگِ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہرِ نوشینہ سازم

(اقبال)

نسیم نیشو فوز

آرٹ صداقت نہیں؟

(پکاسو کے فن کا اجمالی جائزہ)

کہا گیا ہے کہ مصوری انیسویں صدی میں صرف فرانس اور فرانسیسیوں نے کی ہے، بیسویں صدی میں بھی مصوری صحیح معنوں میں فرانس ہی میں ہوئی مگر اس مرتبہ پابلو پکاسو کا نام فرانسیسی مصوروں کے ساتھ لیا گیا۔ انیسویں صدی میں مصور کو اپنے سامنے ایک ماڈل بٹھانے کی ضرورت محسوس ہوا کرتی تھی مگر پوری ایک صدی گزرنے کے بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ انہیں ماڈل سامنے بٹھانے یا دیکھنے کی ضرورت نہیں۔

انیس سال کی عمر میں پکاسو بہت کچھ سیکھ کر مصوروں کی ایک نئی دنیا (پیرس) میں آیا۔ وہ اپنے اندر اسپینی مصوری کے نہ ختم ہونے والے عناصر لایا تھا، اسپینی تکونیت کے عناصر جو اسپین کی روزمرہ زندگی کا تقاضہ تھے۔

ملاگا کے اس نوآموز مصور کا باپ خود بادسی لونائی اکادمی آف فائن آرٹس میں مصوری کا پروفیسر تھا اپنے باپ کے زیر تلمذ اس نے مصوری "لکھنی" شروع کی جس طرح دوسرے بچے الف، ب، لکھتے ہیں۔ لفظ "پکاسو" اطالوی زبان سے مشتق ہے۔ پکاسو کے اسلاف غالباً جینوا سے پالما ڈی مالورکا کے راستے ہجرت کرکے اسپین میں ہمیشہ کے لئے مقیم ہوگئے تھے وہ بلوغت کے ابتدائی سالوں ہی سے اپنی چھوٹی بہن کے آئیل پورٹریٹ بنایا کرتا تھا جس سے اس کی فنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ پیرس میں اس کے بیشتر دوست ادیب تھے، اسے تصورات کی ضرورت تھی، مصور دوستوں کی نہیں، اور اسی لئے وہ شروع ہی سے جرترود استائین، میکس جیکب، آندرے سالمن اور ژاں کاکتو کا دوست بن چکا تھا۔ ویسے یہ ضروری نہیں کہ ایک مصور کے ادبی تصورات ایک ادیب کے ادبی تصورات سے مطابقت رکھتے ہوں، کیونکہ ایک مصور کی "انائیت" ادیب کی انائیت سے مختلف ہوتی ہے۔ مصور اپنی ذات کو اپنا ئیت سے علیحدہ کرتے ہوئے خارجی اشکال میں ڈھالتا ہے؛ اس طرح وہ اپنی تصاویر کے عکس کے روبرو رہتا ہے۔ لیکن ایک سلجھے ہوئے ادیب کو لکھنے کے لئے "انائیت" سے محبت کرنا پڑتی ہے۔ لکھنے کے بعد وہ انائیت ادب کا حصہ بن جاتی ہے۔ فرانسیسی اور اسپینی فضاؤں کے درمیان ایک بار پھر پکاسو پر اسپینی مزاج حاوی ہوا اور جب وہ ۱۹۵۲ء میں اسپین سے لوٹا تو اپنے ساتھ بہت سی تصویریں بنا کر لایا۔ جو اس کے "نیلے دور" سے تعلق رکھتی ہیں نوجوان بوہیمین فنکاروں کے گروپ میں شامل ہونے کے بعد اس نے لاتریک، گاگوین، وان، گویا اور سیزان کے سارے اثرات اپنے کینوس میں سمولئے، نیلا رنگ اس کا محبوب رنگ بن گیا پھر یہی رنگ پیرس کی عظیم گلیوں کی ٹریجڈی دکھانے میں بڑا موثر ثابت ہوا اور اس طرح سمندر کا یہ آوارہ رنگ زندگی کی تلخ حقیقتوں کا کامیاب اظہار بن گیا۔

اسپین دوسرے شمالی ممالک کی طرح تمام تر رنگوں پر مشتمل نہیں اسکی خانہ بدوش فضاؤں کے رنگ عموماً سفید، سیاہ یا سنہرے رہے ہیں لیکن ان میں سرخی یا ہریالی کبھی نہیں پائی گئی، اسپین شمالی نہیں مشرقی ہے جہاں عورتیں شوخ رنگ کے بجائے سیاہ لباس پہنتی ہیں — وہاں کی زمین خشک مگر رنگ میں سنہری ہے، آسمان نیلا سیاہ ہے، تاروں بھری راتیں بھی سیاہ یا گہری نیلی ہیں دہرکی علامت دیکھنے میں ایک تکون ہے۔

وہ پیرس میں مونت مارتے کی پرانی عمارت دی آرگناں میں مقیم ہوگیا۔ اس زمانے کے بعض مصور سرکس دیکھنا پسند کیا کرتے تھے جبکہ موجودہ زمانے میں اس کی جگہ نائٹ کلب، تھیٹر، کیبرے اور سینما نے لی ہے وہ مصور سرکس مدرانو ضرور جایا کرتے تھے جہاں انہیں مسخروں، تماشہ گروں اور گھوڑ سواروں سے ملنے کا موقعہ بھی ملتا رہتا تھا۔۔۔۔۔ اس طرح آہستہ آہستہ پکاسو پر فرانسیسی مزاج غالب آگیا۔ اس کا یہ دور "گلاب کا دور" یا "ڈھالی کون" دور شروع ہوا۔ اس دور کی پہلی تصویر "نوجوان لڑکی پھول کی ٹوکری کے ساتھ" بنائی گئی۔ اس دفعہ اسپین سے واپسی کے بعد وہ چند لینڈ اسکیپ لے کر آیا جن میں کیوب ازم کے ابتدائی آثار تھے چند اسپینی گاؤں تکونی ٹکڑوں میں ایک خاص ترتیب سے پیش کئے گئے۔ شاید اس موقع پر پکاسو نے کہا تھا کہ جو کوئی بھی تخلیق کرتا ہے وہ اپنی تخلیق کو "جبراً" بدصورت بنا دیتا ہے تخلیق کرنے کی کوشش اور شدت میں ہمیشہ ایک مخصوص بدصورتی جنم لیتی ہے لوگ ایک نسل سے دوسری نسل میں نہیں بدلتے۔ فقط وہ کمپوزیشن بدل جاتی ہے۔ جس میں لوگ ازل سے گھرے ہوئے ہیں۔

۱۸ ــ ۱۹۱۴ء کی پہلی جنگ عظیم کی کمپوزیشن گذشتہ تمام جنگوں کی کمپوزیشن سے مختلف اور کیوب ازم کی کمپوزیشن میں ایک کنارۂ تصویر دوسرے کنارے کی طرح اہم اور مضبوط تصور کیا جانے لگا۔ انسانی آنکھ کا سائنس کی نو بنو ایجادات میں یقین و اعتقاد، فرائڈ کے خوابی مثلث میں جبراً دھنسے ہوئے "جنسی زاویے" زندگی کی تیز رفتاری ایسی وجوہ تھیں جن کی بنا پر تکونیت کا وجود عمل میں آیا زندگی کا نظام ـــــ Framing تصویر کو یہ سمجھانے لگا کہ اب تصویر کو فریم میں رہنے کی ضرورت نہیں ادھر تصویروں نے بھی یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ اب زیادہ دیر فریم کے چوکور میں قید نہ رہ سکیں گی۔ اب کیوبسٹ تصویروں میں آسمانی مناظر اور ساکت زندگی کے بعد انسانی جسم اور چہرے بھی مکعبی صورتوں میں پرکشش کئے گئے۔

جنگ سے پہلے ایک دن ــــ چہل قدمی کرتے وقت پکاسو نے ایک پڑھے لکھے آدمی کو بنچ پر بیٹھتے دیکھ کر یک لخت کہا تھا: "اس چہرے کو دیکھو جو دنیا کی طرح پرانا ہے"۔ سارے چہرے دنیا کی طرح بوڑھے اور پرانے ہیں۔ لوگوں کی "روحیں" اس کی توجہ کا مرکز نہیں تھیں۔ اس کے نزدیک زندگی کی ساری حقیقت سر، چہرے اور جسم میں پائی جاتی تھی جو اس قدر اہم، مکمل اور تسلیم شدہ تھی کہ کسی دوسری چیز کے متعلق سوچنا فضول تھا ـــــ روح ـــــ ایک ـــــ دوسری چیز تھی ـــــ گوسول میں موسم سرما گزارنے کے بعد پکاسو واپسی پر ہنری ماتیس سے ملا جس نے اسے افریقن سنگ تراشی پر تحقیق و تجربہ کرنے کی دعوت دی۔ یہاں یہ جاننا ضروری ہے کہ افریقی سنگ تراشی ایک ایسی قوم کا بسیط فن ہے جسے جدید تہذیب و ثقافت کی اعلیٰ اقدار سے کوئی عمرانی رابطہ نہیں اسی لئے اس کا فن بے حد قدیم اور روایتی ہے جو مغربی، سوڈان، نائیجریا اور کانگو کے دریاؤں کی وادیوں سے آیا ہے وہاں کے باشندے ہاتھوں میں ایک خاص طرح کا موقلم لیکر آبنوس، عاج، پتھر اور اریکو کی لکڑی سے اپنی اپنی مذہبی رسومات کے مطابق قبائلی رقص کے لئے خول بناتے ہیں۔ اسلاف کی پوجا کرتے ہیں اور موسمی دیوتاؤں سے دعائیں مانگتے ہوتے بڑے بڑے پکھاوج بجاتے ہیں ـــــ

جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی اور اس کے سارے دوست بھی جنگ کے لئے روانہ ہوگئے تھے۔ پکاسو اکیلا رہ گیا۔ وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ اس کے بعد وہ ایرک ساتی اور ژان کاکتو سے ملا یہ اس کی تکونیت کا صحیح دور تھا۔ ژان کاکتو اور پکاسو "پریڈ" تیار کرنے کے لئے روم جا رہے تھے، پکاسو بے حد مسرور تھا کیونکہ وہ پہلی بار اٹلی جا رہا تھا۔ تکونیت کو اب تھیٹر کے اسٹیج پر پیش کیا گیا۔ ۱۹۱۷ء کی بہار میں پکاسو نے دیاگلیف کے لئے کاکتو کے ساتھ ملکر اسٹیج کے سیٹ اور ملبوسات تیار کئے۔ دیاگلیف۔ جس نے روسی بیلے کے آرٹ میں نئی زندگی سموئی۔ دیاگلیف ان فنکاروں کی ٹیم کا لیڈر تھا جس میں مشہور ترین رقاص نامنسکی، لیون باکس، کرساوینا اور میری ریمبرٹ جیسے لوگ شامل تھے۔

"پریڈ" کو بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔

اٹلی اور پریڈ کے بعد پکاسو کے علم خطی اور ساکت زندگی کا دور تھا، تکونی یا مکعبی صورتیں دھیرے دھیرے اپنا مفہوم کھو رہی تھیں، اب تکونی تصویروں کو روغن رنگ سے نامایا گیا تھا۔ روغن

پینٹ کو پکاسو نے "رنگ کی صحت" قرار دیا، اس کے چند سالوں بعد اس نے مجسمہ سازی شروع کی، اطالوی اثر اس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ مگر روسی اثر بہت کچھ باقی تھا۔ روسی آرٹ عام طور پر دہقانی آرٹ کہلاتا ہے پکاسو اب سوریئلزم پر تجربے کرنے لگا۔ ہر تصویر ایک حقیقت سے دوسری نئی حقیقت تک پہنچنے کے لئے ایک فرار تھی فریم ٹوٹ چکی تھی اور تصویر کے حصے شکستہ ہو کر ڈرائنگ روم کے فرنیچر کے آس پاس تکونی پژمردگی کے ساتھ بکھرے پڑے تھے۔ اگلے ۱۰ سالوں میں پکاسو نے ایک بھی تصویر نہ بنائی۔ اس نے شاعری کرنے کا فیصلہ کیا لیکن جن رنگوں، چہروں اور سوریئلی جراحت کردہ اعضا سے وہ کھیل چکا تھا۔ وہ اسے شاعری کا مخصوص ترنم اور آہنگ نہ دیتے ہوئے اس کی راہ میں حائل ہو گئے، الفاظ اور رنگ کے درمیانی راستے میں ایک بڑا خلاء تھا اور اس خلاء کے آگے جنگ عظیم کی آواز تھی جہاں زندگی یا موت کی جانب اخلاقی یا آفاقی ذمہ داریوں کا قابل تعظیم احساس نہ تھا اور اس مقام پر چند ایسے کربناک لمحات بھی آتے ہیں جہاں زندگی اور موت آپس میں سمجھوتہ کئے بغیر کہیں جامد ہو جاتے ہیں جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ پکاسو چہروں اور انسانی جسم کو اچھی طرح پہچانتا تھا اور لوگوں کی روحوں میں گہری دلچسپی لینا اس کے نزدیک بے معنی تھا۔ جبکہ چہرے، سر اور انسانی جسم نہایت واضح طور پر اپنے متعلق سب کچھ کہہ سکتے ہیں۔ الفاظ کیوں استعمال کئے جائیں۔ جبکہ رنگ اور خطوط زندگی کے وژن کے اظہار کا صحیح ذریعہ ہیں۔ اسپین کے وجود نے پکاسو کے وژن کو ہمیشہ زندہ اور سلامت رکھا۔

اسپین کے پلازا میں بیٹھنے والے ناظرین جب آرٹ گیلری کی طرف گئے تو انہوں نے اس نئے انداز کی بل فائٹنگ کینوس کی اضطراب انگیز سطح پر دیکھی جو آخر میں "جرنیکا" کے نام سے دنیا بھر میں مشہور ہوئی۔ یہ عظیم کمپوزیشن اسپین کی خانہ جنگی کی علامتی زبان بنگئی ۱۹۳۷ء میں جرمن بمباروں سے جرنیکا کے شہر باسک کے تباہ ہونے کی خبر سنی تو فنکاروں نے بل فائٹنگ میں ایک بہت بڑا علامتی موضوع پایا ــــ چھ فٹ سوا انچ لمبے کینوس پر تین رنگ بنے ہوئے تھے۔ جنہیں پکاسو نے جنگ کے شیطانی رنگ قرار دیا۔

بھورا ــــ سفید اور سیاہ ــــ

یہ دوسری جنگ عظیم کی ایک بھیانک امیجری ثابت ہوئی۔ جس میں وحشی سانڈ درندگی اور بربریت کی علامت ہے اور بل فائیٹر آزادی کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔ اور تماشائی محض دیکھنے والے ہیں۔ جنکی مداخلت بے معنی سمجھی جاتی ہے۔

پکاسو ان لوگوں کو طنز بھری نگاہوں سے دیکھتا ہے جو فن کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ ہر ایک فن کو سمجھنا چاہتا ہے۔ کیوں نہ ایک پرندے کے گیت کو سمجھا جائے۔ مصوری کا کوئی بھی فن پارہ الفاظ کے احاطے میں نہیں سما سکتا۔ رنگ اور الفاظ میں ہمیشہ ایک فاصلہ ایک دیوار ہے البتہ الفاظ ایسے مفید اشارے ہیں جو فن سے متعلق اغلاط کی تصحیح کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ نیچر ہمیشہ اپنی وحشی آوازوں اور غزالی گیتوں میں سرمست ہے۔ لیکن جب فنکار آتا ہے تو وہ اپنی ساری آزادی اس کے ہاتھوں میں سونپ کر مکمل سپردگی بن جاتی ہے اور فن کی تخلیق انسان کی بہت ہی قدیم جبلت ہے اسی لئے پکاسو بذات خود یہ کہتا ہے۔

"ہم سب جانتے ہیں کہ آرٹ صداقت نہیں تاہم وہ ایک ایسا افسانہ ہے جو صداقت کے سمجھنے کی بشارت دیتا ہے"۔

"ہم میں سے ہر شخص اپنی جگہ تھوڑا ما شاعر، سنگ تراش، مغنی، مصور اور نثر نگار ہوتا ہے لیکن فنکاروں کے مقابلے میں یقیناً بہت کم ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ تو فطرت انسانی کی سب سے زیادہ آفاقی طبیعتیں اور قوتیں بلند ترین درجہ میں رکھتے ہیں جب میں کسی تصویر کو خوبصورت خیال نہیں کرتا، تو بات یہ ہوتی ہے کہ خود فنکار یا تو اظہار ذات میں ناکام رہ گیا ہوتا ہے یا خود میں عجلت و نخوت، قلت تدبر، تعصب یا فطرت کی مماثلت کی کمی کے سبب اپنا اظہار کرنے میں ناکام رہ گیا ہوتا ہوں"۔

(دکروچے)

ایم طفیل ایم۔ اے۔

مغربی پاکستان میں بنگلہ کی مقبولیت

قومی اور ملی وحدت و یگانگت کے لئے مذہب کے بعد زبان کا درجہ آتا ہے یہ حقیقت ثابت اور امر مسلمہ ہے کہ زبان کے معاملے میں اجنبیت اور غیریت کی فضا جو خلا پیدا کرتی ہے وہ کسی دوسرے طریقے سے پر نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ آج کی دنیا میں تو مذہبی اور قومی وحدت کے باوجود لسانی وحدت کے بغیر کسی ملک و قوم کے استحکام کے معاملے میں کوئی قطعی رائے قائم ہی نہیں کی جا سکتی۔ ایک ہی ملک میں رہنے والوں کے لئے ایک دوسرے کی زبان سے ناواقفیت کسی بھی ملک و قوم کی تعمیر و ترقی کی راہ میں نہ صرف یہ کہ رکاوٹ بن سکتی ہے بلکہ اس کی سیاسی اور معاشرتی زندگی میں بے شمار ایسے مسائل جنم لے سکتے ہیں۔ جن کا حل صرف اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ ملک کے تمام باشندے ایک دوسرے کی زبان سے پوری طرح واقف ہوں۔ وہ ملک جہاں ایک زبان قومی اور ملکی زبان کا درجہ رکھتی ہو وہاں تو یہ صورت پیدا نہیں ہوتی البتہ وہ ملک جہاں مختلف علاقائی زبانیں بولی جاتی ہوں وہاں خاصی دشواری پیش آتی ہے۔

پاکستان میں بھی یہی صورت حال ہے۔ صرف مغربی پاکستان میں پنجابی، اردو، سندھی، بلوچی، ملتانی اور پشتو کے علاوہ دیگر کئی مقامی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ وحدت مغربی پاکستان سے قبل جو صوبائی تعصب ملک بھر میں پایا جاتا تھا اس کی بڑی وجہ لسانی تفریق تھی گو اس کے علاوہ کئی دوسرے عناصر بھی اپنا کام کر رہے تھے لیکن لسانی تفریق کا عنصر سب سے نمایاں تھا۔

مغربی پاکستان کی نسبت مشرقی پاکستان میں لسانی تفریق کا عنصر بڑی حد تک کم ہے۔ اگرچہ بنگلہ زبان میں بھی مقامی طور پر کہیں کہیں فرق اور تبدیلی کا عنصر نظر آتا ہے لیکن یہ تفریق اس حد تک نہیں کہ وہاں کوئی لسانی مسئلہ پیدا ہو جو قومی اور ملکی اتحاد و اشتراک کے لئے خطرہ کا باعث بن سکے۔ پاکستان کے ان دونوں حصوں میں کم و بیش ایک ہزار میل کی مسافت ہے اگرچہ جدید ذرائع آمد و رفت اور رسل و رسائل نے وقت اور مسافت کو سمیٹ دیا ہے اور آج ساری دنیا ایک کنبہ بنتی چلی جا رہی ہے تاہم یہ ذرائع کسی ملک کے لسانی بُعد کو کم نہیں کر سکتے لہٰذا یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ملک کے ان دونوں حصوں میں عوام کو ایک دوسرے کی زبان سے روشناس کرایا جائے تاکہ لسانی بُعد کے خاتمے کے ساتھ ساتھ اجنبیت اور غیریت کی وہ فضا بھی ختم ہو سکے جو زبان کی تفریق کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔

قیام پاکستان کے ابتدائی دور میں دونوں حصوں میں اتحاد و یگانگت کے نعرے تو بلند ہوئے لیکن عملی کام کچھ بھی نہ ہوا۔ اس طرح ماضی مرحوم میں سارا معاملہ صرف کھوکھلے نعروں تک محدود رہا۔ مارشل لا حکومت نے کچھ عملی کام بھی کیا۔ بین الصوبائی وظائف ثقافتی وفود کا تبادلہ اسی سلسلہ کی مختلف کڑیاں ہیں۔

لیکن بات پھر وہیں آ کر ٹھہرتی ہے کہ جب ان وفود کے ارکان ایک دوسرے کی زبان ہی نہ سمجھ پاتے ہوں تو اصل مطلب حاصل ہونے سے رہا مجھے اکثر ایسی تقاریب میں جانے کا اتفاق ہوا جن میں مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے وفد کے ارکان نے تقریر وغیرہ کے لئے انگریزی

کا سہارا لیا یہی حال مغربی پاکستان سے مشرقی پاکستان جانے والوں کا ہے۔

آج سے سترہ سال ادھر کی بات ہے کہ ایک بنگالی نوجوان مسٹر سی سی داس نے قومی اور ملکی یگانگت کے جذبے کے تحت وائی ایم سی اے میں بنگلہ زبان کی جماعت کا اجرا کیا۔ مطلب یہ تھا کہ مغربی پاکستان کے لوگوں کو بنگلہ علم و ادب سے روشناس کرایا جائے اور اسطرح قومی زندگی کا وہ خلا پر ہو سکے جو زبان کی عدم واقفیت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ یہ جماعت بالکل رضاکارانہ طور پر شروع کی گئی لیکن اخراجات کی کمی سد راہ بن گئی اور کچھ دیر بعد یہ جماعت ختم کر دی گئی۔

رائٹرز گلڈ کے قیام کے بعد ملک کے دانشوروں نے اس کمی کو کا احساس کیا۔ اور رائٹرز گلڈ کے دفتر میں مسٹر سی سی داس نے دوبارہ اپنا کام شروع کیا۔ رائٹرز گلڈ کے ارباب اختیار مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک عظیم کام کا بیڑہ اٹھایا اور اپنے محدود وسائل و ذرائع کے باوجود ایک ایسا کام شروع کیا۔ جس کے لئے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی۔

مسٹر سی سی داس نے مجھے ایک ملاقات میں بتایا کہ گلڈ کے سکریٹری مسٹر قتیل شفائی نے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کمر ہمت باندھی اور بنگلہ جماعت کے اجرا کے لئے ہر وہ سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی جو گلڈ کے اختیار میں تھی۔ اس وقت بنگلہ کلاس کا اجرا ہوئے اٹھارہ ماہ گذر چکے ہیں اور مسٹر داس اپنی شبانہ روز کوششوں اور گلڈ کے اشتراک و تعاون کی بدولت تقریباً چار سو طلبا اور طالبات کو بنگلہ زبان سکھا چکے ہیں۔ اس وقت بھی تقریباً ۴۰ طالبات جن میں مختلف کالجوں کی لیڈی لیکچرار اور گھریلو خواتین شامل ہیں۔ بنگلہ زبان سیکھ رہی ہیں اسکے علاوہ ۵۰ کے لگ بھگ طلبا زیر تعلیم ہیں، جن میں اسکولوں کالجوں کے طلبا کے علاوہ سرکاری دفتروں کے ملازمین بھی شامل ہیں۔

لیکن ظاہر ہے کہ یہ کام صرف عوامی سطح پہ پورا نہیں ہو سکتا یہ ایک عظیم کام ہے جس کے لئے سرکاری امداد کی پوری پوری ضرورت ہے۔

مسٹر سی سی داس نے بتایا کہ بنگلہ زبان سیکھنے والوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی ہے کہ گلڈ کا دیا ہوا ایک کمرہ اب تنگ دامانی کا شکوہ کر رہا ہے۔ مجھے خود اس چھوٹے سے کمرہ میں بیٹھ کر یہ احساس ہوا کہ ہمارے ملک میں حکومت اور دولت مندوں نے بڑی بڑی کوٹھیاں اور عالیشان دفاتر کی عمارتیں کروڑوں روپوں کی لاگت سے تعمیر کرائی ہیں۔ لیکن یہ کسقدر افسوس کا مقام ہے کہ قومی یک جہتی اور اتحاد و اشتراک کے لئے جو کام شروع کیا گیا ہے اسکے لئے صرف ایک شکستہ کمرہ ہی میسر آسکا ہے۔ جہاں طالبات اور طلبا گرمی کی شدت میں بیٹھ کر زبان سیکھنے میں مصروف نظر آتے ہیں اگر حکومت اس کام کو مفید سمجھتی ہے تو لازمی ہے کہ ان لوگوں کو کچھ سہولتیں فراہم کی جائیں اور کم از کم ایک ایسی عمارت میں اس کلاس کو منتقل کیا جائے جہاں اطمینان و سکون کے ساتھ لسانیات کی تعلیم کا کام جاری رہ سکے۔ یہ معاملہ حکومت کی خاص توجہ کا مستحق ہے اور اس وقت سب سے اہم ضرورت عمارت کی فراہمی ہے زبان سیکھنے والوں کے ذوق و شوق کا یہ عالم ہے کہ وہ شہر کے دور افتادہ حصوں سے گرمی کی شدت میں چل کر وقت مقررہ پر اس درسگاہ میں پہنچتے ہیں۔ حکومت جہاں دوسری جگہوں پر لاکھوں اور کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے وہاں ان لوگوں کو آمد و رفت کے لئے اگر ٹرانسپورٹ مہیا کر دی جائے تو یہ بلا شبہ ایک قابل تعریف کام ہوگا۔ اور اس سے ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوگی۔

برطانوی حکومت میں جو انگریز اردو زبان سیکھتا تھا اسے خاص الاؤنس دیا جاتا تھا۔ حکومت اگر بنگلہ سیکھنے والوں کی بھی اسی صورت میں حوصلہ افزائی کرے تو ملکی اتحاد و اتفاق کے معاملہ میں یہ قدم بڑا موثر ہوگا۔ ایک قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ حکومت جو بین الصوبائی وفود کے تبادلے کا پروگرام بناتی ہے ان میں اگر بنگلہ جاننے والوں کو ترجیح دی جائے تو اس سے بھی بنگلہ کی تشہیر و اشاعت میں مدد ملے گی۔ یہ بات گہرے غور و فکر کی مستحق ہے۔ اگر صرف ان لوگوں کو وفود میں شامل کر دیا جائے جو مشرقی پاکستان جا کر مافی الضمیر کے اظہار کے لئے صرف انگریزی کا سہارا لیں تو اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ بہتر صورت یہ ہے کہ صرف ایسے لوگوں کو وہاں بھیجا جائے جو بنگلہ زبان سیکھ چکے ہوں۔

حکومت کو رائٹرز گلڈ کے اس شاندار منصوبے کی سرپرستی کرنی چاہیئے۔ اور اسے ہر ممکن سہولتیں فراہم ہونی چاہئیں۔ تاکہ یہ مفید کام

جاری رہ سکے۔ مسٹر سی سی داس جو خلوص و ایثار سے کام لے کر ملک و قوم کی شاندار خدمات انجام دے رہے ہیں وہ اس بات کا تقاضا کرتی ہیں کہ انہیں اپنے ملک کے طلبا کے لیے تدریس کی جملہ سہولتیں فراہم کی جائیں۔

مجھے ان میں سے اکثر طلبا اور طالبات سے ملاقات کا موقع ملا۔ ان سب کے اندر زبان سیکھنے کا ذوق و شوق قابل تعریف حد تک نظر آتا ہے۔ شہر کے دور افتادہ حصوں سے طلبا اور طالبات اس سینٹر میں بنگلہ سیکھنے کے لیے آتے ہیں، مسٹر داس تقریباً سترہ سال سے لاہور میں قیام پذیر ہیں اور بے غرض خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ۱۸ ماہ کے مختلف عرصہ میں بنگلہ زبان سیکھنے والوں نے متعدد تقریبات کا اہتمام بھی کیا جن میں مرکزی وزیر تعلیم مسٹر اے ٹی ایم مصطفےٰ، راجہ حسن اختر، مسٹر جمیل الدین عالی، احمد نواز گردیزی، جسٹس حمود الرحمٰن اور جناب عبدالوحید خاں ایسے لوگوں نے بھی شرکت کی۔ مسٹر داس نے بتایا کہ شہر لاہور کے بعض مخیر لوگ ان تقریبات کے اخراجات میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہتے ہیں ان میں علمی پریس کے مالک شیخ نیاز علی امرتسر سویٹ ہاؤس کے مالک حاجی بس اور سیون اپ کے مالکان کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

بنگلہ زبان کے شیدائی اس بات کے متمنی ہیں کہ زبان سیکھنے کے بعد وہ بنگلہ ادب کا گہرا مطالعہ کریں اور تراجم کی صورت میں اسے اردو کا جامہ پہنائیں تاکہ ایک دوسرے کی ادبی روایات اور ادبی و علمی سرمائے سے آگاہ ہو سکیں۔ بعض طلبا صرف بنگلہ زبان بول چال کے لیے سیکھتے ہیں۔ تدریس کا طریقہ اسقدر آسان ہے اور سکھانے والا اس قدر جذبہ اور عزم و استقلال کا مالک ہے کہ کوئی بھی نوارد جو صرف ملاقات کے لیے گلڈ ہاؤس میں جائے جناب داس اسے ایک آدھ فقرہ سکھانے پر مصر ہوتے ہیں۔ ان کا خلوص اور محبت انکار کی صورت پیدا نہیں ہونے دیتا جس "دیوانگی" سے وہ اپنا کام کر رہے ہیں اس کی مثال ہمارے ملک میں خال خال نظر آتی ہے۔

طلبا سے کسی قسم کی ٹیوشن فیس وصول نہیں کی جاتی۔ بلکہ طلبا تقریبات کے اخراجات بھی خود برداشت کرتے ہیں۔ رائٹرز گلڈ کے منتظمین اور داس صاحب اپنی مخلصانہ کوششوں پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اگر ان کی کوششیں بارآور ہوئیں تو یہ نرم و نازک پودہ ایک تن آور درخت کی صورت اختیار کر سکتا ہے داس صاحب کا دعویٰ ہے کہ وہ دو تین سال کے اندر اندر چار یا پانچ لاکھ افراد کو بنگلہ لکھنا پڑھنا اور بولنا سکھا سکتے ہیں۔ کاش حکومت کی طرف سے ان لوگوں کو وہ سہولتیں فراہم ہو سکیں جن سے ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ اور ملک و قوم میں اتحاد و یگانگت کی وہ فضا پیدا ہو سکے جو لسانی تفریق کی وجہ سے پیدا نہیں ہوتی۔

بقیہ:۔ مقصد حیات

کر سکے۔ اور صحیح راہ پر گامزن ہونے کے قابل بن سکے۔

آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ روشن ذہن رکھنے والے انسان اکثر ذات باری کے وجود میں تشویش اور تشکوک رہا کرتے ہیں۔ لیکن اسکے باوجود بھی کبھی ایسی حالت سے دوچار ہو جاتے ہیں کہ تصور باری درِ دل پر دستک دینے لگتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو انسان بھی ذاتِ باری کا تصور رکھتے ہیں وہ دراصل حقیقتِ انسانیہ یا نفس کلیہ کا تصور ہوتا ہے۔ جسے وہ ذاتِ باری کا تصور سمجھ کر مسرت محسوس کرتے ہیں لیکن جب کبھی وہ نفسِ کلیہ سے بلند ہو کر ذات باری میں غور کرتے ہیں تو آگے خلا ہی خلا محسوس ہوتی ہے۔ اور اس سے ذاتِ باری کا انکار جنم لے لیتا ہے۔

اگر غور سے دیکھا جائے، تو حقیقت انسانیہ سے متحد ہوئے بغیر کوئی انسان ذاتِ باری کو نہ تو تسلیم کر سکتا ہے اور نہ ہی اسکا ادراک کر سکتا ہے۔ حقیقت انسانیہ کی معرفت ہی سے ذاتِ باری کی معرفت ممکن ہے۔

اس سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ مادیئین کے نزدیک مقصد حیات کیا ہے۔ اور مذاہب خصوصاً اسلام کے نزدیک کیا۔ اسلام کے نزدیک مقصد حیات اخلاق خداوندی کا حصول ہے۔ جس سے حقیقی انسانی علوم پیدا ہوتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ تسخیر کائنات ہے۔

فیض

دیباچہ

شاید کبھی افشا ہو نگاہوں سے تمہاری
ہر سادہ ورق جس سخن کشتہ سے خوں ہے

شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمد صرصر کی تمنا میں زبوں ہے

شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمہیں چبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کے مانند زبوں ہے

ڈی فروباک

ترجمہ۔ نصیر احمد زبیری

پیلے ہاتھ

اے میرے مالک مجھے تیری تلاش ہے۔

تو ہر جگہ موجود ہے۔

میں تجھے جنگلوں۔ چراگاہوں اور شہروں میں ڈھونڈ رہا ہوں۔

اے میرے مالک تجھ سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے۔ تو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ میری ماں کے ہاتھ بہت میلے اور سخت ۔ تجھ سے التجا ہے کہ تو میری ماں کو بھی ایسے نرم اور سفید ہاتھ دیدے جیسے ایک تصویر میں حضرت مریم کے ہیں۔

تو کیا اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتا ہے۔؟ پھولوں میں چھپا ہوا ہے؟۔ یا پھر چڑیوں کے ساتھ آسمان پر اڑتا ہے؟

میں تیری گلی اور گھر کا نمبر بھول گیا ہوں۔ میں نے تجھے پہاڑوں اور گلستانوں میں بہت تلاش کیا مگر تو مجھے کہیں نہیں ملا۔

کیا تو مجھ سے آنکھ مچولی کھیل رہا ہے۔؟

اے میرے مالک تو کہاں چلا گیا ہے...... مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تو یہاں پر بیٹھا کرتا تھا۔ وہ دیکھ ..... سفید بستر۔ تکیہ ...... کیا تجھے یاد نہیں۔ کس طرح ہم دونوں کھیلا کرتے تھے۔ تو عمر دراز۔ مضبوط اور مہربان۔ میں ایک کم عمر کمزور اور شریر بچہ ..... ایک دوسرے سے کس قدر محبت کرتے تھے ساتھ ساتھ کھیلتے۔ چھوٹے چھوٹے مکان بناتے اور بگاڑتے۔ سپاہیوں کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ اور جمعہ کے دن کھانے سے قبل تو اپنی پیاری آواز میں نعت گایا کرتا تھا۔

تو مجھ سے خفا ہو گیا ہے یا یہ سب کچھ بھول گیا ہے ..... تجھے یاد نہیں ـــ اچھا میں تجھے یاد دلاتا ہوں۔ وہ ننگے پیر۔ میلا شریر بچہ ..... تجھے یاد ہے۔ شام کو تو مجھے اپنے گھٹنوں پر جھولا جھولایا کرتا تھا اور میں اپنی نرم اور چھوٹی چھوٹی انگلیوں سے تیری داڑھی میں کنگھی

کہا کرتا ..... یاد ہے تجھ کو؟۔ میری انگلی پکڑ کر تو مجھے باغ لے جاتا اور وہاں پر پھول اور چڑیاں دکھایا کرتا اور ان کے نام بتاتا اور وہ رنگین سورج..... وہ رنگین سورج ایک رنگین تصویر کی طرح کا تجھے یاد ہے۔

اے میرے مالک وہ رنگین سورج لیکر تو پھر میرے پاس آجا۔

وہ بے قرار بچہ جس کو دن بھر سکون نہیں تھا۔ جو نالے میں چھوٹے چھوٹے پتھروں سے پانی روکتا اور ریت کے پل بناتا جس کے چہرہ پر کالے کالے دھبے تھے..... اب تجھے یاد آگیا۔ اے میرے مالک اب تو نے مجھ کو پہچان لیا۔

اکثر میں تجھے کھیتوں میں سے گذرتا دیکھا کرتا تھا۔ تو بہت اونچا اور طاقتور تھا۔ مگر تیری کمر جھکی ہوئی تھی اور تو بہت آہستہ آہستہ چلتا۔

اور وہ آخری ملاقات تجھے یاد ہے؟ اپنی ماں کے ساتھ میں کھیت پر جا رہا تھا۔ تو سڑک کے کنارے ایک پتھر پر تھکا ہوا بیٹھا تھا۔ ماں نے روٹی کا ایک ٹکڑا اور دودھ تجھ کو دیا۔ تیرا چہرہ دبلا اور جھکا ہوا تھا۔ تیرے ہاتھ کانپ رہے تھے اور تیرے کندھے پر بھیک کی جھولی تھی۔ وہ تھکا ہوا چہرہ اور کانپتے ہوئے ہاتھ ابھی تک مجھے اچھی طرح سے یاد ہیں۔ ان کے ذریعہ آج بھی میں تجھے پہچان سکتا ہوں۔

—— ہم نے خدا کو کھانا کھلایا ہے ماں نے راستے میں مجھے بتایا۔

اور اب مجھے تیری تلاش ہے۔ تیری مدد کی ضرورت ہے۔ اے میرے مالک تو میری ماں کو نرم اور سفید ہاتھ دیدے۔

"کیا تم نے غور نہیں کیا کہ اللہ نے پاکیزہ بات کی مثال کسطرح بیان کی ہے، جو ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے اسکی جڑ مضبوط ہے اس کی شاخیں آسمان تک پھیلی ہوئی ہیں وہ اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا رہتا ہے اور اللہ نوع انسانی کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے۔ تاکہ وہ (ان حقائق کو) یاد کریں۔"

(۱۴: ۲۴ - ۲۵ قرآن حکیم)

"اور ناپاک بات کی مثال گندے درخت کی سی ہے۔ اس کی جڑ زمین کی سطح پر ہی ہونے کے باعث کھوکھلی ہوتی ہے جب چاہا اسے، اکھاڑ پھینکا۔ اس کے لئے ثبات نہیں۔"

(۱۴: ۲۶ قرآن حکیم)

ڈاکٹر سید صفدر حسین

سہارا

کوششِ ناز کی پالی ہوئی ہر ایک ادا
گیسوئے حسن کے سائے میں محبت والے

پہلوئے حسن میں جب نیند سے جھک جاتی ہے
یوں سکوتِ شبِ یلدا کا مزا لیتے ہیں

اپنی تاریک فضاؤں کو شبِ غم لے کر
نکہتِ گل کی طرح جب کوئی آتا ہے خیال

دلِ مایوس کے پہلو میں سمٹ آتی ہے
ایک لفظوں کا طلسمات بنا لیتے ہیں

جب گھٹا جھوم کے آجاتی ہے میخانے پر
خلوتِ روح میں کھوئے ہوئے فردوس کے خواب

بربطِ دل کی صدا روح پہ چھا جاتی ہے
کچھ تخیل کے دیئے آکے جلا جاتے ہیں

پرتوِ رخ کی کرن سوئے دل آہستہ خرام
افقِ ذہن پہ بادل جو ہیں ہلکے ہلکے

میرے سوئے ہوئے جذبات جگا جاتی ہے
پھیل کر عالمِ جذبات پہ چھا جاتے ہیں

پھر تو ہر نغمہ تعین کی حدوں سے بڑھ کر
عالمِ قدس کو بیدار کئے دیتا ہے
چاند کے پردۂ سیمیں سے نکل کر کوئی
خود کو آغوشِ تمنا میں دیئے دیتا ہے

فہمیدہ اختر

رقصِ تن

ہمیشہ کے بالکل برخلاف اس روز اس راہ پر وہ بے حد افسردہ تھی۔ بے حد سنجیدہ اور سوچوں میں ڈوبی، ڈوبی سی۔۔۔! فضاؤں میں کوئی رعنائی نہیں تھی۔ کوئی جاذبیت نہیں تھی۔ کوئی نغمہ بلند نہیں ہو رہا تھا۔

کشور کشاؤں کے راستے کے یہ پیچ و خم۔۔؟؟ یہ زندگی میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔؟؟ اگر یہ بھول بھلیاں نہ ہوں تو یہ شاہراہ کتنی دلنشیں ہو۔؟ زندگی کتنی حسین ہو۔؟ کائنات کتنی رنگین ہو۔؟؟

وہ رات ۔۔۔ ؟؟ ہاں وہ رات جو اس نے دریائے سوات کے کنارے مدین ہوٹل میں گذاری تھی۔ اس رات ہی نے تو اس کی زندگی میں گرہیں ڈال دیں ۔۔۔؟ ورنہ اس کی زندگی کی رہ گزر کتنی صاف تھی۔؟ کتنی کشادہ؟ کتنی مستقیم؟ اس پر کوئی موڑ نہیں تھا! کوئی رکاوٹ نہیں تھی! کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔!

وہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ جب کہ اس نے گھر میں شہریار کا نام سنا تھا۔ جب مہربان دادی نے یہ کہا تھا کہ اس کی عمر ہی کتنی ہے؟ تو اسے کتنی خوشی ہوئی تھی؟؟ کالج کے دور میں اس نے زبیر، تابش، مجیب اللہ اور اکرم محمد وغیرہ کے نام سنے تھے جنہیں گھر کے لوگوں نے رد کر دیا تھا۔ اور ہر رد میں اس کے لئے کتنی طمانیت ہوتی تھی ۔۔۔؟؟ وہ بی اے کا امتحان ہی تو تھا جس کے اختتام پر وہ تفریح کے لئے اپنے ماضی کے اس محبوب مقام خیبر ۔۔۔ پک نک پہ آئی تھی۔ ان پہاڑوں پہ پہلے کی طرح ان دنوں بھی کتنی شان چھائی ہوئی تھی۔؟ کتنی سطوت برس رہی تھی ان پر۔؟ کتنا وقار ٹپک رہا تھا ان پر سے۔؟؟ ۔۔۔ جانے ان کے دل میں اچانک اس خیال نے کیوں جنم لیا تھا کہ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ تو پہلے سے موجود ہے اور ان پہاڑوں کے پیچھے ہی تو ہے ۔۔۔؟۔ ان ہی کی طرح متین۔ رفیع۔ بارعب۔!!۔

اور پھر کچھ وقفے کے بعد جب گھر میں نخشب، سلیم، داؤد اور یوسف وغیرہ کے نام بڑی اہمیت کے ساتھ لئے گئے تو وہ یہ سمجھتی رہی تھی کہ یہ تو محض ایک مذاق ہے۔ وہ۔ وہ تو ازل سے موجود ہے۔ خیبر کے اس طرف ۔۔۔!! دور کسی اجنبی دنیا میں۔۔!!

وہ جنوری کا مہینہ تھا عصر کے قریب وہ اپنے کمرے میں گرم مسند لی میں بیٹھی تھی کہ روحیہ آگئی تھی اس کے چہرے کے گلابی رنگ میں معانی کے رنگ پوشیدہ تھے۔ چند لمحوں تک وہ یوں چپ بیٹھی رہی تھی جیسے کوئی خاص بات کرنے کے لئے موقع کی تلاش میں ہے۔ آخر کچھ جھجکتے ہوتے بولی ۔۔۔ "کنیز کیا خیال ہے تمہارا ؟"

وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی تھی "کس سلسلے میں ؟"

"وہی نخشب کے سلسلے میں ۔۔ خان بابو کو تو وہ بہت پسند ہے اور خان لالہ کو بھی اور سب کو"

اس کا چہرہ سنجیدہ ہو گیا تھا۔ وہ چپ چاپ کتاب پڑھنے لگی تھی۔

قدرے انتظار کے بعد روحیہ ڈرتے ڈرتے پھر بولی تھی۔

"تمہیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟ وہ ہر لحاظ سے اچھا ہے"

اس نے غصہ سے ورق الٹتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "تو پھر اس کے لئے ہر لحاظ سے کوئی اچھی سی لڑکی بھی تلاش کر لو"

جب روحیہ چلی گئی تھی تو وہ ہولے سے ہنس دی تھی۔

اگر نخشب اس کے کمرے میں آ جائے تو جانے ان کتابوں اور رسالوں کو کس غیر فنکارانہ طریقے سے اٹھائے اور بے ترتیبی سے رکھ دے اور وہ بھی یقیناً بغیر پڑھے۔ ان کی وہ کوٹھی جو جدید تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ اس میں کسی جگہ بھی کوئی کتاب نظر نہیں آتی۔ وہ ایک کامیاب افسر سہی لیکن وہ رومی کو کیا جانتا ہے۔؟ خیام کو کیا سمجھ سکتا ہے؟۔ غالب کو کیا پہچانتا ہے؟۔ توبہ۔ توبہ۔ ایسے انسان کے ساتھ میری زندگی سسکتے ہوئے ہی گذر سکتی ہے۔

اور پھر اس کی نظروں میں خیبر کے پہاڑ تیزی سے گھومنے لگے تھے۔ وہ آئے گا ۔۔۔ وہ آئے گا ۔۔۔ ہاتھوں میں خیام کی قبر پر سے زرد آلوؤں کے پھول تھامے ہوئے ۔۔۔ حافظ کے شعر گنگناتا ہوا۔ اس کی نگاہوں میں رومی اور رحمٰن بابا کے کلام کی تمام عظمت چھائی ہوگی۔ اس کی پیشانی پر عرفی کے غرور کی ساری چمک موجود ہوگی۔ اس کے انداز میں فیض، بیدل اور نظیری کے فن کی ساری باریکیاں رچی بسی ہوں گی۔ اس کی گفتار پر غزالی، رازی اور ابن سینا کا سارا فلسفہ غالب ہوگا اور خوشحال خاں خٹک کی روح کا سارا درد رکھنے والے اس کے قدم خاقانی اور سلیمان کے زندانوں کی دیواروں کو گرانے والے ہوں گے!!۔

اس کا دل پکار اٹھا تھا ۔۔۔ میں اس کا انتظار کروں گی۔ انتظار ۔۔۔ ہاں انتظار ۔۔۔

پھر اُسے سلیم یاد آ گیا تھا ۔۔۔ وہ بڑا زمیندار ۔۔۔ وہ تلخی سے مسکرا دی تھی۔ سورج جب سر پر آ جائے تو اس وقت اٹھنے والا سلیم ۔۔۔ کالج میں اس کی بہنیں کتنے فخر سے کہا کرتی تھیں۔ کہ گل لالہ تو اتنے شریف ہیں۔ اتنے نیک۔ کہ حجرے میں بھی کم جاتے ہیں۔ لوگوں سے بہت کم تعلق رکھتے ہیں۔ بس سارا سارا دن اپنے کمرے میں لیٹے رہتے ہیں ۔۔۔ اس کا جی چاہا کہ وہ بے اختیا ہنس دے۔ سلیم بھی بھلا کوئی انسان ہے؟ آبا ؤ اجداد کی دولت پر سانپ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھنے والا ۔۔۔ بے حس۔ بے حرکت۔ خ کے بندوں سے گریزاں ۔۔۔!!۔ اور پھر فوراً اس کا دل گنگنانے لگ تھا ۔۔۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ خیبر کے اس پتھریلے سلسلہ ہائے درا کے پیچھے رہنے والا۔؟؟ عمل اور حرکت کا بندہ۔!!۔ محبت او خلوص کا پیکر ۔۔۔!! ایمان اور نیکی کا مجسمہ۔!! جب تازہ دم مسکرا کر اس پہاڑی کائنات کو دیکھنا چاہتا ہے او اس کا سر چادر کھسکنے لگتی ہے اور سپید سا دریا نظر آنے لگتا ہے جس ک پیچھے اُجالوں کا سیلاب بہہ نکلنے کے لئے مضطرب ہوتا ہے ا وقت وہ جاگ اٹھتا ہے۔ ایک خاص انداز سے اپنی نورانی پیش پر سے بال ہٹاتا ہے اور پھر مسکرا کر فضاؤں کو دیکھتا ہے۔ فض بھی مسکرا پڑتی ہیں۔ اناری سورج ایک جھٹکے کے ساتھ اونچے ا پہاڑوں کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے اور ہر طرف روشنیا پھیل جاتی ہیں۔

پھر اچانک اسے یوسف کا خیال آ گیا تھا۔ یوسف جس کے حق میں گھر کے سب افراد ہیں اور جسے سب بہت ز پسند کرتے ہیں۔ جو ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ایک اونچے مرتب ہے اور جس کے متعلق سب کہتے ہیں کہ وہ بڑا خوبصورت ہے دراز قد ۔۔۔ صحت مند جسم۔ پیازی ۔۔۔ پیازی رنگت۔ ر سبز موٹی موٹی آنکھیں ۔۔۔ مگر گھر کے ان لوگوں کو کیا معل کہ تعلیم کے زمانے سے اس کے بارے میں کتنے افسانے مش ہیں۔؟ اس نے بیک وقت کتنی لڑکیوں سے شادی کے و کئے تھے؟ کتنی لڑکیوں کو بے وقوف بنایا تھا۔؟ اور وہ فر وہ تو رو رو کر کھلم کھلا زمانے کو بتاتی ہے کہ جب گھر اور گ باہر میرا ٹھکانہ نہ رہا اور میں نے یوسف سے جلد شادی کر کہا۔ تو بگڑ کر بولا "میں تم جیسی لڑکیوں سے شادی کر سکتا ہ پیاری فرزانہ ۔۔۔ کتنی نادان لڑکی ہے۔ اپنی زندگی کو کتنا کر دیا ۔۔۔؟! اور سنا ہے کہ یوسف یورپ سے جو البم الیسی لا

ین میں خوبصورت خوبصورت لڑکیوں کی تصویریں ہیں اور کہتا ہے یہ سب میرے ساتھ شادی کرنے کے لئے بے چین تھیں مگر میں دامن چھڑا کر آگیا۔ اسے اپنی شفیق دادی یاد آگئی تھی۔ بچاری دادی ــــ جوانی دے میں گذاری، بڑھاپے میں تسبیح اور مصلے کو اپنے سے جدا نہ کیا۔ نہیں دنیا کا کیا پتہ؟ جب ہی تو کہتی ہیں۔ کتنا شریف ہے یوسف۔ ین سال ولایت میں رہا اور وہاں سے بیوی نہ لایا۔ اور وہ بشیر، زاہد، اختر وغیرہ۔ چھ چھ ماہ کے لئے گئے اور سفید سفید بے نمک لڑکیوں کو ساتھ لے آئے۔

جو دوسروں کے جالوں میں پھنس گئے وہ غیر شریف ٹھہرے اور جو دوسروں کے لئے جال بچھاتا رہا وہ شریف رہا۔

اور پھر اس نے سوچا تھا۔ کہ یوسف کی نظریں کتنی آلودہ ہو سکتی ہیں کتنی آلودہ ــــ اور چہرے کی فطری آب و تاب کتنی ماند ہو سکتی ہے؟ کتنی ماند؟ وہ خیبر کے ان پہاڑوں سے دور کی دنیا کا باشندہ ہے؟ وہ جب کسی نہایت خوبصورت لڑکی کے قریب سے بھی گزرتا ہو گا تو کس شانِ بے نیازی سے گزرتا ہو گا۔؟؟ اور اس کے چہرے کی قدرتی چمک دمک میں کتنی توانائی ہو گی؟ کتنی کشش؟ کتنی رونق؟ کتنی معصومیت؟

اس نے قدرے گھبرا کر کار کا جائزہ لیا۔ خان آغا بڑے مطمئن انداز میں کار چلا رہے تھے ان کے قریب اگلی سیٹ پر بیٹھی گل نار شیشوں کا جائزہ لے رہی تھی اور اس کے پاس پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا ننھا گل آغا اونگھ رہا تھا۔

ہاں تو اس شام روحیہ کے چلے جانے کے بعد وہ احمد خٹک کو بھی تو نہیں بھولی تھی؟؟ اس نے غور کیا تھا۔ کہ وہ ایک کامیاب وکیل سہی۔ معزز خاندان سے سہی۔ باذوق اور اچھی سیرت کا سہی ــــ لیکن ان کے ہاں خواتین جب گھر سے باہر قدم رکھتی ہیں تو مردوں کی اجازت سے۔ ایک پیسہ خرچ کرتی ہیں تو مردوں کی رضا سے۔ خدا بچائے ایسے گھر سے جہاں زندگی یوں، دبی ہوئی سی رہے ــ اور وہ خیبر کا ہمسایہ ــ؟ اچانک اس کے دل نے سوال کر دیا تھا؟ اور پھر خود ہی جواب دے دیا تھا۔ وہ زندگی کی تمام اقدار سے کس قدر پیار کرنے والا ہو گا ــ؟ کس قدر احترام کرنے والا ــــ؟؟

اس کی فکر نے داؤد کا بھی تو احاطہ کیا تھا۔ بات بات پہ غضبناک ہو جانے والا داؤد؟ اس کی خاندانی وجاہت اور علمی شخصیت کس کام کی ــــ؟ اور وہ خیبر کا دوست؟؟ جیسے چپکے سے اس کے کان میں کسی نے کہہ دیا تھا۔ اس کی ہر بات میں گلیات کے چشموں کا ترنم ہو گا ــــ!!

اس کی نظریں علی مسجد کے پاس گہرائیوں میں بہتے ہوئے چمکیلے پانی پر پڑ گئیں۔ دریائے سوات کا پانی بھی تو اسی طرح چمکتا ہے ــ؟ آہ وہ اس کے کنارے مدین ہوٹل والی رات۔

سورج قریب کے اونچے پہاڑ کے پیچھے ڈوب چکا تھا شام کے دھندلکے بڑھنے لگے تھے۔ ہر طرف گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ اور دریائے سوات کے پانی کا شور بڑھ گیا تھا۔ ہوا میں خوشگوار ٹھنڈک پھیل گئی تھی۔ وہ اور نزہت دیر تک اوپر جنگلے کے پاس کھڑی رہی تھیں اور پھر نیچے اتر آئی تھیں اور دریا کے کنارے گھومنے لگی تھیں۔ نزہت اسے چپ چپ سی لگی تھی۔ جیسے کسی گہری سوچ میں ہو۔ اس نے پوچھا تھا "کیا سوچ رہی ہو تم"

"سچ کہوں تو تمہارے متعلق ہی سوچ رہی ہوں"

"میرے متعلق؟"

"ہاں"

"کیا ــ؟"

"یہی مستقبل کے بارے میں"

"کیسا مستقبل؟"

"ہر لڑکی کی زندگی ایک مستقبل رکھتی ہے"

وہ بے نیازی سے بولی تھی ــ "مگر اس میں سوچنے کی کیا بات ہے ــ؟"

نزہت نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا "یہ زندگی کا اہم مسئلہ ہے"

"اگر موزوں انسان مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ یہ ایسا سوال نہیں ہے کہ اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا جائے"

نزہت اصل موضوع کی طرف آ نکلی تھی "موزوں انسان سے تمہاری مراد کیا ہے"۔ اس نے مطمئن انداز میں جواب دیا تھا "شاید یہ کہ وہ مرضی کے عین مطابق ہو"۔

نزہت نے سامنے اس کچی سڑک پر نظریں جما دی تھیں جو دو پہاڑوں میں سے ہو کر تالام تک جاتی ہے "تو تمہاری مرضی کیسا انسان چاہتی ہے؟ کیسی شکل صورت؟ کیسا مزاج؟ ملازمت؟ تجارت؟ بیکاری؟"

وہ ہولے سے مسکرا دی تھی "یہ بتا کر اس کے سراپا اور کردار کو کیوں آلودہ کروں؟ وہ تمہاری نظروں میں رقصاں ہو جائے گا۔ تم اس کے بارے میں اوروں سے بیان کرتی پھرو گی اور یوں وہ—"

نزہت نے اس کے فقرے کو کاٹ دیا تھا "افسانوی باتیں نہ کیا کرو۔ زندگی عمل کا نام ہے عمل گفتگو کرو"۔

چمکیلا چاند پہاڑ کے اس طرف سے نمودار ہو گیا تھا اور پہاڑ کے اوپر کے حصہ پر نورانی دھندسی چھا گئی تھی وہ اس دھند کا نور اپنی روح میں بھرتے ہوئے بولی "جب اپنے خیال کا اظہار چاہتی ہوں تو تم آگے سے بولنے نہیں دیتیں"۔

نزہت الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی تھی "یہ خیال کا اظہار ہے یا خواب کی باتیں؟"

"آؤ چاندنی کی باتیں کریں۔ دیکھو پہاڑ کی چوٹی پریوں کا دیس معلوم ہوتی ہے"

نزہت کا انداز ناصحانہ تھا "زندگی کے چند سال اور موجودہ صورت میں گذرنے دو پھر تم سے پوچھوں گی کہ چاندنی میں کتنا حسن ہے؟ اور پریوں کا دیس کتنی کشش رکھتا ہے"

اس نے ہنس کر نزہت کے شانے پر سر رکھ دیا تھا۔

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر تمہیں خیال آئے گا کہ جس نے اپنا مستقبل قائم نہ کیا اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ قانون فطرت سے روگردانی معیار قائم نہیں رکھ سکتی"

وہ دھیرے سے بولی تھی "میں ملازمت کر لوں گی"

نزہت نے ہلکا سا قہقہہ لگایا تھا "اگر خدانخواستہ ملازمت کے دوران کسی دائمی بیماری نے آن گھیرا تو پھر کیا کرو گی؟"

اس کے لہجے میں متانت پیدا ہو گئی تھی "تو تمہارا کیا خیال ہے کہ جو سامنے آئے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیئے جائیں؟"

نزہت کی آواز قدرے بلند ہو گئی تھی "سلیم کی حیثیت سامنے آنے والے کی ہے؟ یوسف ایرا غیرا ہے؟ مختشب کوئی راہ گذر ہے اور ۔۔۔۔"

اس کا لہجہ مترنم ہو گیا تھا "وہ خیبر کے پہاڑ ۔۔۔"

"کیا کہا"

وہ گھبرا گئی تھی —"یہ تو میرے ناول کا عنوان ہے"

"بس تم ناول کی دنیا میں مگن رہنا۔ خیبر کے پہاڑ اور سوات کے دریا"

وہ ہنس دی تھی، — "گلیات کے چشمے اور کاغان کے آبشار"

نزہت کا انداز تحکمانہ تھا "مگر ذیرہ بجو کی آجکل کی حالت کا تمہیں علم ہے"

"کوئی خاص نہیں"

نزہت کی آواز میں جوش بھر گیا تھا "اس کا توانا اور خوبصورت جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ یہ محض اس لئے کہ اچھے اچھے رشتے آئے مگر شادی سے برابر انکار کرتی رہی کہتی تھی کہ خدا محافظ ہو ان کا میرے سات بھائی ہیں میں ان کے پاس رہوں گی مجھ سے غیروں کی خوشامد نہیں ہو سکتی۔ جب تک ماں باپ زندہ رہے گھر میں عزت رہی ان کے بعد ہر بھاوج نے اسے اپنے پر بوجھ تصور کیا۔ بھائیوں نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔ اگر بہن کے ہاں رہ رہی ہے اور بہن اور بہنوئی دلجوئی بھی بہت کرتے ہیں تو کیا ہوا۔ بہن کے ہاں کا پانی کا ہر قطرہ اس کے لئے بچھو کا ڈنک ہے اور روٹی کا ہر نوالہ زہر سے بھرا ہوتا ہے"

نزہت کی زبان سے اس حقیقت کو محسوس کر کے وہ پریشان ہو گئی تھی۔ خیبر کے اونچے اونچے پہاڑ دور کھسک

گئے تھے اور اپنی ساری کشش کھو بیٹھے تھے۔ اس بار اس کی قائم کی ہوئی دنیا میں زلزلہ آگیا تھا۔۔۔ وہ منہدم ہوگئی تھی۔!!

چاند اور بلند ہوگیا تھا۔

چمکیلی کرنیں اُبھرتی ڈوبتی لہروں پر پڑنے لگی تھیں یوں لگنے لگا تھا جیسے بڑی بڑی سی سنہری مچھلیاں کبھی ڈبکی لگا دیتی ہیں اور کبھی سطح پر آجاتی ہیں۔

کچھ دیر تک وہ دونوں ٹہلتی رہی تھیں مگر چپ۔ خاموش پھر وہ دونوں اوپر آگئی تھیں۔ نزہت تو کمرے میں چلی گئی تھی اور وہ جنگلے پر جھک سی گئی تھی۔

پہاڑ کی بلندیوں پہ چند کچے کچے سے مٹی کے مکان تھے اور ان کے قریب ایک لہلہاتا ہوا کھیت۔ اور اس سے نیچے ایک اور۔۔۔ پھر ایک اور کھیت۔۔۔ پہاڑ کے سینے میں بنے ہوئے ان اوپر نیچے کھیتوں کو وہ دیکھنے لگی تھی کتنا سکون چھایا ہوا ہے ان کھیتوں پر؟ مگر، یہ اس کی زندگی کس طوفان سے دوچار ہوگئی؟ یہ کیسی قیامت ہے جس سے اس کا ذہن اور دل ہمکنار ہوگئے؟

اسے رحمت، رضیہ اور ممتاز وغیرہ یاد آگئی تھیں۔ کرنل جبار کے گھر جاؤ تو اجنبی کیسے سمجھ سکتا ہے کہ یہ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس یہ کام کاج میں مصروف رحمت یہ کرنل جبار کی بہن ہے یہ سزا اسے اس لئے مل رہی ہے کہ والدین کو کوئی رشتہ پسند ہی نہیں آتا تھا۔ سو شادی نہ ہوسکی۔ رضیہ کی شادی بیمار ماں نے اس لئے نہ کی کہ اس کی تیمارداری کون کرے گا۔ نتیجہ یہ کہ ماں کے مرنے کے بعد ایک ہفتہ انجینئر بھائی کے یہاں گزرتا ہے تو دوسرا ہفتہ ڈاکٹر بھائی کے ہاں۔ جس کے گھر جاتی ہے اپنے لئے نفرت کے جذبات پاتی ہے لیکن بے غیرت بن کر زندگی گزار رہی ہے۔ اور وہ بیمار ممتاز؟ جس کی شادی جانے کیوں نہ ہوئی۔ اور جسے بھاوجوں کی سختیوں ہی نے بیمار کیا مقامی ہسپتال کے جنرل وارڈ میں پڑی ہے اور کوئی پرسان حال نہیں۔ اور اس کے بھائی؟؟ ایک تو کامیاب بزنس مین ہے۔ دوسرا پروفیسر ہے اور تیسرا ایس، پی ہے۔

چاند مدین ہوٹل کی چھت پہ اپنی چمک برسانے لگا تھا۔ اور دریائے سوات پر تاریکی چھا گئی تھی۔ مچلتی ہوئی چمکیلی لہریں جیسے سوگئی تھیں۔ مگر اس کے احساسات اور شدت کے ساتھ جاگ اٹھے تھے اور شدت کے ساتھ۔

منصور کی تو شادی ہوگئی۔ طفیل کی بھی منگنی ہوگئی۔ مگر داؤد، سلیم، یوسف اور نخشب وغیرہ۔؟ تو پھر۔۔۔؟ ان میں سے نسبتاً کون موزوں ہے؟ کون۔؟ میرے خدا کون؟ کون۔۔۔؟؟؟

وہ جھنجھلا کر کمرے میں آگئی تھی اور پلنگ پر لیٹ گئی تھی۔

چمکتا ہوا چاند مدین ہوٹل کی دوسری طرف جھک سا گیا تھا اور روشندان میں سے جیسے چمکیلی ریت کے ذرّے دلہنے ایک ہجوم کی شکل میں اس کے پلنگ پر نور سا پھیلانا شروع کردیا تھا۔ مگر اس کی زندگی برابر پیچ و خم میں گم رہی تھی۔

چاند اس سے ہٹ کر دور چلا گیا تھا اور وہ چمکیلی ریت کا کارواں لٹ کر رہ گیا تھا۔

کار کی رفتار اچانک مدھم ہوگئی۔

اس کی پریشان نظروں نے چونک کر سامنے دیکھا۔

کار سے آگے سبز رنگ کی ایک بس آہستہ آہستہ چڑھائی چڑھ رہی تھی۔

بس میں سے کسی من چلے نے سر باہر نکالا اور ٹپہ الاپ دیا۔

خُما نجیل لالی بادر دی

کہ دَ نیزو پلا سر و لا لم دی را بل شینہ

(مجھے اپنے محبوب پہ اعتماد ہے اگر اسے نیزوں کے سروں پر سے بھی گزرنا پڑے تو بھی وہ ضرور آئے گا۔)

آواز میں گہرا جادو تھا۔

وہ جادو خیبر پر چھا گیا۔ اس کی ذات پر چھا گیا۔ اس کے چہرے پر سے آندھی گذر گئی اور وہ پرسکون ہوگیا۔ خیبر کی فضاؤں پر چھایا ہوا دھواں غائب ہوگیا اور ان کی ساری عظمت، شوکت اور رعنائی ایک بار پھر ہنس پڑی۔ دل و دماغ کو دائمی آسودگی بخشنے

ربیعہ فخری

نچھی

اب تو وہ ہر صبح کو اپنے ننھے بھتیجے مونی کی انگلی پکڑے بس پر کھڑی نظر آتی ہے۔ اس کے دو تہائی بال سفید ہو چکے ہیں۔ اس کی وہ چوٹی جو کبھی ناگن کی طرح اس کی کمر پہ بل کھاتی رہتی تھی گھٹتے گھٹتے اب بالشت بھر کی رہ گئی ہے۔ غالباً اسی لئے وہ اسے لٹکانے سے گریز کرتی اور بل دے کر پنوں کے ذریعہ سر پہ چپکا لیتی ہے۔ اس کے آگے کے چھوٹے چھوٹے بال چوٹی میں سے نکل کر اس کی پیشانی پر بکھر جاتے ہیں۔ اس کا وہی دوپٹہ جو کبھی اس سے سنبھالے نہیں سنبھلتا تھا، اور بازوؤں پہ ڈھلک ڈھلک جایا کرتا تھا، اب سر پہ یوں چمٹا رہتا ہے جیسے اڑ کر کسی جھاڑی سے جا اٹکا ہو۔ اور تو اور اب اس نے چادر بھی اوڑھنی شروع کر دی ہے، کسر صرف اتنی ہے کہ وہ سر کی بجائے شانوں پہ سے چادر لپیٹتی ہے۔ جانے کب وہ شانوں سے اٹھ کر سر پہ جا پہنچے اس کی بڑی بڑی سیاہ چمکیلی آنکھیں غبار آلود ہو چکی ہیں۔ اس کے پپوٹوں پر زرد جھلی سی نمودار ہو گئی ہے، وہ کھوئی کھوئی بے نور سی آنکھوں سے اس سمت تکتی رہتی ہے، جس سمت سے بس آتی ہوتی ہے لیکن اس کی نظریں تاثر سے خالی ہوتی ہیں، اس کے انداز سے کچھ ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ کہیں بھی نہ دیکھ رہی ہو۔ جیسے اسے کسی کا بھی انتظار نہ ہو۔ جیسے اس کے وہاں کھڑے ہونے کا کوئی مقصد ہی نہ ہو۔ جیسے اس کی کسی بات ہی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ جیسے اس کی زندگی ہی مقصد سے خالی ہو چکی ہو۔

اور واقعی اس کی زندگی میں اب دھرا ہی کیا ہے۔ اب تو اسے ڈاکئے تک سے نفرت ہو گئی ہے، ایک زمانہ تھا کہ وہ لان میں ٹہل ٹہل کر ڈاکئے کا انتظار کرتی تھی، پھر اس نے لان میں ٹہلنا چھوڑ دیا۔ ہاں البتہ جب کوئی ادھر سے گزرتا ہوا سائکل کی گھنٹی بجا دیتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے، اور وہ کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھ لیتی کہ کہیں ڈاکیہ تو نہیں آیا، مگر اب تو اسے سائیکل کی گھنٹی تک سے بھی چڑ سی ہونے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے کوٹھی کے مین گیٹ پر لیٹر بکس لگوا لیا ہے کہ ڈاکیہ آئے تو خاموشی سے خط ڈال کر چلا جائے یہ اور بات ہے کہ اب بھی جب کبھی تین بجے سہ پہر کا عمل ہوتا ہے تو وہ سوتے میں چونک پڑتی ہے اور نیم غنودگی میں کھڑکی کا پردہ اٹھا کر ایک نظر باہر دیکھ لیتی ہے۔ اس سے ہوتا کیا ہے، دوسرے ہی منٹ وہ کروٹ بدل کر سو جاتی ہے، اور اس وقت تک بے خبر سوتی رہتی ہے، جب تک کہ ننھا مونی آ کر اس کے اوپر نہ چڑھ جائے۔ اور آنٹی آنٹی کہہ کر اس کو جھنجھوڑ نہ دے۔

ہاں جب کبھی اس کی بھابی "نچھو باجی آپ کا خط ہے" کہکر اس کے ہاتھ میں کوئی لفافہ پکڑا دیتی ہے، تو اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو جاتی ہیں اس کی کنپٹیاں تھر تھرانے لگتی ہیں، اس کے ہاتھ کانپنے لگتے ہیں، اس وقت اسے اپنے وہ تمام عزائم بھول جاتے ہیں جو اس نے آئندہ خط کو بغیر پڑھے جلا دینے کے سلسلے میں کئے ہوتے ہیں۔ اسے تو وہ قسمیں بھی یاد نہیں رہتیں جو اس سلسلے میں اس نے نمازیں پڑھ پڑھ کر کھائی ہوتی ہیں۔ بار بار خط اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلنگ پر گر جاتا ہے۔ اور بار بار وہ اسے اٹھا کر کھولنے

کی کوشش کرتی ہے۔ وہ خط کھولتی ہے، الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگتے ہیں، وہ خط پر جھک جاتی ہے، وہی پیار، محبت اور خلوص کی خوشبو میں لپٹا ہوا خط، اُس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ جاتی ہے۔ وہ پڑھتی ہے۔

"پیاری نجمی! حق تو یہ ہے کہ اب تو میری یہ ہمت بھی نہیں پڑتی ہے کہ تم کو پیاری نجمی کہہ کر خطاب کروں ۔ حق تو یہ ہے کہ اب تو میری اتنی ہمت بھی نہیں کہ تمکو خط ہی لکھ سکوں، مگر مشکل یہ ہے کہ نہ لکھنے کی ہمت بھی تو نہیں رہی کہ تم کو خط نہ لکھوں ۔ کئی بار قسم کھائی کہ اب کبھی تم کو خط نہیں لکھوں گا مگر... نجمی میں کیا کہوں ۔ کچھ کہنے کو زبان بھی اُٹھتی ہو۔ اس کشمکش سے تو موت بہتر ہے۔ کاش میں کچھ لکھنے سے پہلے ہی ختم ہو جاؤں مگر شاید قدرت کو یہی منظور ہے کہ میں اس عذاب میں مبتلا رہوں اور چاہئے بھی یہی ۔ میں گنہ گار ہوں، میں مجرم ہوں، تمہارا مجرم ۔ تمہارا گنہ گار ۔ نجمو ۔ میں معصوم نہیں ۔ میں بے گناہ نہیں ۔ میں عذر گناہ نہیں کرتا ۔ میں نے جو کچھ کیا جان بوجھ کر کیا ۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے والدین ظالم ہیں، جابر ہیں ۔ سفاک ہیں ۔ قاتل ہیں ۔ افراد کے نہیں جذبات کے قاتل وہ گلوں پر نہیں دلوں پر خنجر چلاتے ہیں ۔ مجھے علم تھا کہ میرا پورا خاندان قاتل ہے ۔ قصائی ہے ۔ قصائی ۔ مگر میں نے پھر بھی تمہاری زندگی خراب کی ۔ نجمو میں ذلیل ہوں ۔ کمینہ ہوں ۔ تنگ دل ہوں ۔ نجمو مجھ سے نفرت کرو ۔ مجھے ذلیل سمجھو ۔ مجھے مار دو ۔ جان سے مار دو ۔ قتل کر دو ۔ تمکو حق حاصل ہے ۔ نجمو کاش میں تم سے ملنے سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ۔ مر جاتا ۔ کاش کہ... کاش ... "

نجمو کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ۔ وہ تھوڑی دیر گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھی رہتی، پھر خود کار مشین کی طرح اُٹھتی، سوئی کا ہاتھ پکڑتی اور بازار نکل جاتی ۔ اس وقت اس کے چہرے پر سکون کے آثار نمایاں ہو جاتے ۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے سمندر میں طوفان گزر گیا ہو ۔ اور سطح پر ایک پھیکی سی اداس کُن سی ہمواری چھوڑ گیا ہو ۔ وہ نہ جانے کیا کچھ خریدتی ... اُن کے پیکٹ بناتی ۔ اور ان کو پارسل کر کے بھاری بھاری قدم اُٹھاتی ہوئی اس طرح لوٹتی جیسے کوئی اپنے مردے کو دفن کر کے لوٹا کرتا ہے ۔

اس دن گھر کی کسی بات میں اس کا جی نہ لگتا ۔ اور لگتا بھی کیسے ۔ جن کے اپنے گھر میں آگ لگی ہو وہ دوسروں کے معاملات میں کیا دلچسپی لے، جس کے اپنے دل کو چین نصیب نہ ہو وہ کسی کی شادی و غمی کو کیا محسوس کرے۔

"ہائے" وہ سوچتی "یہ میں نے کیا کیا ۔ بھلا مجھے کیا مصیبت پڑی تھی کہ میں اسے تحفے بھیجتی" وہ دیر تک کف افسوس ملتی رہتی ۔ مگر وہ کرتی بھی تو کیا ۔ اسے تو اظہار محبت کا یہی ایک طریقہ آتا تھا.. اور بس ۔! اس کی محبت کو دنیا جانتی تھی، کیرلین اس کے پیار کی ابتدا بھی تو اسی سے ہوئی تھی ۔ جب اس نے پہلے پہل محسن کو کیرلین کی قمیض خرید کے دی تھی تو اس وقت اسے یہ تھوڑا ہی معلوم تھا کہ بات یہاں تک پہنچے گی ۔ اس نے تو بس دے دی تھی، اس لئے کہ اس کو محسن کی دھاری دار قمیض پسند نہ تھی۔

محسن کریسنٹ بک ڈپو میں سیلز مین تھا اور کاروبار کے سلسلہ میں اردو پبلشنگ ہاؤس کے منیجر کے پاس آیا جایا کرتا تھا ۔ باپ کی وفات کے بعد اردو پبلشنگ ہاؤس کی تمام دیکھ بھال نجمی نے اپنے سر لے لی تھی، اور حق تو یہ ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کرتی تو گھر میں فاقوں کی نوبت آجاتی ۔ اس کا بھائی عظیم تو ابھی آٹھویں جماعت ہی میں پڑھتا تھا، وہ اتنے بڑے ادارے کی دیکھ بھال کیا کرتا ۔ اور اس کی ماں ۔ وہ تو پردہ نشین تھی ۔ اس بیچاری نے تو قیام پاکستان سے قبل ڈولی کے علاوہ کسی سواری میں سفر تک نہ کیا تھا ۔ وہ پردہ سے نکل بھی آتی تو کیا کرتی ۔ اسے تو نجمی کا دکان پر جانا بھی گراں گزرتا تھا ۔ اس نے تو بارہا بیٹی سے کہا تھا ۔

"نجمو بیٹی اب تو دکان پر نہ جایا کر"

"ہائے" نجمو حیرت سے چلاتی "نہ جاؤں تو کام کیسے چلے"

"سب چل جائے گا" ماں تسلی آمیز لہجے میں کہتی "اب تو ماشاء اللہ عظیم بھی ہوشیار ہو گیا ہے"

"اونہہ" نجمی منہ بنا کر کہتی "امی ۔ تم داؤد خان کو نہیں جانتیں وہ تو عظیم کو سینکڑوں بار چلا کر چھوڑ دے ۔"

"تو پھر کسی اور کو منیجر بنا دیتے ہیں" ماں کہتی۔

"امی یہ سب ہی داؤد خان ہوتے ہیں۔" نجمی اس طرح کہتی جیسے وہ بہت ہی تجربہ کار ہو۔ "سب ہی پر کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔"

"وہ تو ہے۔ مگر۔" اس کی ماں کچھ کہتے کہتے رک جاتی

"مگر کیا۔" نجمی پوچھتی

"اب تجھے کیا بتاؤں بیٹی۔"

"پھر بھی۔ کچھ تو کہو۔" نجمی منت کرتی۔

"اب تو ماشاءاللہ ہوشیار ہو گئی ہے۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔" وہ دھیمی آواز میں کہتی

"باتیں۔" نجمی قہقہہ لگاتی "کرتے ہیں تو کرنے دو۔ اگر لوگ باتیں نہ کریں گے تو ان میں اور جانوروں میں کیا فرق رہ جائے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس کی ماں کہتی۔ "مگر"

"مگر یہ کہ وہ باتیں کرتے رہیں اور ہم اپنا کام" نجمی جواب دیتی۔

بات تو واقعی ٹھیک تھی۔ نجمی جب گھر سے نکلتی نظروں کا ایک ہجوم اس کا تعاقب کرتا اور سامنے والے ایڈوکیٹ کا لڑکا جس نے اسی سال انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا تھا وہ تو اس پر دیوانہ ہوا جاتا تھا۔ اس نے تو دو بار اپنی والدہ کو نجمی کی امی کے پاس بھیجا بھی تھا، مگر نجمی کی امی نے کہہ دیا تھا کہ وہ تو ابھی بی۔ اے کر رہی ہے۔ پھر اس کے تایا کا لڑکا بھی تھا مگر نجمی کے والد کی موت پر ان لوگوں نے جس بے تعلقی کا ثبوت دیا تھا۔ اس سے نجمی کی امی اُن سے دل برداشتہ ہو گئی تھی اس کے علاوہ نجمی کے والد کے دوست ... کا مسعود بھی تھا مگر نجمی کی ماں نے ابھی اس سلسلہ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔

جب بھی نجمی پبلشنگ ... جاتی محسن کو ... پڑتی وہ داؤد خان کے پاس بیٹھا مہنگائی اور کثرتِ اخراجات کا رونا روتا رہتا نجمی اس کی باتیں سن سن کر دل ہی دل میں کڑھتی "بے چارہ" وہ کہتی۔ کیسی مصیبت کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ پولیٹکل سائنس میں وہ پڑھا کرتی تھی کہ ایک ایسا نظام بھی ہے جہاں نہ کوئی غریب ہوتا ہے نہ امیر۔ وہ سوچتی اگر یہی نظام یہاں رائج ہو جائے تو کیسا اچھا ہو۔ اس کو کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے افسانوں سے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ امیر ہمیشہ سنگدل اور بے وفا ہوتے ہیں۔ مگر وہ تو ایسی نہ تھی اسی لئے تو ایک روز جب اس نے محسوس کیا کہ محسن کئی روز سے ایک ہی زرد سی میلی سی قمیص پہن کر آ رہا ہے تو اس نے کیرلین کی ایک قمیص خرید کر چپکے سے داؤد خان کو دیدی تھی کہ وہ اسے اپنے نام سے محسن کو دیدے۔ اس لئے کہ وہ بقول سعدی نیکی کر دریا میں ڈال کی بھی قائل تھی۔

ادھر محسن جب کبھی نجمی کو دیکھتا اس کے خیالات میں طلاطم سا بپا ہو جاتا۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کے گھروں کی اینٹیں تک سونے کی ہیں لیکن وہ تو بڑے طاقتور اور صاحبِ اقتدار لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے چتون پر ایک بل آجائے تو دنیا زیر و زبر ہو جاتی ہے۔ اس کے اپنے مالک ہی کو دیکھ لو جب وہ ململ کا کرتہ پہنے۔ تہمد باندھے توند پر ہاتھ پھیرتا، موٹی موٹی آنکھوں سے گرد و پیش کی ہر چیز کو گھورتا ہوا دوکان پر آتا ہے تو سب کی روح فق ہو جاتی ہے۔ مگر یہ نازنین عجیب چیز ہے یہ بھی۔ وہ سوچتا۔ اکیلی سارا کاروبار چلاتی ہے وہ حیرت اور تحسین کے ملے جلے جذبات کے تحت سوچتا۔ جو شخص ...، وہ سوچتا۔ پھر اس کا ذہن شل ہو جاتا۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ سوچ سکتا۔ پھر اس کی بچی نرگس کی بھولی بھالی شکل اس کی نظروں کے سامنے آجاتی۔ لاحول ولاقوۃ۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ تو یہ کس وہم میں پڑ گیا۔ وہ کہتا۔

وہ شعوری طور پر ان خیالات سے نجات حاصل کرنا چاہتا مگر لاشعور میں وہ اس کا تعاقب کرتے رہتے۔ وہ سوچتا کہ جو شخص اس سے شادی کرے گا، کتنا خوش نصیب ہو گا۔ اگر بالفرض... وہ سوچتا مگر اس کی بیوی دھم سے اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی اور کہتی۔ خبردار جو اب خیال بھی دل میں لائے۔ وہ گھبرا جاتا۔

وقت گزرتا گیا۔ دن ہفتوں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہو گئے۔ نجمی کی دولت جنون بن کر محسن کے اعصاب پر سوار ہو گئی۔ اس کو اپنے بیوی بچوں سے محبت تھی مگر اس کی محبت کا تقاضہ تو یہی تھا کہ وہ ان کو اچھا کھلائے اچھا پہنائے۔ اور

جبھی ممکن تھا کہ نجمی کی دولت اس کے قبضہ میں آجائے

"مگر میری بیوی۔" وہ سوچتا

"اسے تو میں راضی کرلوں گا۔ وہ اپنے آپ سے کہتا۔ اسے کیا گھر آئی دولت بری لگے گی۔

باتوں باتوں میں اس نے ایک آدھ بار مذاقیہ انداز میں داؤد خان سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ مگر اس نے بھی مذاق ہی میں بات اُڑا دی تھی۔ مگر جس دن نجمی نے تشویش دی اس دن دونوں نے سنجیدگی سے اس مسئلہ پر تبادلۂ خیال کیا۔

داؤد خان کے مشورے پر ایک دن محسن نے نجمی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ہائے۔ اُس کی چیخ نکل گئی۔

"نجمی میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا نجمی۔ میں سچ کہتا ہوں نجمی۔" وہ نہایت صفائی سے کہتا چلا گیا۔

"ذلیل۔ کمینہ۔" نجمی چلائی

"نجمی۔ خدا کے واسطے نجمی۔" محسن نے اپنی گرفت مضبوط کردی۔ اور نجمی جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر چلی گئی۔

"شاباش۔ اس کے جانے کے بعد داؤد خان نے محسن کی پیٹھ ٹھونکی۔ بس دو ایک بار اور ہمت کرے تو سمجھ کر کام بن گیا۔"

"مگر وہ تو بری طرح بپھر گئی۔" محسن نے مایوسی سے کہا

"شروع میں سب ہی بپھرتی ہیں۔" داؤد خان کے لہجے میں اعتماد اور تجربہ کاری کی جھلک تھی۔

اس واقعہ کے بعد دو دن نجمی دوکان پر نہیں آئی۔ تیسرے دن جب وہ دوکان پر آئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا، اور آنکھیں سرخ تھیں جیسے وہ راتوں کو جاگ جاگ کر روتی رہی ہو۔ محسن نے ایک ماہرانہ نظر اس کے چہرے پر ڈالی پھر قریب جاکر کہا۔ "نجمی۔ مجھے افسوس ہے۔"

"خبردار جو آگے بڑھا۔" نجمی چلائی۔

"آپ ٹھیک فرماتی ہیں۔" وہ بولا۔ "غلطی میری ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ مجھے دو وقت پیٹ بھر کر روٹی بھی میسر نہیں آپ صاحبِ مال و زر ہیں۔ مجھے آپ سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ میں جذبات کی رو میں بہہ گیا نجمی۔ مجھے معاف کردو آئندہ کبھی ایسی گستاخی نہیں ہوگی۔"

"میں امیر ہوں۔ یہ غریب ہے۔ میں ظالم ہوں۔ یہ مظلوم ہے اسے مجھ سے بات کرنے کا کوئی حق نہیں۔ امیر غریب کو اتنا موقعہ ہی کب دیتے ہیں کہ وہ اپنے دل کی بات ان کے روبرو کرسکیں۔" نجمی کے دماغ میں خیالات گڈمڈ ہوگئے۔ اور غصہ وہ تو کب کا کافور ہوچکا تھا۔ تاہم اس نے بناوٹی غصے سے کہا۔ "اس میں امیر اور غریب کا کیا سوال۔"

"سوال تو ایک ہی ہے محترمہ۔" محسن مایوسی سے بولا "غریب کے جذبات کی قیمت یہی ہے کہ وہ امیر کی خوشنودی پر قربان کردیئے جائیں۔"

"محسن۔" نجمی چلائی

"نجمی۔" محسن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

دونوں دیر تک ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے رہے پھر نجمی اُٹھ کر چلی گئی۔

"مار لیا میدان۔" نجمی کے جانے کے بعد داؤد خان نے جو ملحقہ کمرے میں بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ محسن سے کہا۔

میدان تو مارا جاچکا تھا مگر محسن کی پہلی بیوی کا مسئلہ کٹھن تھا۔ آخر کار داؤد خان کے کہنے پر طے پایا کہ شادی خاموشی سے کی جائے تاکہ شادی کے ساتھ ہی بدمزگیوں کا سلسلہ بھی شروع نہ ہوجائے۔ نجمی کی ماں اس کے خلاف تھی مگر داؤد خان کے سامنے اس کی پیش نہ گئی۔

شادی ہوگئی، مگر نہ کسی کے سہرا بندھا نہ مہندی لگی۔ نہ سہیلیوں نے رخصتی گائی نہ نجمی آنسو پونچھتی ہوئی ڈولی میں بیٹھی۔ اس کے دل کے سب ارمان دل ہی میں رہ گئے۔

بدمزگیوں سے بچنے کی تدابیر کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا وہ روزانہ اجنبیوں کی طرح پبلشنگ ہاؤس پر ملتے۔ نجمی داؤد خان

باقی صفحہ ۴۷ پر

جان کولیئر
مترجم:۔ رفیع عظیم

واپسی

ایک بلونگڑے کی طرح خوفزدہ ایلین آسٹن پال اسٹریٹ کے مضافات کے مکانوں کے شکستہ اور تاریک زینوں پر ایک شخص کی تلاش میں کافی دیر سے مارا مارا پھر رہا تھا۔ آخرکار ایک دروازے کی تختی پر دھندلے حروف میں مطلوبہ نام دیکھ کر وہ کسی حد تک مطمئن ہوا۔

جیسا کہ اسے ہدایت کی گئی تھی وہ دروازہ کھول کر خود اندر داخل ہوا، کمرے میں ایک باورچی خانہ میں استعمال کی جانے والی عام سی میز، ایک پتھر کی کرسی اور ایک معمولی کرسی کے علاوہ کچھ نہیں تھا، کمرے کی دیواریں گندی اور ان کا رنگ اترا ہوا تھا، ایک دیوار پر شیلف میں تقریباً ایک درجن کے قریب بوتلیں اور کچھ مرتبان رکھے ہوئے تھے۔

ایک بوڑھا آدمی پتھر کی کرسی پر بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔

ایلین نے خاموشی سے اس کی جانب دیا ہوا کارڈ بڑھا دیا۔

"بیٹھ جائیے، ایلین آسٹن صاحب" بڈھا نہایت شائستگی سے گویا ہوا۔

"آپ کے کام آ کر تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔"

"کیا یہ واقعی سچ ہے، کہ آپ کے پاس کوئی ایسا محلول ہے جس کے اثرات قطعی غیر معمولی ہیں۔؟"

ایلین نے اپنی خوشی اور تجسس کو ضبط نہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"میرے محترم، میری اجناسِ تجارت کچھ زیادہ نہیں ہیں، اور آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں مسہل کی ادویات یا دانتوں کی دوائیاں نہیں بیچتا ہوں!۔

مگر میرے پاس جو کچھ ہے، وہ اپنی نوعیت میں نادر ہے، اور میں جو کچھ بیچتا ہوں اس کے اثرات بھی معمولی قسم کے نہیں رہے۔"

"خیر مقصد یہ تھا" ایلین گھبرا کر بول اٹھا۔

"یہاں دیکھو، مثال کے طور پر"۔ بڈھے نے سنی ان سنی کرکے شیلف کے قریب پہونچ کر ایک بوتل نکالتے ہوئے کہا۔

"یہ ایک محلول ہے۔ پانی کی طرح بے رنگ، اس کا کوئی ذائقہ نہیں کافی، دودھ، شراب اور غرض کہ کسی بھی مشروب میں بغیر کسی تمیز کے حل ہو جاتا ہے۔

زہر خورانی دریافت کرنے والا کوئی بھی طریقہ اسے دریافت نہیں کر سکتا، حتی کہ پوسٹ مارٹم بھی"

"کیا مطلب .... یہ زہر ہے ....؟" ایلین دہشت زدہ آواز میں چلایا۔

"تم اگر چاہو تو اسے دستانے صاف کرنے والا محلول بھی کہہ سکتے ہو"

بوڑھے نے نہایت پرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"ممکن ہے یہ دستانے بھی صاف کرتا ہو، میں نے کبھی تجربہ نہیں کیا اور کوئی اسے "حیات صفا" بھی کہہ لے تو مضائقہ نہیں۔ ویسے بھی زندگی بھر زندگی کی صفائی کچھ لمحات میں اشد ضروری سمجھی جاتی ہے۔"

"مجھے اس قسم کی کسی چیز کی ضرورت نہیں" ایلین نے احتجاجاً کہا۔

"بہرحال یہ اپنی جگہ خوب ہے" بوڑھا مسکراتے ہوئے بڑبڑایا۔

"جانتے ہو اس کی کیا قیمت ہے، ایک چائے کے چمچ کی جو کافی

ہوتا ہے میں نقدہ ہزار ڈالر لیا کرتا ہوں۔ اس سے کم قطعی نہیں حتیٰ کہ ایک پینی تک کم نہیں۔"

"میرا خیال ہے، دیگر سارے محلول تو اتنے قیمتی نہیں ہوں گے؟" ایلین نے اختصار سے کام لیتے ہوئے پوچھا۔

"او نہیں پیارے ۔۔۔۔" بڈھا بے تکلفی سے مسکرایا۔ "بھئی محبت کے محلول کے لئے اتنی زیادہ قیمت لگانا قطعی بری بات ہے۔ مثال کے طور پر، نوجوان جو عموماً محبت کے محلول کے متلاشی ہوتے ہیں۔ پانچ ہزار ڈالر والے نہیں ہوتے۔ اگر ان کے پاس پانچ ہزار ڈالر ہوں تو انہیں بھلا کب ایسے محبت کے محلول کی ضرورت ہوتی ہے" "یہ تو واقعی بڑی اچھی بات ہے۔" ایلین خوشی سے مسکرایا۔

"ہاں میرا زاویہ نگاہ کچھ ایسا ہی ہے اور یوں بھی ایک شے کے سودے میں اگر دکاندار، گاہک پر مہربان ہو جائے تو گاہک دوسرے سودے کے لئے اسی کے پاس پہونچتا ہے چاہے وہ دوسری شے کتنی ہی مہنگی کیوں نہ دے وہ اس کے لئے پس انداز تک کر لیتا ہے۔ اور یہ ہونا ضروری ہے۔"

"اچھا ۔۔۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم محبت کا محلول بھی بیچتے ہو۔؟" ایلین آسٹن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ارے بھئی اگر محبت کا محلول نہ بیچتا تو پھر اس دوسرے محلول کا ذکر تم سے بھلا کیوں کرتا؟" دوسری شیشی کے قریب پہونچتے ہوئے بڈھے نے ایلین پر اپنے خیال کی وضاحت کی۔

"اور یہ چیزیں تو اعتماد کی ہیں کوئی انہیں تبھی بتاتا ہے جبکہ مقابل کی ذات پر پورا اعتماد ہو۔"

"اور یہ دوسرے محلول غالباً یونہی سے ہوں گے؟" ایلین نے تجسس سے پوچھا۔

"نہیں بھئی ان کے اثرات بھی دائمی ہوتے ہیں اور ناگہانی عارضوں کے اثرات سے ان کا عمل نہایت بلند چیز ہے مگر ان کے استعمال سے جو ویسی ہی کیفیت ہو جاتی ہے، ان کا اثر فوری، تکلیف شدید رد عمل دائمی ہوتا ہے۔"

"اف کتنی پیاری اور دلچسپ ہیں یہ دوائیں۔" ایلین نے سائنسی دلچسپی کے ساتھ رشک بھری نگاہوں سے شیشیوں کو گھورا۔

"اپنے روحانی جذبے کا تو خیال رکھو۔" بوڑھا طنز کرتے ہوئے مسکرایا ــــــ "وہ تو ہے ہی۔" ایلین نے کچھ نادم ہوتے ہوئے کہا۔

"ظاہری فرق کے لئے یوں کہہ لو کہ یہ ایثار، تحقیر اور رشک کا نعم البدل ہے۔ اس کی مہک نارنگی کے رس میں، سوپ، یا کاک ٹیل میں حل ہو جاتی ہے۔ اگر اس کی قلیل مقدار تم کسی جوان عورت کو دو گے، تو چاہے وہ کتنی بے باک اور پرغرور کیوں نہ ہو وہ اس کے استعمال سے یکسر بدل جائے گی وہ صرف یہ چاہے گی کہ تم اور تنہا تم ہمیشہ اس کے ساتھ رہیں۔"

"مجھے تو قطعی یقین نہیں آتا، وہ محفلوں کی بڑی دلدادہ ہے۔" ایلین خوشی سے گھگھیاتے ہوئے چلایا۔

"وہ انہیں پھر قطعی پسند نہیں کرے گی، تم جن خوبصورت لڑکیوں سے ملو گے وہ ان سے بھی خوف کھائے گی۔"

"کیا وہ حقیقی معنوں میں رشک کرے گی؟" ایلین خوشی سے بے قابو ہوتے ہوئے چلایا۔ "اور وہ بھی مجھ پر؟"

"ہاں وہ چاہے گی کہ تمہارے لئے وہ خود ہی سب کچھ ہو کر رہ جائے۔"

"ایسا تو ہے ہی۔ لیکن ذرا وہ پروا کچھ کم کرتی ہے۔"

"اس کے استعمال کے بعد وہ مجبور ہو گی، تم ہی اس کی زندگی کا واحد مقصد ہو گے۔ وہ اپنی توجہ ہر لمحہ صرف تم پر صرف کرے گی۔"

"حیرت انگیز ــــ!" ایلین چلایا۔

"تم جو کچھ کرتے ہو، وہ جاننا چاہے گی، تم پر دن بھر میں جو کچھ گذری اس کے سننے کا اسے اشتیاق ہو گا، وہ ایک ایک لفظ سننا چاہے گی وہ یہ بھی جاننا چاہے گی کہ تم کن کن چیزوں کے متعلق سوچتے رہتے ہو اور سوچ رہے ہو، یا کیوں اچانک مسکرا اٹھے ہو اور یا کیوں اچانک خوفزدہ ہو گئے ہو۔"

"یہ تو عشق ہے ــ!" ایلین نے خوشی سے پاگل ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں ــ!" بڈھے نے اطمینان سے جواب دیا۔

"آہ کتنی ہوشیاری سے وہ تمہاری دیکھ بھال کرے گی اب وہ کبھی تمہیں کھٹکن سے جدا نہیں ہونے دے گی اور نہ ہی تمہیں تنہا و ملول

رہنے دے گی کہ تم کھانے کی جانب سے اپنی طبیعت کا اچاٹ پن ظاہر کر سکو اگر تم ایک گھنٹہ بھی دیر سے پہنچو گے تو وہ انتہائی خوف زدہ ہو چکی ہوگی اسے سارے وقت اسی خیال نے خوفزدہ کیا ہوگا کہ کہیں تم مر تو نہیں گئے یا کسی حادثہ کا شکار تو نہیں ہو گئے "

"میں ... میں .... ڈاپانا کے متعلق، میں یہ سب کچھ تصور نہیں کر سکتا" ایلین خوشی سے بے قابو ہو کر بکلا اٹھا۔

"تمہیں اپنے تخیل کو کام میں لانے کی ضرورت نہیں" بوڑھے کا لہجہ پرسکون تھا" اور ہاں، جیسا کہ وہ ہر لمحہ تم پر فریفتہ رہے گی، اگر کسی وجہ سے، اور ایسا یقیناً ہوگا، تم کسی اور پر پھسلے، تب بھی تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہ ہوگی۔ وہ تمہیں معاف کر دے گی، ایسا ہوگا تو یقیناً اسے اس بات سے غیر معمولی اور شدید رنج پہونچے گا لیکن وہ پھر بھی آخر کار تمہیں معاف کر دے گی "

"ایسا کبھی نہیں ہوگا" ایلین غصے سے بڑبڑایا۔

"بیشک ہوگا نہیں" بوڑھے نے فوراً ہاں میں ہاں ملا کر لقمہ دیتے ہوئے کہا" لیکن بفرضِ محال ایسا ہو بھی گیا تو تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں وہ تم سے کبھی بھی طلاق نہیں لے گی، اور صرف یہی نہیں بلکہ تمہاری اپنی غلطیوں پر تمہیں پشیمان ہو کر بے چین تک نہ ہونے دے گی "

"تو پھر کتنے کا ہوگا۔ یہ حیرت انگیز محلول" ایلین نے حریصانہ لہجے میں کہا۔

"یہ اتنا قیمتی نہیں ہے" بوڑھا معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

"جتنا کہ وہ " دیتا نے صفا " محلول " یا " حیات صفا " کہہ لو جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے۔

نہیں !۔ وہ پانچ ہزار ڈالر کا ہوگا، ایک پینی بھی کم نہیں لونگا اور سنو اس کے استعمال کے لئے تم سے زیادہ بڑی عمر کے آدمی کی ضرورت ہے جس نے اس کے لئے رقم جمع کرنے کی خاطر عمر کا کافی حصہ صرف کیا ہو "

" مگر محبت کا محلول ۔۔؟ " ایلین، بیچ ہی میں بول پڑا۔

" اوہ ۔۔ وہ " میز کی دراز کھول کر ایک چھوٹی گندی سی شیشی نکالتے ہوئے بوڑھا بڑبڑایا۔

"یہ تو صرف ایک ڈالر کا ہے "

"میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں تمہارا کتنا ممنون ہوں" ایلین بوڑھے کو شیشی بھرتے ہوئے دیکھ کر اپنی خوشی ضبط نہ کر سکا۔

"میں بھی اپنے تئیں مشکور ہونا ہی پسند کروں گا۔ کیونکہ گاہک اپنی زندگی کے اگلے حصے میں پھر واپس آتے ہیں۔ جبکہ اپنے آپ کو کچھ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں اور پھر وہ زیادہ قیمتی شے طلب کرتے ہیں "

"خیر یہ لو ۔۔۔ تمہارے لئے یہ رہا، تم اسے بہت قوی اثر پاؤ گے "

"دوبارہ شکریہ ۔ الوداع "

"الوداع "

بقیہ۔ رقص تن

والا گیت بلند ہو گیا۔

کتنے قدیم ہیں یہ پیچ و خم؟! یہ پتھریلے سلسلہ ہائے دراز؟؟ اس مقام کی عظمت اور ہیبت ان ہی پیچ و خم سے ہے ان پتھریلے سلسلوں سے ہے۔ تاریخ کو ان ہی کی وجہ سے ایک خاص موڑ ملا ہے ایک نئی زندگی ملی ہے۔ ایک پرشکوہ روح عطا ہوئی ہے ۔ فاتحانہ سی ہنسی اس کی آنکھوں سے برس برس پڑی۔ وہ یوسف۔ وہ نخشب ۔ وہ سلم ۔ وغیرہ وغیرہ ؟؟ یہ اس کی زندگی کے پیچ و خم ۔ یہ پتھریلی رکاوٹیں ان ہی کی وجہ سے تو اس کی ذات کو بلندی ملی ہے ۔!!

وہ بلندیوں کی طرف لپکے گی ۔!!

وہ انتظار کرے گی اس بلند انسان کا ۔ زمین و آسمان کی تمام حفاظت کے پیکر کا ۔ جو نامعلوم دنیا سے ان اونچے اونچے پہاڑوں کو عبور کر کے آئے گا ۔ ان پر پیچ راستوں سے گزر کر آئیگا ۔ وہ اس کا انتظار کرے گی ۔ ہاں انتظار !! انتظار!! انتظار !!

یوفان چن
ترجمہ۔ علی احمد

خدا کا پیغام

34-678

جولائی میں افریشیائی دانشوروں کا ایک وفد چند روز کے لئے ہمارے مہمان کی حیثیت سے پاکستان آیا تھا۔ افریقہ اور ایشیا قدیم تمدن و ثقافت کے عظیم مرکز ہیں۔ یورپ کی عینیت پسندی کے برعکس ان خطوں میں خالص ارضی اور حقیقت سے گہرے رشتے رکھنے والی تہذیب پروان چڑھی۔ زیر نظر کہانی تبت کی برفانی فضاؤں کے سادہ لوح عوام کی آرزوؤں اور امنگوں کی آئینہ دار ہے۔ اس میں مینڈک کا کردار مٹی اور پانی کی عظیم قوت کی علامت ہے یہ قوت زندگی کی نشوونما میں جزو اعظم کی حیثیت رکھتی ہے جب سماجی نظام کی جکڑ بندیاں ان قوتوں کو کمزور کر دیں، جب تہذیب کے دھارے اس قوت کی نفی کرنے لگیں تو معاشرہ ایک مصنوعی اور غیر فطری زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اور شہزادی جو کہ عوام کی معصوم آرزوؤں کی علامت ہے بال بکھیرے رونے لگتی ہے۔ غلط سماجی تقاضے شہزادی کے گھوڑے کی لگام تھام کر خدا یا فطرت کے پیغام اور لوگوں کے درمیان دیواریں بن جاتے ہیں۔ یوفان چن نے اپنے مخصوص انداز میں اس لوک کہانی کو انتہائی دلچسپ پیرائے میں اس کے تہہ در تہہ مفاہیم کے ساتھ تحریر کیا ہے ذیل میں کہانی کا ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

بہت دنوں کی بات ہے کہ ایک غریب بوڑھے بڑھیا کے کوئی اولاد نہ تھی۔ انہیں بڑی خواہش تھی کہ کوئی بچہ پیدا ہو اور بڑا ہو کر پہاڑ کے دامن میں پھیلی ہوئی وسیع اور زرخیز زمین کو جوتے اس میں غلہ بوئے اور پھل اگائے تاکہ وہ بڑھاپے میں آرام کے دن گذار سکیں انھوں نے خدا سے دعائیں مانگیں اور خوب عبادت کی۔ خدا نے ان کی سن لی۔ سات مہینے بعد بڑھیا کے اولاد ہوئی۔ لیکن قدرت کے کھیل بھی عجیب ہیں۔ لڑکا یا لڑکی ہونے کے بجائے ان کے ہاں ایک بدصورت بڑی بڑی آنکھوں والا مینڈک پیدا ہوا۔

بوڑھے کو بڑا افسوس ہوا۔ اس نے بڑھیا سے کہا "یہ انسان کا بچہ تو ہے نہیں۔ پھر اسے رکھنے سے فائدہ؟ لاؤ باہر پھینک آؤں"۔

بڑھیا آخر ماں تھی۔ اس نے جواب دیا۔

"شاید خدا کی مرضی یہی تھی کہ انسان کے بجائے مینڈک ہو۔ اب یہ ہماری اولاد ہے۔ اسے باہر نہ پھینکو۔ مکان کے پچھواڑے تالاب ہے وہاں چھوڑ آؤ۔ آرام سے رہے گا"۔

بوڑھا مینڈک کو اٹھا کر چلنے ہی لگا تھا کہ اس کے کانوں میں مینڈک کی آواز آئی۔

"اچھے باپ مجھے تالاب میں نہ چھوڑو۔ میں اس گھر میں پیدا ہوا ہوں مجھے یہیں رہنے دو تم دیکھنا کہ میں بڑا ہو کر اس ملک کی حالت بدل دوں گا۔"

بوڑھے نے مینڈک کو انسان کی طرح بولتے سنا تو اسے بڑی حیرت ہوئی۔ ماں کا دل بھی پسیجا اس نے شوہر سے کہا۔

"اس کا کہنا صحیح ہے ہم کتنے دنوں سے تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلتے چلے آرہے ہیں شاید ہمارے دن پھر جائیں۔"

انہوں نے مینڈک کو نہ باہر پھینکا اور نہ تالاب میں چھوڑا۔ بلکہ وہ ان کے ساتھ گھر میں اس طرح رہنے لگا جیسے وہ ان کا بیٹا ہو۔

تین سال گزر گئے۔

ایک دن مینڈک بڑھیا سے بولا۔

"ماں مجھے جو کی دو روٹیاں پکا دو میں کل صبح چنگ پون جاؤں گا۔ وہاں کے سردار کی تین خوبصورت بیٹیاں ہیں۔ ان میں جو سب سے زیادہ رحمدل اور نیک ہوگی میں اس سے شادی کروں گا اور اسے یہاں لاؤں گا تاکہ وہ تمہاری خدمت کرے اور گھر کے کام کاج میں تمہارا ہاتھ بٹائے۔"

ممتا کی ماری بوڑھی ماں آبدیدہ ہو کر بولی۔

"کیوں مذاق کرتے ہو بیٹا۔ بھلا اپنی بیٹی کوئی مینڈک کو دیتا ہے؟"

لیکن مینڈک پورے اعتماد سے بولا۔

"ماں تم فکر نہ کرو۔ میں اسے راضی کر لوں گا بس تم میرے لئے دو روٹیاں پکا دو۔"

بوڑھی ماں نے دوسرے دن صبح سویرے جو کی دو روٹیاں پکا دیں اور انہیں تھیلی میں بند کر کے بیٹے کے حوالے کر دیا مینڈک نے تھیلی کندھے پر رکھی اور پھدکتا ہوا چنگ پون کے قلعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

تھوڑی دیر میں وہ قلعہ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ مینڈک نے آواز دی۔

"چنگ پون! چنگ پون! دروازہ کھولو۔"

قلعہ کے دربان نے اوپر سے جھانک کر دیکھا اور الٹے پاؤں سردار کے پاس بھاگا اور خبر دی کہ باہر ایک مینڈک کھڑا دروازہ کھولنے کے لئے کہہ رہا ہے۔

سردار نے اپنے مشیر خاص کو بھیجا۔ مشیر خاص نے بھی مینڈک کے آنے کی خبر سنائی۔ اور ساتھ ہی اپنی رائے دی کہ "یہ تو کوئی جن یا بھوت معلوم ہوتا ہے جو مینڈک کے بھیس میں یہاں آیا ہے۔ کیوں نہ ہم اس کے اوپر بہت سی مٹی اور راکھ ڈال دیں۔ خود بخود بھاگ جائیگا"

سردار کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ اس نے حکم دیا۔

"مینڈک پانی کا جانور ہے۔ ضرور اسے سمندر کے بادشاہ نے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ لہٰذا اس کا شاندار خیر مقدم کیا جائے۔ میں خود اسے لینے دروازہ پر جاؤں گا۔"

سپاہیوں اور ملازموں نے اپنے سردار کے حکم کی فوراً تعمیل کی۔ سردار خود دروازے پر گیا اور مینڈک سے پوچھا۔

"کیوں میاں مینڈک۔ کیسے آنا ہوا!۔

کیا سمندر کے بادشاہ کے پاس سے آئے ہو!۔ اس کا کوئی پیغام لائے ہو۔؟"

مینڈک نے جواب دیا۔ "نہ میں سمندر کے بادشاہ کا کوئی پیغام لایا ہوں اور نہ اس نے مجھے بھیجا ہے۔ میں تو خود اپنی مرضی سے آیا ہوں۔ چونکہ تمہاری تینوں بیٹیاں شادی کے قابل ہو گئی ہیں اس لئے میری خواہش ہے کہ ان میں سے کسی ایک کی شادی میرے ساتھ کر دو۔"

سردار اور اس کے سپاہیوں کو مینڈک کی اس دیدہ دلیری پر بڑا غصہ آیا۔ اس نے مینڈک سے کہا "یہ منہ اور مسور کی دال! تیری یہ ہمت کہ ایک حقیر اور غلیظ مینڈک ہو کر میری بیٹی سے شادی کرنے کی خواہش کرے جبکہ میں نے بڑے بڑے جنگی سرداروں کے پیغامات کو ٹھکرا دیا ہے۔"

مینڈک چلا کر بولا۔ "اچھا تو تمہیں یہ رشتہ منظور نہیں۔ اگر ایسی بات ہے تو میں ہنسنا شروع کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر مینڈک نے ہنسنا شروع کر دیا۔ اس کی ہنسی کی آواز ہزاروں لاکھوں مینڈکوں کی آواز سے کہیں زیادہ ڈراؤنی اور بلند تھی۔ اس سے آس پاس کی زمین دہل گئی۔ قلعہ کی بنیادیں ہلنے لگیں جگہ جگہ

سے فصیل پھٹ گئی۔ گرد و غبار کا ایک بہت بڑا طوفان اٹھا اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھاگیا۔ چنگ پون کی رعایا میں بھگدڑ مچ گئی ہر شخص اپنی جان بچانے کے لئے بے تحاشہ ادھر اُدھر دوڑنے لگا۔

سردار یہ دیکھ بڑا گھبرایا۔ وہ دوڑتا ہوا دروازے پر آیا اور مینڈک سے بولا۔ "مینڈک میاں! خدا کے لئے ہنسنا بند کر دو۔ میں اپنی سب سے بڑی بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کرنے کو تیار ہوں"۔

مینڈک نے ہنسنا بند کر دیا اور فوراً ہی طوفان اور زلزلہ بھی ختم ہو گئے۔

سردار نے چاروناچار اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ دو گھوڑے تیار کئے جائیں ایک دلہن کے لئے اور دوسرا جہیز کے لئے سب سے بڑی بیٹی کو یہ شادی قطعی منظور نہیں تھی اس نے چپکے سے اپنے گھوڑے کی کاٹھی میں چکی کے دو پاٹ رکھ لئے تاکہ موقع پاتے ہی راستے میں مینڈک کا کام تمام کر دے اور واپس قلعہ آجائے۔

مینڈک میاں دلہن اور جہیز سمیت خوشی خوشی اپنے ماں باپ کے شہر روانہ ہو گئے۔ آگے آگے اچھلتے کودتے وہ پیچھے پیچھے گھوڑے پر سوار ان کی نئی دلہن۔ راستہ میں کئی بار دلہن نے کوشش کی کہ گھوڑا سرپٹ دوڑا کر مینڈک کو ٹاپوں تلے کچل دے۔ لیکن میاں مینڈک کہاں ہاتھ آنے والے وہ ہمیشہ گھوڑے سے چار قدم آگے ہی رہتے آخر ایک بار ہمت کر کے دلہن نے گھوڑا قریب لا کر چکی کے دونوں پاٹوں کو مینڈک کی طرف پھینکا اور خود مڑ کر واپس قلعہ کی طرف گھوڑا دوڑا دیا ابھی وہ تھوڑی ہی دور گئی ہوگی کہ پیچھے سے آواز آئی "اے بی۔ ذرا بات تو سنو شہزادی"۔

دلہن نے گھوم کر دیکھا۔ میاں مینڈک زندہ اور صحیح سلامت اچھلتے کودتے چلے آرہے تھے۔ اگرچہ شہزادی نے دونوں پاٹوں کا نشانہ تاک کر پھینکا تھا لیکن مینڈک بھی بڑا ہوشیار تھا۔ پاٹوں کے سوراخ میں سے صاف بچ کر نکل گیا۔

شہزادی نے گھوڑا روک لیا۔ مینڈک نے لپک کر لگام تھام لی۔ اور قلعہ کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ "بی شہزادی، دراصل ہماری قسمت کے ستارے آپس میں نہیں ملتے اس لئے بہتری اسی میں ہے کہ میں تمہیں تمہارے باپ کے پاس چھوڑ آؤں"۔

جب دونوں قلعہ کے دروازہ پر پہنچے تو مینڈک نے پھر آواز لگائی، "چنگ پون! چنگ پون! یہ لو تمہاری بیٹی کو واپس لے آیا ہوں، یہ شادی ہمیں راس نہیں آئی۔ کیونکہ ہمارے ستارے نہیں ملتے۔ اب تم دوسری بیٹی کی شادی مجھ سے کر دو۔ ممکن ہے اس کے نصیب کا ستارہ میرے ستارے سے ملتا ہو"۔

سردار کو مینڈک کی اس بات پر اور بھی غصہ آیا۔ وہ چیخ کر بولا۔ "اے مینڈک! تو اپنی اوقات کیوں بھولتا ہے! کیا تو نے مجھے اتنا ذلیل سمجھا ہے جا یہاں سے دفع ہو"۔

مینڈک کو بھی غصہ آگیا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ "تم یوں نہیں مانوگے۔ اچھا تو اب میں رونا شروع کرتا ہوں"۔

یہ کہکر اس نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر سیاہ بادل چھاگئے، بجلی چمکنے لگی اور زبردست سیلاب آگیا۔ پل بھر میں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آنے لگا۔

قلعہ کی رعایا پانی کو تیزی سے چڑھتا دیکھکر اپنی جان بچانے کے لئے مکانوں کی چھتوں اور قلعہ کی فصیل پر چڑھنے لگی۔ عورتوں اور بچوں نے رونا شروع کر دیا۔ سردار نے جب یہ حال دیکھا تو گھبرا کر فصیل پر آیا۔ اور مینڈک سے بولا۔ "میاں مینڈک! خدا کے لئے رونا بند کر دو۔ میں اپنی دوسری بیٹی کی شادی تمہارے ساتھ کرنے کو تیار ہوں"۔

مینڈک نے رونا بند کر دیا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ سیلاب بھی ختم ہو گیا بادل چھٹ گئے اور رعایا کی جان میں جان آئی۔

پہلے کی طرح پھر دو گھوڑے تیار کئے گئے اور میاں مینڈک اپنی نئی دلہن اور جہیز لیکر گھر روانہ ہو گئے۔ اتفاق دیکھئے کہ دوسری شہزادی کو بھی یہ شادی نامنظور تھی۔ اس نے بھی اپنی بڑی بہن کی طرح چکی کے پاٹوں سے مینڈک کو مارنے کی کوشش کی۔ میاں مینڈک بھلا کب مرنے والے تھے۔ وہ دوسری دلہن کو بھی واپس قلعہ پر لے آئے۔ اور دروازے پر پہنچ کر آواز دی۔ اس بار انہوں نے سردار سے کہا کہ وہ اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کی شادی ان کے ساتھ کر دے۔

سردار کے غصہ کی انتہا نہ رہی اس نے چیخ کر کہا۔ "دور رہو جا میری نظروں سے!"

لیکن مینڈک نہایت اطمینان سے بولا۔

سردار! زیادہ غصہ نہ دکھا۔ میں نے تیری دونوں بیٹیوں کو اس لئے واپس کر دیا کہ ان میں کوئی بھی مجھ سے شادی کرنے کو تیار نہ تھی۔ لیکن تیری سب سے چھوٹی بیٹی شادی کے لئے رضامند ہے۔ پھر تجھے کیا اعتراض ہے۔؟

سردار نے پوری قوت سے چیخ کر کہا۔ میری کوئی بھی لڑکی تجھ جیسے ذلیل مینڈک سے شادی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بہتری اسی میں ہے کہ تو شرافت کے ساتھ یہاں سے چلا جا۔

مینڈک پر سردار کے غصہ اور چیخنے چلانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔ "اچھا تو اے سردار ہوشیار ہو جا اب میں اچھلنا شروع کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر مینڈک نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا ایک لمحہ میں چاروں طرف زبردست اندھیرا چھا گیا۔ قلعہ کی دیواریں ہلنے لگیں اور طوفان اٹھنے لگا۔

آخر کار سردار اپنی تیسری بیٹی کی شادی مینڈک سے کرنے کے لئے تیار ہو گیا۔ مینڈک نے اچھلنا کودنا بند کر دیا اور فوراً طوفان بھی ختم گیا۔

تیسری شہزادی اپنی دونوں بڑی بہنوں سے مختلف تھی۔ وہ بڑی نیک اور رحمدل تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ مینڈک ضرور کوئی غیر معمولی مخلوق ہے۔ لہٰذا اسنے خوشی سے شادی منظور کرلی۔ اور ایک گھوڑے پر جہیز لاد اور دوسرے پر خود سوار ہو اپنے شوہر کے ساتھ سسرال روانہ ہوگئی۔

مینڈک کی ماں نے دیکھا کہ اس کا بیٹا چاندسی دلہن لایا ہے تو وہ خوشی سے پھولی نہ سمائی۔ شہزادی بھی بڑی محنتی اور لائق بہو ثابت ہوئی۔ اور بہت جلد گھر کے کام کاج میں بوڑھی ساس کا ہاتھ بٹانے لگی۔

ایک سال گزر گیا جب موسم خزاں آیا تو سارے علاقہ کے لوگ میلہ کی تیاری کرنے لگے۔ یہ میلہ ہر سال اسی موسم میں ایک خاص مقام پر بڑے سے میدان میں ہوا کرتا تھا۔ اس میں سات دن تک مرد عورتیں بچے بوڑھے طرح طرح کے کھیل کھیلتے ناچ رنگ کی منڈلیاں جماتے اور خرید و فروخت کرتے۔ اس میں سب سے اہم اور قابل دید گھڑ دوڑ کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ آخری دن گھڑ دوڑ کا فیصلہ کن دن سمجھا جاتا تھا۔ جو نوجوان مقابلہ میں اوّل آتا اسے حسین و جمیل رقاصائیں اپنے خیموں میں مدعو کرتیں۔ اسے اپنے ہاتھوں سے شراب پلاتیں اور اس کے سامنے فن کا مظاہرہ کرتیں۔ یہ رواج سالہا سال سے چلا آرہا تھا۔ اس سال بھی جب میلہ کا دن آیا تو ماں نے مینڈک سے کہا۔ "بیٹا تم بھی ہمارے ساتھ میلہ دیکھنے چلو۔"

لیکن مینڈک نے انکار کر دیا۔ وہ گھر پر رہ گیا باقی سب لوگ میلہ دیکھنے چلے گئے۔

جب گھڑ دوڑ کا دن آیا تو ایک سے ایک بانکا سجیلا جوان اپنا گھوڑا لیکر میدان میں آیا۔ سب لوگ دوڑ شروع ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ اتنے میں لوگوں نے دیکھا کہ ایک نہایت حسین و جمیل گھڑسوار میدان میں آیا وہ قیمتی سبز لباس پہنے ہوئے تھا۔ گھوڑے کی زین پر بھی سونے چاندی کا کام تھا۔ جیسا سوار تھا ویسا ہی پھرتیلا اس کا گھوڑا تھا۔ جب دوڑ شروع ہوئی تو نوجوان نے بڑے اطمینان سے اپنے گھوڑے کو چمکارا اتنے میں باقی گھوڑے آگے نکل چکے تھے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ یہ نوجوان دوڑ میں شامل تک نہیں ہو پائے گا جیتنے کی بات تو دور ہے لیکن جیسے ہی اس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اس کا گھوڑا تمام گھوڑوں سے آگے نکل چکا تھا۔ باقی سواروں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن اس نوجوان کے گھوڑے سے آگے نہ نکل سکے۔ اس بہادر نوجوان نے گھوڑا دوڑاتے ہوئے کئی کمال بھی دکھائے اس نے تیر کمان سے ہوا میں اڑتی ہوئی چیلوں پر نشانہ لگایا۔ تین چیلیں زمین پر آرہیں پھر وہ ایک پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب لٹک گیا۔ غرضیکہ اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے بڑے حیرت انگیز کرتب دکھائے۔ تماشائی سوچنے لگے کہ آخر یہ سوار کون ہے؟ اور کہاں سے آیا ہے؟

گھڑ دوڑ ختم ہوئی، نتیجہ کا اعلان ہوا۔

سبز پوش سوار دوڑ میں اوّل آیا تھا۔

تمام حسین دوشیزائیں اس نوجوان کے گرد جمع ہوگئیں اور خوشی سے ناچنے لگیں ان میں سے ہر دوشیزہ نے اسے اپنے خیمہ میں مدعو کیا لیکن جونہی سورج غروب ہونے لگا وہ نوجوان لپک کر اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور بغیر کسی سے کچھ کہے سنے تیزی سے اسی طرف روانہ ہو گیا جدھر سے آیا تھا۔

مینڈک کی بیوی بڑی حیران تھی کہ آخر یہ نوجوان کون ہے اور اسی طرف کیوں چلا گیا جدھر اس کے شوہر کا گھر ہے جب وہ گھر پہنچی

اسے یہ سُن کر اور بھی حیرت ہوئی کہ مینڈک کو گھڑ دوڑ کے متعلق پورے واقعات تفصیل سے معلوم تھے۔

دوسرے سال موسم خزاں آیا تو لوگ پھر میلے کی تیاری کرنے لگے۔ حسبِ معمول آخری دن گھڑ دوڑ کا تھا اس دن جب سارے سوار اپنے اپنے گھوڑے لیکر میدان میں آئے تو وہ سبز پوش سوار بھی موجود تھا۔ اس بار وہ پہلے سے بھی زیادہ زرق برق لباس پہنے ہوئے تھا۔ اُدھر سب گھڑ سوار دوڑ شروع ہونے کے اشارے کا انتظار کر رہے تھے۔ اور اِدھر یہ نوجوان گھوڑے سے اتر کر مزے سے چائے پی رہا تھا۔ آخر کار دوڑ شروع ہوئی۔ سب سواروں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو تیزی سے دوڑانا شروع کیا لیکن وہ نوجوان اطمینان سے بیٹھا چائے پیتا رہا۔ آخر اس نے چائے کا آخری گھونٹ لیا اتنی دیر میں تمام سوار کافی دور نکل گئے تھے۔ سبز پوش نوجوان پھرتی سے اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور خاص انداز سے ایڑ لگائی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا گھوڑا سب سے آگے پہنچ چکا تھا لوگ حیران تھے کہ یہ انسان ہے یا جن!۔

اس بار بھی اس نوجوان نے عجیب وغریب کمالات دکھائے تین چیلوں کو نشانہ بنایا اور کنارے لگے ہوئے پھول توڑ کر تماشائیوں پر پھینکے۔

اس سال بھی میدان اسی نوجوان کے ہاتھ رہا۔

جب سورج غروب ہونے کا وقت قریب آیا تو یہ سبز پوش نوجوان ، اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جدھر سے آیا تھا اسی طرف روانہ ہو گیا۔ اس مرتبہ بھی لوگ یہ معلوم نہ کر سکے کہ آخر یہ نوجوان کون تھا اور کہاں سے آیا تھا!

مینڈک کے بوڑھے ماں باپ اور بیوی گھر پہنچے اور گھڑ دوڑ کی پوری تفصیل مینڈک کی زبانی سنی تو بڑے حیران ہوئے۔ خاص طور سے شہزادی کو بڑا تعجب ہوا کہ اس کے شوہر کو تمام واقعات کیسے معلوم ہوتے ہیں وہ سوچنے لگی کہ آخر وہ نوجوان سورج غروب ہونے سے پہلے ہی کیوں روانہ ہو جاتا ہے! وہ اسی طرف کیوں جاتا ہے جدھر اس کے شوہر کا گھر ہے!۔ بڑی دیر تک سوچ بچار کرنے کے بعد اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اب اس کے لئے وہ اگلے سال کا انتظار کرنے لگی۔ اگلا سال بھی آ گیا۔ حسبِ معمول بوڑھے بڑھیا، بہو کو لیکر میلہ دیکھنے گئے اور مینڈک گھر پر رہ گیا۔

جب گھڑ دوڑ کا دن آیا اور دوڑ شروع ہونے میں تھوڑی دیر رہ گئی تو شہزادی اپنی بوڑھی ساس سے بولی "امی جان۔ آج میرے سر میں بڑا درد ہو رہا ہے آپ لوگ دوڑ دیکھیں میں گھر جا کر آرام کروں گی"

بوڑھی ساس نے فوراً اجازت دے دی۔ شہزادی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر تیزی سے گھر روانہ ہو گئی اور سورج غروب ہونے سے پہلے گھر پہنچ گئی جاتے ہی سب سے پہلے اس نے اپنے شوہر مینڈک کو تلاش کیا۔ لیکن اس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ تلاش کرتے کرتے وہ اصطبل کی طرف جا نکلی۔ وہاں اس نے ایک جگہ مینڈک کی خالی کھال رکھی دیکھی اس کا رنگ ہو بہو اس کے شوہر کی کھال کا سا تھا،

شہزادی فوراً سمجھ گئی اور اصل معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئی۔ وہ خوشی سے چلائی۔

خدایا! وہ نوجوان گھڑ سوار میرا شوہر ہے کتنا خوبصورت اور بہادر! میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ مجھے ایسا شوہر ملا۔ لیکن کتنی بدنصیب تھی کہ اتنے دنوں تک مجھے پتہ نہ چل سکا! خوشی کے مارے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے پھر وہ خود بخود بولتی رہی "میرے اچھے شوہر کیا تم مجھ سے ناراض تھے کیا میں تمہارے قابل نہ تھی! آخر تم مجھ سے اتنے دنوں تک کیوں چھپے رہے؟ لیکن اب میں نے تمہیں تلاش کر لیا ہے۔ اب میں تمہیں دوبارہ اس ذلیل کھال میں چھپنے نہیں دوں گی"

یہ سوچ کر کہ کہیں اس کا شوہر دوڑ سے واپس آنے کے بعد اس کھال کو پہن کر دوبارہ مینڈک نہ بن جائے۔ اس نے کھال کو جلانا شروع کر دیا شام ہو چلی تھی اور سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس نے دور سے نوجوان سوار کو گھوڑے پر آتے دیکھا۔ نوجوان نے دور ہی سے دیکھا کہ شہزادی کھال جلا رہی ہے تو مارے خوف کے اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اس نے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا اور دروازہ پر پہنچ کر چھلانگ لگائی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ صرف ایک ٹانگ باقی رہ گئی تھی قریب قریب پوری کھال جل چکی تھی نوجوان آگے نہ بڑھ سکا اور چوکھٹ پر گر پڑا اس کے ہاتھ پاؤں بے کار ہو چکے تھے۔

شہزادی روتی ہوئی دیوانہ وار اس کی طرف دوڑی اور اسے

سہارا دیا۔ نوجوان نے کمزور آواز میں اس سے کہا۔ افسوس ہے شہزادی۔ تم نے بڑی جلد بازی سے کام لیا۔ کاش کہ تم صبر کے ساتھ اس دن کا انتظار کرتیں جس دن میں انسان کے روپ میں آجاتا۔ پھر ہم ہنسی خوشی اپنی زندگی گزارتے۔ لیکن اب میں زندہ نہیں رہ سکوں گا اور لوگ بھی خوش نہیں رہیں گے۔"

شہزادی زار و قطار روتی ہوئی بولی: "میرے اچھے شوہر اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو مجھے معاف کر دو۔ اور بتاؤ کہ اب کیا کروں؟"

نوجوان نے کراہتے ہوئے جواب دیا۔ "نہیں میری اچھی شہزادی تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی دراصل سب کچھ میری لاپرواہی سے ہوا ہے میں اپنی طاقت کی آزمائش کے لئے گھڑ دوڑ میں حصہ لیا کرتا تھا۔ سنو، میں دھرتی کا بیٹا ہوں۔ میں دنیا میں اس لئے آیا تھا کہ طاقتوروں اور غریبوں اور کمزوروں کی مدد کروں۔ میں ایک ایسی دنیا بنانا چاہتا تھا جہاں امیر غریبوں کو کچل نہ سکیں جہاں حکام عوام پر ظلم نہ توڑ سکیں جہاں لوگ آزادی سے دوسری جگہ جا کر مویشیوں اور غلے کی تجارت کر سکیں لیکن میں ابھی کمزور تھا اتنا کمزور کہ جاڑا تک برداشت نہیں کر سکتا تھا اسی لئے میں مینڈک کی کھال پہنے رہا کرتا تھا۔ اگر میں اس کھال میں کچھ دنوں تک اور رہتا اور عوام کی خدمت کرتا تو مجھ میں طاقت آجاتی اور پھر مجھے کھال کی ضرورت نہیں رہتی لیکن اب بہت دیر ہو چکی ہے میرا زندہ رہنا ناممکن ہے۔ میں صرف آج رات کا مہمان ہوں، صبح تک مجھے اپنے ماں دھرتی کے پاس واپس جانا ہوگا۔"

بے چاری شہزادی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا وہ اپنے شوہر کے سینے پر سر رکھ کر روتے ہوئے بولی۔

"میرے اچھے شوہر ایسا نہ کہو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔"

نوجوان نے شہزادی کا ہاتھ پکڑا اور سمجھایا۔

"میری بھولی شہزادی۔ اب رونا فضول ہے۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں واقعی زندہ رہوں تو تم فوراً ایک کام کرو۔ میرے گھوڑے پر بیٹھ کر ابھی اسی وقت مغرب کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ بہت دور چلنے کے بعد تمہیں بادلوں کے درمیان ایک سرخ عالیشان محل نظر آئے گا وہاں پہنچ کر تم خدا سے دعا کرنا اور اس سے تین چیزوں کا قول لینا۔ پہلا یہ کہ دنیا میں امیر و غریب کا فرق نہ رہے۔ دوسرا یہ کہ حکام عوام پر ظلم نہ کریں۔ تیسرا لوگ آزادی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر مویشی اور غلے کی تجارت کر سکیں۔ اگر خدا تمہیں یہ تینوں قول دیدے تو پھر لوگ امن چین سے زندگی گزاریں گے۔ میں بھی انسانی روپ میں تمہارے پاس رہوں گا۔ اور نہیں مروں گا۔"

یہ سنتے ہی شہزادی فوراً گھوڑے پر سوار ہوئی اور مغرب کی طرف روانہ ہو گئی۔ دور بادل کے بیچ اسے سرخ عالیشان محل نظر آیا اس نے گھوڑے کو اور تیز دوڑایا اور ایک لمحہ میں محل کے دروازے پر پہنچ گئی۔ وہاں اس نے بلند آواز سے خدا کو پکارا اور اس سے وہی تینوں قول مانگے خدا نے اس کے خلوص اور سچی محبت کے جذبہ سے متاثر ہو کر تینوں قول دیئے اور حکم دیا: "اے شہزادی۔ تم صبح ہونے سے پہلے ہمارا پیغام لوگوں تک پہنچا دو اگر ہمارا پیغام تمام لوگوں تک پہنچ جائے گا تو تمہارا شوہر زندہ رہے گا۔ اس علاقے میں کبھی اتنی سردی نہیں ہوگی اور وہاں کے لوگ خوش حال ہو جائیں گے۔"

شہزادی خوشی خوشی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتی ہوئی اپنے شوہر کے گھر کی طرف روانہ ہوئی تاکہ صبح سے پہلے خدا کا پیغام ہر گھر تک پہنچا دے۔

راستے میں اس کے باپ کا قلعہ پڑتا تھا۔ جب وہ قلعہ کے نزدیک پہنچی تو اس نے اپنے باپ چنگ پون سردار کو دروازہ پر کھڑا دیکھا۔ سردار نے اپنی بیٹی کو اتنی تیزی سے گھوڑے پر سوار جاتے دیکھا تو آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور پوچھا۔

"بیٹی تم اتنی رات گئے کہاں جا رہی ہو؟" شہزادی نے جواب دیا۔ "ابا جان مجھے جلد ہی اپنے شوہر کے گھر پہنچنا ہے۔ اور صبح سے پہلے خدا کا پیغام گھر گھر تک پہنچانا ہے۔"

لیکن سردار خدا کا پیغام جانے بغیر شہزادی کو جانے تک نہ دیتا تھا۔ اس نے پوچھا: "وہ خدا کا پیغام کیا ہے۔ ذرا مجھے بھی بتا دو۔ آخر میں بھی چنگ پون کا سردار ہوں۔ کوئی معمولی آدمی نہیں۔"

شہزادی کسی نہ کسی طرح اپنے باپ سے جلدی جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس نے مختصراً سارا واقعہ بیان کیا اور پھر خدا کے دیئے ہوئے تینوں قول دہرا دیئے۔

پہلا قول سن کر سردار نے جواب دیا: "واہ بیٹی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔

اگر امیر و غریب میں فرق نہیں ہوگا تو پھر رتبوں کی پہچان کیسے ہوگی۔ پھر تمہاری بہنوں کو جہیز کیسے دیا جائے گا؟" یہ کہکر اس نے شہزادی کے گھوڑے کی لگام پکڑلی۔

شہزادی نے دوسرا قول دہرایا تو سردار بولا "ہوں!۔ بہت خوب!۔ اگر لوگوں پر ڈنڈا نہیں گھومے گا تو کام نہیں ہوگا۔ پھر کھیت کون جوتے گا؟۔ مویشی کون پالے گا؟ سب لوگ حرام خور اور کام چور ہو جائیں گے۔" یہ کہہ کر سردار نے لگام کو اور مضبوطی سے پکڑلیا۔

شہزادی نے جلدی سے تیسرا قول دہرایا۔ سردار ناراضگی سے بولا۔ "یہ سب جھوٹ ہے خدا نے کوئی پیغام نہیں دیا۔ مجھے ان باتوں پر یقین نہیں۔ میں تمہیں لوگوں میں یہ غلط اور جھوٹ باتیں ہرگز پھیلانے نہیں دوں گا۔" یہ کہکر اس نے لگام کو اپنی طرف کھینچا۔

شہزادی نے لاکھ منت سماجت کی لیکن لگام چھڑانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اتنے میں مرغ نے پہلی بانگ دی۔ شہزادی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ لیکن اس کے باپ نے لگام اتنی مضبوطی سے پکڑی ہوئی تھی کہ وہ چھڑا نہ سکی۔

سردار نے ایک مرتبہ پھر شہزادی کو سمجھانے کی کوشش کی، وہ زور سے چلایا "لڑکی تو پاگل ہوئی ہے! کیا تو یہ چاہتی ہے کہ تیری بہنیں بغیر جہیز کے جائیں اور تیرے باپ کی بے عزتی ہو! آخر ہل کون چلائے گا؟ مویشی کون پالے گا! کام کون کرے گا!"

اتنے میں مرغ نے دوسری بانگ لگادی۔

شہزادی کو اپنے باپ پر بہت غصہ آرہا تھا۔ اس نے پوری قوت سے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑے نے ایک جھٹکے سے لگام چھڑالی سردار زمین پر آرہا۔ پھر وہ فراٹے بھرتا ہوا شہزادی کی سسرال کی طرف روانہ ہوگیا۔

لیکن جب وہ خدا کا پیغام پہلے گھر کے دروازے پر سنا رہی تھی تو مرغ نے تیسری بانگ دے دی۔

صبح ہو چکی تھی۔ خدا کا پیغام صرف چند لوگ ہی سن سکے۔ شہزادی کا دل ٹوٹ گیا۔ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی تھی۔ وقت گزر چکا تھا۔ اب کوشش بے سود تھی۔ وہ گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

اس نے دور سے دیکھا کہ دونوں غریب بوڑھے بڑھیا اپنے نوجوان بیٹے کی لاش کے قریب بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں وہ دھاڑیں مارتی ہوئی دوڑ کر اپنے شوہر کی لاش سے لپٹ گئی اور بڑی دیر تک روتی رہی۔ اور کہتی رہی "کاش میں اپنے باپ کی باتوں میں نہ آتی کاش میں خدا کا پیغام گھر گھر پہنچا دیتی"۔

آخر اس نوجوان شہسوار کو پہاڑ کی چوٹی پر دفنا دیا گیا۔ شہزادی ہر شام اپنے شوہر کی قبر پر جاتی اور گھنٹوں روتی رہتی یہاں تک کہ ایک دن وہ بھی روتے روتے پتھر بن گئی۔

آج بھی اس قبر کے پاس وہ پتھر موجود ہے دور سے بالکل ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے کوئی شہزادی اپنے لمبے لمبے بال کھولے قبر کے پاس بیٹھی دعا مانگ رہی ہے۔

بقیہ:۔ پنچھی۔

کی وساطت سے اس کو تحائف پہنچاتی، اور محسن اسی ذریعہ سے اس کا شکریہ ادا کر دیتا۔ وقت گزرتا گیا۔ حتیٰ کہ اس کا تبادلہ کراچی ہوگیا کچھ دن تو پنچھی روتی تڑپتی رہی اور محسن کی واپسی کے لئے وظیفے پڑھتی رہی۔ پھر اس نے محسن کا انتظار چھوڑ کے ڈاکئے کی راہ تکنی شروع کردی، مہینے میں دوبار اس کا خط ضرور آتا اور پنچھی از خود رفتہ ہوکر بازار کی طرف دوڑ جاتی۔ وہ زیادہ وقت داؤد خان کے ساتھ گزارنے لگی یا پھر سونی کے ساتھ جو بہک بہک کر اس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے لگا تھا۔

مگر اب.... اب تو اسے داؤد خان سے بھی نفرت ہو چکی ہے۔ اب تو سارا کھیل ہی ختم ہو چکا ہے۔ اب تو ڈرامے کا آخری منظر بھی سامنے آچکا ہے۔ اب باقی ہی کیا ہے۔ اب تو حقیقت سفید روشنی بن کر اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رہی ہے۔ اب تو وہ دوکان پر بھی کم عرصہ کے لئے جاتی ہے۔ اور جاتی ہے تو سونی کی انگلی پکڑ کر اسے ساتھ لے جاتی ہے۔

علاقائی سرگرمیاں

منٹگمری میں ادبی نشستیں

پچھلے دنوں منٹگمری میں کئی ادبی نشستیں منعقد ہوئیں۔ سب سے اہم نشست حضرت جوش ملیح آبادی کے ساتھ ایک شام تھی جس کا اہتمام بزم فکر و ادب منٹگمری نے کیا تھا۔ یہ نشست ایک طویل ادبی جمود کے بعد منعقد کی گئی۔ اس ہنگامے کے ساتھ ہی پاکستان رائٹرز گلڈ کی سب ریجنل شاخ منٹگمری نے دو اہم نشستیں منعقد کیں۔ ان نشستوں کا اہتمام رائٹرز گلڈ کے دفتر میں کیا گیا۔ پہلی نشست کی صدارت محترمہ رفعت دہلوی مدیرہ "حاشیے" نے فرمائی اور دوسری نشست کی صدارت جناب ظہور نظر نے۔ ان دونوں موقعوں پر منٹگمری کے جن قابل ذکر ادبا و شعرا نے شرکت فرمائی ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب مجید محمد سید جعفر شیرازی۔ جناب بشیر احمد بشیر، جناب ش۔ ر۔ عباسی۔ جناب اشرف قدسی، جناب ضیا شبنمی۔ جناب محمود، جناب سید مراتب اختر۔ جناب خالد طور۔ ان نشستوں میں شعرا نے حسب بلند پایہ کلام سے شریک محفل سامعین کو نوازا اس کا کچھ نمونہ قارئین کے پیش نظر ہے۔

مراتب اختر

یادیں بکھر گئی ہیں درختوں کے جھنڈ میں
کرنوں نے کھول دی ہے سیہ رات میں کتاب
سانسوں میں ساگوان کی خوشبو تیری لگن،
تیرا وجود دل کے خرابات میں کتاب

جناب خالد طور۔

رنگ تیرا پیرہن خوشبو ترا سیمیں بدن
تو میرے خوابوں میں ہے جیسے چمن اندر چمن
روح کے کاغذ پہ کچھ ترچھی لکیریں دیکھنا
بس یہی اوج نظر ہے بس یہی دار و رسن

جناب اشرف قدسی۔

چلیے تو ایک قدم بھی اٹھانا محال ہے
یوں دیکھنے کو پاؤں میں زنجیر بھی نہیں
وہ خواب ہو گئے ہیں زمانے میں آج ہم،
جس خواب کی ابھی کوئی تعبیر بھی نہیں

جناب ش۔ ر۔ عباسی۔

کس نے سجا سجا کے کھلائے کس نے شاخ پر پھول،
دامن میں ہوں جمع کئے میں لاکھ خیالی پھول
پتے پیلے پڑ گئے باغ میں سوکھ گئی ہر شاخ
زور خزاں کا ہے مت ڈھونڈو ڈالی ڈالی پھول

جناب بشیر احمد بشیر

یا مرے وصال کی دیوار گرا دی جائے،
یا مری خاک خلاؤں میں اڑا دی جائے،

لم۔

کیسے آواز حریم رگِ جاں تک پہنچے
اتنی دوری سے تجھے کیسے صدا دی جائے
چکھنے پائے نہ کوئی بوند یہ جلتی مٹی،
ابر اٹھے تو ہوا تیز چلا دی جائے،

سید جعفر شیرازی۔

جی کو جلانے والی آگ میں کب تک کوئی جلے،
ہم تو ان آنکھوں کے دریاؤں میں ڈوب چلے،
آرے دل اس اجلی اجلی دھوپ میں گم ہو جائیں
سرد ہوا کا جھونکا کب آئے کب شام ڈھلے
انہونی سی بات سمجھ کر کان نہ دھرتے تھے
وہ آنکھوں سے دور گیا تو ہم نے ہاتھ ملے

ابِ مجید امجد۔

باہ وال قدروں کی گتھی اور الجھی جل اٹھی تقدیر دل
اب تو اس مٹی کے ہر ذی روح ذرے میں بھی ہے اسیر دل
وار، دنیا نے کئے مجھ پر تو اے بد بیں نے اس گھمسان میں
اپنا سینہ چیر کے رکھ دی نیامِ حرف میں شمشیرِ دل

میر رفعت ہاشمی۔

داغ دل کے کبھی دکھا نہ سکے
ان چراغوں کو ہم بجھا نہ سکے
حاصلِ زندگی نہیں معلوم
حاصلِ زندگی کو پا نہ سکے
غم اگرچہ سکوں نواز رہا
ہم خوشی سے گلے لگا نہ سکے

ڈھلی آیا اندھیرا ہے بہار شام سے پہلے
کچھ فکر کرو رات کے ہنگام سے پہلے

ب ظہور نظر۔

[illegible]
[illegible]

بیکار بیٹھنے میں کبھی اب کچھ مزا نہیں
پچھلے کئی دنوں سے لگا یہ بھی ایک کام
شاید اسی طرح کوئی منزل نظر پڑے
آنکھوں پہ ہاتھ دھر کے چلو چند ایک گام

جناب ظہور نظر اور رفعت دہلوی سے ان دونوں نشستوں میں ان کا منتخب اور بھرپور کلام سنا گیا جس سے اہل منٹگمری کا ایک طویل عرصہ کی ادبی خاموشی کا ازالہ ہوا۔

پشاور میں ایک تنقیدی نشست اور مشاعرہ

انجمن ترقی اردو پاکستان (پشاور) کی پندرہ روزہ تنقیدی نشست دولت کدہ جناب سعید گیلانی مورخہ ۴ جولائی منعقد ہوئی۔ صدارت کے فرائض پروفیسر خاطر غزنوی صاحب نے انجام دیئے۔ ناظم اعلیٰ نے صدر کی جانب سے دو قراردادیں جناب پروفیسر حامد حسین قادری صاحب اور مولانا صلاح الدین احمد صاحب کے انتقال پر ملال کے سلسلے میں پیش کیں اس کے بعد محسن احسان نے مولانا صلاح الدین احمد کے بارے میں ایک نظم پڑھی جسے بے حد پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نذیر مرزا برلاس نے "غالب کی رجائیت" پر ایک مضمون پڑھا۔ جس پر کافی بحث ہوئی۔ برلاس صاحب کا خیال تھا کہ غالب کو زندگی سے عشق تھا۔ اور عشق کے توسط سے ہی وہ زندگی کو دیکھتے تھے اور اس طرح غالب "حدیث جاناں" سے "حدیث زندگی" تک پہنچ گئے۔ بحث کافی دیر ہوتی رہی۔ اس میں فارغ بخاری، رضا ہمدانی، اشر لغمانی، محسن احسان اور شمیم بھیروی نے حصہ لیا۔ اس کے بعد محسن احسان نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی مختلف اشعار پر گفتگو رہی۔ اور غزل کو کافی سراہا گیا دو شعر یہ تھے۔

سحر سے ایک کرن کی فقط طلب تھی مجھے
تمام رات مگر بیکلی غضب تھی مجھے

فصیل شب سے کوئی اب پکارتا ہے تو کیا
ملا۔ ایک بھی بس دن تلاش جب تھی مجھے

تنقیدی محفل کے بعد محفل مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ حاضرین میں

جناب فارغ بخاری، رضا ہمدانی، بشر رنعانی، مظہر تاتاری، محسن احسان عشرت ملک، ایف آر برق، کوثر حیات، فیاض ابدالی، سعید گیلانی، عارف منان قریشی۔ ناز درانی، نذیر مرزا برلاس، صمد ہوش، اور دیگر حضرات شامل تھے۔

یہ پر لطف محفل رات ۱۱½ بجے ختم ہوئی۔

ادارۂ مصنفین پاکستان سب سیکشن ملتان

گذشتہ دنوں ادارے کی جانب سے خاص طور پر ایک علمی محفل کا انعقاد عمل میں آیا جس میں محترم ارشد ملتانی نے حسب ذیل مضمون پیش کیا۔

"ادارۂ مصنفین پاکستان" کا قیام جہاں پورے پاکستان کے ادیبوں اور ادب دوستوں کے لئے ایک نیک فال ثابت ہوا ہے۔ وہاں اس کی بقا ملتان کے اہل ادب کے واسطے بھی زندگی کی نئی توانائیوں اور تنظیمی حسن آفرینیوں کا جاں فزا پیغام بنی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ رائٹرز گلڈ نے مشرقی و مغربی پاکستان کی ذہنی و فکری یک جائیوں کو مضبوط تر بنانے میں جو ایک حسین اور خوشگوار رابطے کا کارنامہ انجام دیا ہے اس کی نظیر بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ آج ادیبوں میں مل بیٹھنے اور بھائی چارے کا جو شعور جاگ اٹھا ہے اس کی بیداریوں میں ادارۂ مذکور کی موثر تنظیم کا بہت بڑا حصہ ہے ۔۔۔ ادب اور ادیبوں کی محفلیں ہر مقام پر تھیں لیکن ان محفل آرائیوں کو نظم و ضبط کے حسن میں ڈھالنے کا سہرا ادارۂ مصنفین پاکستان کے سر ہے۔

ملتان علم و ادب کا گہوارہ ہے۔ زندگی کے ہر دور میں اس کی علمی و ادبی تابانیوں نے انسانی اذہان و افکار کی رہنمائی کی ہے۔ رائٹرز گلڈ کے قیام سے پہلے بھی ملتان کے اہل ذوق زندگی اور زندگی آفرینیوں کا ثبوت مہیا کرتے رہتے تھے، لیکن گلڈ کی سرگرمیوں نے علمی و ادبی رونقوں میں ایک خاص وقار اور خود اعتمادی پیدا کر دی ہے۔ ملتان کا خوبصورت گلڈ ہاؤس ادب تہذیب اور حسن کی ایک علامت بن گیا ہے۔ اس کی امید ان بخش فضا میں پہنچ کر ادیب کا دل اور ذہن

بہ سر تمکنت سے بلند ہو جاتا ہے۔ ملتان گلڈ کی ہفتہ وار تنقیدی محفلیں ایک درخشاں روایت بن چکی ہیں اس وقت عالم یہ ہے کہ پڑھے لکھے لوگ گلڈ کی نشستوں میں شرکت کر کے فخر محسوس کرتے ہیں یہ تنقیدی جلسے اتنے کامیاب اور بارونق ہو گئے ہیں کہ اپنی تخلیقات پیش کرنے والوں کو ہفتوں، نہیں مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارا قاعدہ یہ ہے کہ ہر ہفتے کا پروگرام چھپوا کر پڑھے لکھے لوگوں تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہر پروگرام میں صدر اور مضامین نظم و نثر پیش کرنے والوں کا نام ہوتا ہے۔ پھر ہر ہفتے اخبارات میں بھی اعلان کر دیا جاتا ہے ان تمام کوششوں سے نہ صرف گلڈ نئے لوگوں سے متعارف ہو جاتا ہے بلکہ باذوق لوگوں کو ایک جاندار اور پر لطف مصروفیت بھی مل گئی ہے (اگرچہ ہمارے ہاں غیر معروف ادیب نہ ہونے کے برابر ہیں۔)

باقاعدہ اور معمول کے مطابق جلسوں کے علاوہ ... تقریبات ایک خاص کشش اور ندرت کی حامل ہوتی ہیں ان تقریبوں میں ملکی اور غیر ملکی دانشور، ادیب اور صحافی مہمان خصوصی ہوتے ہیں ان حضرات کے افکار و خیالات سے پوری طرح مستفید ہونے کی شاندار نشست کے علاوہ مہمانوں کے اعزاز میں جس باوقار ... کا اہتمام کیا جاتا ہے اس میں ہم کوشش کرتے ہیں کہ گلڈ ... کیا جائے۔ یہ تمام کام اس دیانت اور سلیقے سے ہوتا ہے ... ہمارے ہاں کے معززین ان دعوتوں میں شرکت کو ایک اعزاز سمجھنے لگے ہیں۔

ملتان گلڈ نے ایک چھوٹی سی خوبصورت لائبریری ... اس لائبریری میں خاصی کتابیں موجود ہیں اور ملکی غیر ملکی رسائل بھی آتے ہیں ان کتابوں اور رسائل سے بغیر کسی معاوضے کے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے ایک لائبریرین روزانہ شام کو دو گھنٹے اپنے فرائض انجام دیتا ہے چنانچہ اس حسن انتظام کی بدولت کتابوں کے ... پڑھنے والوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے

آجکل ملتان گلڈ کی جانب سے ایک ضخیم کتاب "سب رنگ" کے نام سے شائع کرنے کا اہتمام کیا ... اس کتاب میں ملتان کے ادیبوں، شاعروں کی تخلیقات کا انتخاب پیش کیا جائے گا۔ اس انتخاب میں گلڈ کے رکن اور غیر رکن کی تخصیص روا نہیں رکھی گئی۔ یہ کتاب

باقی صفحہ ۶۲ پر

خبرنامہ

اموات العلماء موت کے ظالم ہاتھوں نے اس ماہ بھی دنیا سے متعدد اہل قلم بے رحمی کے ساتھ چھین لئے۔ ۱۹ر جولائی کو سید ہاشمی فرید آبادی ۸۱ سال کی عمر میں دار فانی سے کوچ کر گئے وہ کافی دنوں سے عارضہ قلب میں مبتلا تھے۔ سید ہاشمی فرید آبادی ملک کے چند گنے چنے علماء و محققین میں نمایاں درجہ رکھتے تھے۔ وہ علی گڑھ سے فارغ التحصیل ہو کر حیدر آباد دکن کے دارالترجمہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اور متعدد علمی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کی گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی کتاب تاریخ ہند اپنے موضوع کی ایک مستند کتاب ہے۔ دارالترجمہ میں کافی عرصہ تک علمی خدمات انجام دینے کے بعد وہ دہلی چلے گئے اور وہاں انجمن ترقی اردو سے وابستہ ہو گئے قیام پاکستان تک وہیں رہے اور پھر ہجرت کے وقت لاہور چلے آئے۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی زندگی تک انجمن ترقی اردو ہی ان کی علمی خدمات کا محور رہی۔ موت سے دو سال قبل مرحوم نے اپنا ایک رسالہ "تہذیب و اخلاق" جاری کیا تھا۔

ان کی وفات کی خبر نے پورے ملک کے علمی حلقوں میں صفِ ماتم بچھا دی۔ متعدد ادبی اور علمی اداروں میں تعزیت کی قراردادوں کے بعد اظہارِ غم کے لئے کاروبار معطل کر دیا گیا۔ ترقی اردو بورڈ کے دفاتر میں بھی تعطیل رہی اور بورڈ کے ایک اجلاس میں جس کی صدارت علامہ نیاز فتح پوری کر رہے تھے آپ کی وفات پر دلی اندوہ و غم کے ساتھ قراردادِ تعزیت منظور کی گئی جس میں ان کی وفات کو پورے ملک اور سارے اردو کی علمی اور ادبی دنیا کے لئے ایک سانحہ قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ ان جیسی قابلیت و اہلیت کے لوگ ہمارے درمیان بہت ہی کم ہیں۔

روس میں ماؤزے تنگ کی تصانیف پر پابندی لگا دی گئی

جدید چین کے انقلابی رہنما اور کمیونسٹ دنیا کے لیڈر ماؤزے تنگ کی تصانیف پر روس نے پابندی عائد کر دی ہے۔ ماؤ ایک سیاسی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کے مفکر اور بلند پایہ شاعر بھی ہیں۔ ان کی نظمیں چین کے جدید ادب میں نمایاں مقام رکھتی ہیں اور روس میں بھی ان کے مداحین کی تعداد کافی ہے۔ روسی حکام نے پابندی لگانے کا یہ جواز پیش کیا ہے کہ ماؤ کی تصانیف روسی مفادات کے منافی ہیں۔ ان احکام پر فوراً عمل درآمد شروع کر دیا گیا ہے اور ان کی متعدد تصانیف کی مجلد کاپیاں جو حال ہی میں بذریعہ ڈاک روانہ کی گئی تھیں روسی محکمہ کسٹم نے ضبط کر لی ہیں۔ پابندی کے حکم میں ان کی سیاسی یا ادبی تصانیف کی کوئی تخصیص روا نہیں رکھی گئی۔

دو روز بعد کراچی میں ۱۲ جولائی کو مولانا مفتی زاہد القادری کا انتقال ہو گیا۔ ان پر سہ پہر کے قریب دل کا دورہ پڑا جو آخر جان لیوا ثابت ہوا۔ ان کی عمر بھی ۷۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ ایک جید عالم اور ملک کے قدیم ترین صحافی تھے ۱۹۳۵ء میں دہلی سے "البلاغ" اور "زمزم" جاری کیا۔ بمبئی سے کافی عرصہ تک "نئی روشنی" اور "صداقت" کے نام سے ہفتہ وار جرائد نکالتے رہے۔ دہلی میں اخبار "الامان" اور "وحدت" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ تحریکِ خلافت کے زمانے میں مولانا محمد علی اور شوکت علی کے سرگرم کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ عربی، اردو اور فارسی میں ان کی تقریباً دو درجن تصانیف موجود ہیں۔

روس کے معروف شاعر سیموئل مارشک بھی اسی ماہ موت کے دامن میں چلے گئے۔ وہ سوویت یونین کے مقبول شعراء میں سے تھے۔ روسی زبان میں شیکسپیئر کے ڈراموں کے ترجموں کے ذریعہ انہوں نے روسی ادب کو عالمی کلاسیکی ادب کے گراں بہا شہ پارے دیئے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری بھی روسی عوام کے دلی جذبات کی آئینہ دار تھی۔

ضبطی

گورنر مغربی پاکستان نے پریس اور مطبوعات آرڈیننس ۱۹۶۳ء کے تحت دیوبند کے ایک ماہنامہ رسالہ "تجلی" کے تمام نسخے بحق سرکار ضبط کر لئے۔ حکومت کے اعلان میں کہا گیا ہے کہ مدیر اور ناشر عامر عثمانی کے تحت شائع ہونے والے اس رسالے میں جو نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند (بھارت) میں چھپا، پاکستان میں قانونی طور پر رائج حکومت کے خلاف زہر اگلا گیا ہے تاکہ حکومت کے خلاف عوام میں منافرت پھیلے

یادگار بابائے اردو مولوی عبدالحق کی تیسری برسی کے موقع پر بین الاقوامی اردو محاذ نے ایک خصوصی یادگار مجلہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں محاذ کی طرف سے تمام لکھنے والوں کو مدعو کیا گیا ہے کہ وہ اپنے تاثرات یا پیغامات مجلے میں اشاعت کے لئے محاذ کو ارسال کریں۔ مجلے کی اشاعت کے علاوہ اس برسی کے موقع پر متعدد ادارے ادبی تقاریب بھی منعقد کریں۔

انعام مشرقی پاکستان کے ایک شاعر جناب عبدالغنی ہزاری کو ان کی ایک نظم پر ایشیائی ادبی مقابلوں میں انعام دیا گیا۔ یہ مقابلے ۶۲-۶۱ء انٹرنیشنل۔ پی۔ ای۔ این کی شاخ ٹوکیو (جاپان) کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے تھے۔ ان کی نظم کا عنوان "اعلیٰ افسروں کی بیویاں" تھا۔ یعنی ۶۱ء میں ان مقابلوں میں بھارت اور جاپان کے شعراء کی نظموں پر انعامات دیئے گئے۔ شریک ہونے والے ممالک میں بھارت، جاپان، برما، انڈونیشیا، فلپائن، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ، ملایا، پاکستان اور جنوبی ویت نام شامل ہیں۔

مرزا غالب —— مرزا عالی —— اور کرسی

پچھلے دنوں پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی نے مرزا اسداللہ خاں غالب کی یادگار کرسی قومی عجائب گھر کے حوالے کر دی۔ یہ تاریخی کرسی مرزا غالب کے استعمال میں رہی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ وہ اکثر اوقات اسی کرسی پر بیٹھ کر فکرِ سخن کیا کرتے تھے۔ مذکورہ کرسی کی تاریخ یوں بیان کی جاتی ہے کہ مرزا غالب کی وفات کے بعد یہ کرسی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پاس رہی۔ پھر ان کے دو سال کے بعد نواب محمد اسحاق خاں کی صاحبزادی محترمہ بیگم انور زمانی کے پاس رہی اور ان کے بعد نواب افتخار احمد خاں کے والد گرامی نواب محمد اسمٰعیل خاں کے پاس میرٹھ میں رہی۔ محترمہ انور زمانی نے خود بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ مذکورہ کرسی مرزا غالب کے استعمال میں رہی ہے۔ نواب افتخار احمد کے بھائی ۱۹۵۲ء میں اس کرسی کو بھارت سے اپنے ہمراہ پاکستان لائے تھے اور اسی وقت سے یہ مرزا جمیل الدین عالی کے پاس محفوظ تھی۔

نواب افتخار احمد خاں نے قومی عجائب گھر کے مشاورتی بورڈ کے چیئرمین اور نیشنل بنک کے منیجنگ ڈائرکٹر مسٹر ممتاز حسن کو یہ کرسی بطور تحفہ دینے کی پیش کش کی۔ اور جولائی کے اواخر میں جمیل الدین عالی نے یہ کرسی قومی عجائب گھر کے حوالے کر دی۔ اس کرسی کی عام نمائش عنقریب قومی عجائب گھر میں شروع کر دی جائے گی۔ لیکن فی الحال جگہ کی کمی کے باعث اس کا اہتمام نہیں کیا جا رہا۔ اور اس کرسی کو لکڑی کے بڑے صندوق میں بند کر کے دیگر نوادرات کے ساتھ گودام میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔

ناقابلِ انعام مجلس ترقی ادب لاہور نے ۶۲-۱۹۶۱ء میں شائع شدہ کتابوں پر انعامات دینے کا جو اعلان کیا تھا اس کے مطابق یہ اطلاع شائع کی گئی ہے کہ موصولہ کتابوں میں کوئی کتاب بھی اس قابل نہ تھی کہ اسے انعام دیا جاتا۔ چنانچہ یہ انعامات نہیں دیئے جا رہے ہیں۔ انعامات کے لئے مخصوص کی گئی رقم کے مصرف کا ابھی کوئی اعلان نہیں کیا گیا۔

کلامِ بے نیام نئی دہلی سے شائع شدہ ایک کتاب "کلامِ بے نیام" جس کے مصنف مسٹر ایم۔ بی۔ ناشاد ہیں حکومت مغربی پاکستان نے ضبط کرلی ہے۔

امداد بزمِ ادب رحیم یار خاں نے ایک مرحوم شاعر عزت مرادآبادی کے پسماندگان کی امداد کے لئے ۱۴ جولائی کو ایک آل پاکستان مشاعرہ منعقد کیا اس مشاعرے کی آمدنی مرحوم کے لواحقین کی مدد کے لئے مخصوص کردی گئی ہے نیز ان کی غیر مطبوعہ غزلوں کا ایک مجموعہ شائع کرنے کا پروگرام بھی مرتب کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی آمدنی مرحوم شاعر کے بچوں کی تعلیم پر صرف کی جائے گی۔

انتخاب نئے سال کے لئے حسرت موہانی میموریل سوسائٹی کے نئے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ جمال میاں فرنگی محلی صدر، راجہ صاحب محمودآباد اور مبارک مہاجر نائب صدر، معین الدین خلش جنرل سکریٹری، فضل محمد جعفری جائنٹ سکریٹری، اور ساجد علی خزانچی منتخب ہوئے اس کے علاوہ ایک ۱۸ افرادی مجلس عاملہ بھی قائم کی گئی۔

تحفہ صدر ایوب جب دولت مشترکہ کانفرنس میں شرکت کیلئے جاتے ہوئے تہران ٹھہرے تو انہیں کلیات فارسی اقبال نامی ایک خوبصورت مجموعۂ کلام پیش کیا گیا۔ یہ مجموعۂ کلام اقبال کے فارسی اشعار پر مشتمل ہے جو یہاں مقامی طور پر پہلی مرتبہ شائع کئے گئے۔ اہل ایران نے پاکستان کے قومی و ملی شاعر کے کلام کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایران کے ایک جید عالم جناب احمد سروش نے کلام اقبال پر ایک مبسوط دیباچہ لکھا ہے۔ جس میں برصغیر میں اسلام کے تحفظ اور ایک آزاد وطن کے قیام کے لئے مبذول مسلمانوں کی جدوجہد کی تحریک سے متعلق بحث کی گئی ہے۔

نشست ۸ جولائی کو ملتان بزمِ اردو کے زیر اہتمام ایک ادبی نشست ہوئی جس میں رفیق چغتائی نے مضمون، نعیم نے غزل اور عزیز الدین نے افسانہ تنقید کے لئے پیش کیا۔ بزم ملتان میں اکثر و بیشتر اس قسم کی ادبی مجالس کا انعقاد کرتی رہتی ہے۔

اعزاز حیدرآباد کے جواں فکر شاعر محسن بھوپالی کے ساتھ جولائی کے آخری ہفتہ میں شہر کے اصحاب ذوق نے ایک شام منائی اس تقریب کے محرک وہاں کے ایک نوجوان فن کار مسٹر صابر نایاب تھے۔ مجلس میں چند اہل قلم نے شاعر کے فن پر مضامین پڑھے اور حمایت علی شاعر اور اختر انصاری اکبرآبادی نے ان کی شاعری پر تنقیدی روشنی ڈالی، بعد ازاں خود شاعر نے ان کا منتخب کلام سنایا۔

مشاعرہ لاڑکانہ میں بزمِ ادب کے زیر اہتمام ایک تنقیدی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ سید صادق دہلوی کی صدارت میں مرزا عسکری حسین نے ایک مقالہ "چمنستان شاعری کے خود رو پودے" تنقید کے لئے پیش کیا۔ جس پر حاضرین میں سے سید احمد، احمد رضوی ساز، شمشیر خاں، ڈاکٹر بانی اور شوکت عابدی نے تنقید کی۔ بعد ازاں ایک مشاعرہ بھی کیا گیا جس میں جمیل رضوی ساز، ناز مظفر نگری، صادق دہلوی، لطیف لطیف، شاہد علی شہید، غلام سرور، محمد علی جوہر، شوکت عابدی، رمز شاہ جہانپوری۔ علاوہ اثر اور صابر صدا اروی نے اپنا کلام سنایا۔

اظہارِ مسرت صوبائی اسمبلی میں حزبِ مخالف کے رکن رائے منصب علی کھرل نے حکومت پاکستان کے اس فیصلہ پر اظہار مسرت کیا کہ پنجابی اکادمی کی مالی امداد کی جائے گی انہوں نے سرکاری اور عوامی حلقوں سے مشترکہ طور پر اپیل کی کہ انہیں پنجابی ادب کی معاونت سے پہلو تہی

نہیں کرنا چاہیئے۔ انہوں نے اپنے بیان میں اس بات پر بھی زور دیا کہ بزم ثقافت ادب ملتان کی مالی امداد بھی بحال کی جائے۔

سالگرہ جولائی کے دوسرے ہفتے میں علامہ راشد الخیری کے جاری کردہ رسالہ عصمت کی ۵۶ ویں سالگرہ ہوٹل میٹروپول کراچی میں منائی گئی۔ اس تقریب کا اہتمام پاکستان رائٹرز گلڈ، اُردو ترقیاتی بورڈ اور انجمن ادبی رسائل و جرائد پاکستان نے مشترکہ طور پر کیا۔ رسالہ "عصمت" ۱۹۰۸ء میں علامہ راشد الخیری نے دہلی سے جاری کیا تھا اور یہ رسالہ نصف صدی سے مسلم گھرانوں کی خواتین کا پسندیدہ اور پاکیزہ رفیق ہے۔ سالگرہ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے نیشنل بنک آف پاکستان کے منیجنگ ڈائریکٹر جناب ممتاز حسن نے کہا کہ علامہ راشد الخیری کی منتخب تصنیفات کو مسلم خواتین کی ذہنی تربیت کے لئے نمایاں اور اہم مقام دینا ضروری ہے۔ انہوں نے ماہنامہ عصمت کو ایک ایسی تحریک کی علامت قرار دیا جو مغربی تہذیب کے مضر عناصر کا مقابلہ کرنے کے لئے ہماری معاشرے کی طرف سے شروع کی گئی تھی۔ اس تقریب میں شہر کے ممتاز دانشور اور [illegible] حضرات نے شرکت کی۔ جناب ممتاز حسن کے علاوہ جناب شاہد احمد دہلوی، جناب حفیظ جالندھری اور جناب مولانا ماہر القادری نے علامہ مرحوم کو خراج عقیدت پیش کیا۔ علامہ محترم کے صاحب زادے رازق الخیری اور ان کی بہو محترمہ برلاس نے بھی تقاریر کیں۔

تقریب بزم فکر و ادب منٹگمری نے جولائی کے آخری ہفتے میں جناب فیض احمد فیض کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا۔ اس تقریب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں شاعروں اور [illegible] کے علاوہ گویوں نے بھی حصہ لیا اور فریدہ خانم اور منیر حسین نے کلام فیض ساز و آواز کے ساتھ [illegible] کے سامنے پیش کیا۔ اس تقریب میں مجید امجد، مصطفےٰ زیدی، بشیر احمد بشیر، جعفر شیرازی، ظفر اقبال کے علاوہ شہر کے دوسرے قابل ذکر ادباء و شعراء نے بھی شرکت کی۔

تعلیم وزارت تعلیم کراچی میں عنقریب غیر ملکی زبانوں کی تدریس کا ادارہ قائم کرنے والی ہے۔ ابتدا میں یہ ادارہ فرانسیسی، ہسپانوی، جرمنی، عربی اور فارسی زبان کی تعلیم دے گا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس کے دائرہ کار میں اضافہ کیا جاتا رہے گا۔ وزارت کے اس [illegible] کے علاوہ کراچی یونیورسٹی اور کئی دیگر ثقافتی مراکز میں غیر ملکی زبانوں کی تدریس ہوتی ہے حکومت کا منشا یہ ہے کہ اس کے قائم کردہ ادارے میں دنیا کی تمام قابل ذکر زبانوں کی تدریس کا سلسلہ شروع کیا جا سکے۔ ادارے کے قیام کے لئے عمارت کی تلاش جاری ہے۔

قیام نیو کراچی میں الیاس کاظمی اور لفافت اللہ کیف کے تعاون سے بھولاری آرٹیمیزن کوآپریٹو ہاؤسنگ سوسائٹی نیو کراچی کے ارباب علم و فن کے ایک اجلاس میں اُردو مجلس کے قیام کا فیصلہ کیا گیا۔ اجلاس کی صدارت قاضی منظور الحق کر رہے تھے۔ [illegible] راشدی کی تجویز پر اتفاق رائے سے اُردو مجلس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس مجلس کے اغراض و مقاصد میں اسکولوں کا قیام، لائبریری کا قیام اور بنگلہ کی تعلیم کے سلسلہ میں آغاز کی سعی بھی شامل ہیں۔ عہدیداروں میں احمد [illegible] نگران، ڈاکٹر شیخ محمد ابراہیم خلیل صدر، [illegible] اللہ مسکین نائب صدر اور وفا راشدی سکریٹری منتخب کئے گئے۔ دیگر عہدیداروں اور مجلس عاملہ کے اراکین میں لفافت اللہ کیف، [illegible] توحید، عبد العلیم صدیقی، غلام رسول بلوچ، علی اکبر شاہ، آفتاب احمد، محمد الیاس کاظمی اور عبد اللطیف گیلانی شامل ہیں۔

قیام کے چند ہی روز بعد مذکورہ مجلس کے زیر اہتمام ایک ادبی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں وفا راشدی نے ایک منظوم [illegible] درشہری پڑھا۔ اس کے علاوہ کیف، مسکین اور وفا نے اپنا اپنا کلام بھی سنایا۔ غلام رسول بلوچ نے ایک سندھی نظم پڑھی۔ جلسہ [illegible] اعلیٰ پیمانے پر اُردو سندھی ادبی کنونشن کے انعقاد کا فیصلہ بھی کیا گیا اور [illegible] ایک ایڈہاک کمیٹی مقرر کی [illegible] تمام پروگرام بنا کے مرتب کر کے عمل اہتمام کا آغاز کر دے گی۔

اصطلاحات یونسکو کے ایک جلیشن [illegible] اور [illegible] ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں مغربی پاکستان کے [illegible] ادارے جو کام کر رہے ہیں اس کے خدمت [illegible] اداروں نے ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ فنی اصطلاحات کا اُردو میں

ترجمہ کر لیا ہے۔ چونکہ یہ کام کئی ادارے جداگانہ طور پر انجام دے رہے تھے اور ان میں براہ راست رابطہ بھی قائم نہ تھا اس لئے بہت سی اصطلاحات کے دو دو ترجمے ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اس الجھاؤ کو دور کرنے کے لئے اب ترقی اردو کے مرکزی بورڈ کے زیر نگرانی تمام اصطلاحات کو یکجا کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وقت مغربی پاکستان میں ترقیٔ اردو بورڈ اور مشرقی پاکستان میں بنگلہ بورڈ قومی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کے سلسلے میں نصابی کتب کی تدوین کے مراحل طے کر رہے ہیں۔

سفارت مراکش میں پاکستان کی نئی سفیر بیگم شائستہ اکرام اللہ نے گذشتہ ماہ پاک امریکی ثقافتی مرکز میں "اردو شاعری کا لہجہ اور موضوع" کے عنوان سے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری عہد مغلیہ کے زوال کے وقت وجود میں آئی یہی باعث ہے کہ ابتدائی ادوار میں اس پر سیاسی اور تاریخی اثرات نمایاں ہیں۔ اقبال، حالی اور اکبر کی شاعری بھی مسلمانوں کی سیاسی جدوجہد کی عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے ان تینوں شعرائے کرام کو عظیم قومی مصلح اور تعمیر پسند فن کار قرار دیا اور کہا کہ ان شعراء نے قوم کے افراد میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ اپنی اور ثقافت کی قدر و قیمت کا تعین کریں۔ اور اس ورثے کو عظیم ورثہ سمجھیں اردو شاعری کے مختلف مکاتیب فکر کا ذکر کرتے ہوئے بیگم اکرام اللہ نے گذشتہ دو صدیوں میں اردو شاعری کے ارتقا کا جائزہ لیا اور غالب، اقبال، حالی، حفیظ، فیض اور ن۔م۔ راشد کو اردو کی خدمت پر خراج تحسین پیش کیا ان شعراء کی جداگانہ خصوصیات کے ذکر میں انہوں نے کہا کہ غالب ان عظیم شعراء میں سے ہیں جنہوں نے فارسی غزل کو اردو میں رائج کرنے کا کامیاب تجربہ کیا۔ اقبال اور حالی نے اپنی نظموں کے ذریعہ خوابیدہ قوم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور اس کا اخلاقی معیار بلند کیا۔ اکبر نے اپنے طنزیہ کلام سے بھی یہی کام لیا ہے اور افرادِ قوم کے قلب پر ان کے اشعار نے گہرا اثر چھوڑا ہے جس کے نتیجہ میں وہ اپنی اہمیت سے واقف ہو گئے ہیں۔ حفیظ نے اردو میں رزمیہ شاعری کے اولیں خد و خال واضح کئے۔ موجودہ عہد میں فیض اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور تجریدی نظم گوئی میں ن۔م۔ راشد کو اولیت حاصل ہے۔

صدارت پاک روسی ثقافتی انجمن کے ایک اجلاس میں فیض احمد فیض کو انجمن کا صدر منتخب کیا گیا۔ ان کے علاوہ مسٹر ایم۔ اے خواجہ انجمن کے نائب صدر، مسٹر اے۔ ایس لاکھانی جنرل سکریٹری چنے گئے۔ مجلس عاملہ کے ارکان میں مسٹر فخر الدین ابراہیم، مسز نیر شہاب، مسٹر ایس۔ اے ولی اور ڈاکٹر ایم۔ آر خاں شامل ہیں۔

پریس کلب کراچی پریس کلب نے موسم برسات کے وسط میں ایک مشاعرے کا انعقاد کیا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ چند ایک بیرونی شعرائے کرام بھی شریک تھے۔ صدارت کے فرائض ممتاز حسن نے انجام دیئے۔

جموں، اقبال اور شیکسپیئر جولائی کے پہلے ہفتے میں مقبوضہ کشمیر کی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی کی جانب سے سرینگر میں شیکسپیئر کی صد سالہ برسی کی تقریب منائی گئی پروفیسر عبد القادر سروری صدر شعبۂ اردو و فارسی نے مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر محمد سلطان وانٹ صدر شعبۂ انگریزی، پروفیسر عبد الرحمٰن اور پروفیسر کینیتھ روڈ ورڈ نے شیکسپیئر کی مختلف فنی خصوصیات پر تقاریر کیں۔ اس تقریب میں شاعر ملت علامہ اقبال کی مشہور نظم شیکسپیئر ایک ہندو دوشیزہ نے ترنم سے پڑھ کر سنائی۔

ترجمہ پاکستان کے مشہور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے افسانوں کا روسی زبان میں ترجمہ کیا گیا یہ ترجمہ ایک نوجوان روسی مستشرق بی گلوئیف نے روسی سائنس اکادمی کی ایشیائی عوام کی ایک درس گاہ کے لسانیاتی پروگرام کے تحت کیا ہے۔ مذکورہ مترجم نے اردو روسی اور روسی اردو ایک ڈکشنری بھی مرتب کی ہے اور آج کل وہ روسی یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں کے لئے نصابی کتب بھی مرتب کر رہے ہیں اس کے علاوہ گلوئیف نے ایک مقالہ بھی لکھا ہے جس میں آزاد دور حالی سے لیکر دور حاضرہ کے ادیبوں اور شاعروں تک کی تحریروں اور کلام کے اقتباسات کے ساتھ تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے

۱۲۵ سال قبل یعقوب گرم نامی ایک جرمن نے اپنی زبان کی لغت کی تدوین کا کام شروع کیا تھا۔ اس کا بھائی بھی اسی کام میں … …

تھا۔ ان دونوں کی وفات کے بعد جرمن عالموں نے لغت کی تدوین کا سلسلہ جاری رکھا۔ گذشتہ جنگ عظیم کے دوران اس میں تعطل پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن فوراً ہی بعد دوبارہ کام شروع کر دیا گیا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس لغت کی تدوین کے سلسلہ میں مشرقی اور مغربی جرمنی کے عالم مشترکہ طور پر کام کر رہے ہیں۔ اب تک اس لغت کی ۱۳ جلدیں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہیں اور اب ان پر نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ یہ لغت جرمنی زبان کی مکمل ترین لغت ہو گی اور اس میں مندرجہ الفاظ، محاورے، روزمرہ اور اصطلاحات جرمنی کی تمام علاقائی بولیوں کو محیط ہوں گے۔

زندہ زبان وارسا یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے شعبے کا جو جریدہ شائع ہوتا ہے اس میں اُردو زندہ زبانوں کی فہرست میں نمایاں ترین درجہ رکھتی ہے۔ وارسا یونیورسٹی کا مذکورہ شعبہ اُردو کے ادب اور اس کی تاریخ کے سلسلہ میں اہم ترین تحقیقی کام کرنے میں مصروف ہے۔ یہاں اُردو کی تعلیم بھی مشرقی علوم کے طلباء کے لئے لازمی ہے۔

شام جولائی کے آخری ہفتے میں نوجوان غزل گو شاعر ظفر اقبال کے ساتھ اوکاڑہ میں ایک شام منانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں ضلع منٹگمری کے تمام سرکردہ علماء، شعرا اور دیگر اصحاب ذوق شریک ہوئے صدارت منٹگمری کے ڈپٹی کمشنر اور اُردو کے مشہور شاعر مسٹر مصطفےٰ زیدی نے کی۔ ان کے علاوہ منٹگمری سے مجید امجد، بشیر احمد بشیر اور جعفر شیرازی بھی اس تقریب میں شریک تھے۔

ناول نگار چارلس ڈکنز کی سائیکل ۱۵۰۰ روپے میں

ایک ونڈسر پینی فارونگ سائیکل، جس پر ایک چاندی کی پلیٹ پر کندہ ہے کہ "یہ سائیکل چارلس ڈکنز کی ملکیت ہے" حال ہی میں کرسٹی کے نیلام گھر میں تقریباً ۱۵۰۰ روپے میں فروخت کی گئی۔ خریدار کا نام مسٹر بیلے ہے انہوں نے انگلستان کی بنی ہوئی "ہڈیوں کو ہلا دینے والی" یہ سائیکل خطیر رقم کے عوض حاصل کی ہے اس سائیکل کے ٹائر لوہے کے ہیں مسٹر بیلے اس سائیکل کو عجائب گھر کی زینت بنانے کے حق میں ہیں لیکن وہ اس پر سواری کرنے کا خیال بھی ترک کرنے کو آمادہ نہیں ان کا خیال ہے "میں اسے ضرور چلا سکوں گا۔"

احتجاج اس ماہ بھی سندھ کے مقبول شاعر شیخ ایاز کے مجموعۂ کلام پر پابندی کے خلاف مختلف مقامات پر عوامی احتجاجات کا سلسلہ جاری رہا، ٹنڈو ڈویژن کی انجمن صحافیان کے ماہانہ اجلاس میں مسٹر پروانہ بھٹی کی زیر صدارت حکومت کو اپنے احکام پر دوبارہ غور کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ نیز پاکستان رائٹرز گلڈ کے جنرل سکریٹری مسٹر جمیل الدین عالی کی تجویز کو پسندیدہ قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ اس تجویز کی روشنی میں ملک کے دانشوروں کی کمیٹی سے اس سلسلے میں رائے طلب کی جائے۔

شکارپور میں بھی "بھونر بھرے آکاش" پر پابندی لگانے کے احکام پر کسی خوشگوار ردعمل کا اظہار نہیں ہوا، ایس۔ ایس۔ ایف یونین کے جنرل سکریٹری مسٹر اللہ داد بروہی نے کہا کہ مذکورہ کتاب پر جو پابندی لگائی گئی ہے وہ دراصل ادیبوں کی پیدا شدہ ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ درحقیقت اس مجموعۂ کلام میں فحاشی، وطن دشمنی یا فرقہ وارانہ نفرت پھیلانے والی کوئی بات نہیں ہے انہوں نے کہا کہ سابق سندھ کے محبوب شاعر کے مجموعۂ کلام پر پابندی لگنے سے ہمیں گہرا دکھ پہونچا ہے۔ شیخ ایاز سندھی زبان کے بہترین شاعر ہیں اور ان کا کلام ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔ جو ہمارے ادب کے لئے فخر و مباہات کا باعث ہے۔ آخر میں انہوں نے صوبائی گورنر ملک امیر محمد خاں سے درخواست کی کہ وہ اس کتاب سے پابندی اٹھا کر ملک کے دانشوروں کا اضطراب ختم کریں۔

شان الحق حقی

O

اہلِ ہمت کے لئے کام بہت ملتے ہیں
کام کے ساتھ مگر نام بہت ملتے ہیں

وحشتِ دل کا مداوا تو کہاں ہونا ہے
خاکِ آوارہ کو الزام بہت ملتے ہیں

تشنگی کا جو گلہ ہم نہیں کرتے ساقی
ہے یہ شہرت کہ ہمیں جام بہت ملتے ہیں

عالمِ راز ہے اک دور کی دنیا لیکن
کوئی سنتا ہو تو پیغام بہت ملتے ہیں

اہلِ طاعت کو ملا جانے خدا یا نہ ملا
اہلِ الفت کو تو اصنام بہت ملتے ہیں

روزِ روشن ہی میں ہو جاتے ہیں انساں نایاب
میکدے میں تو سرِ شام بہت ملتے ہیں

مرتے دم تک نہ ہو احساس گرفتاری کا
ایسے ایسے بھی یہاں دام بہت ملتے ہیں

کون دلدار تھا جو کافر و قاتل نہ بنا
اچھی صورت کو بُرے نام بہت ملتے ہیں

کاش مقدورِ اطاعت بھی اسی سے ملتا
جس کی سرکار سے احکام بہت ملتے ہیں

آگے آگے نہیں ان کا بھی بھروسا حقی
جیتے جی خیر سے دشنام بہت ملتے ہیں

احمد ہمدانی

دکھوں کی بات میں ہر لمحہ تازگی کیسی
ہم اس گلی سے اٹھا لائے یہ خوشی کیسی

صدا نہیں تو کوئی گونج ہی صداؤں کی
فضا میں آج یہ پھیلی ہے خامشی کیسی

جلے ہیں دور کہیں درد کے دیئے شاید
ہمارے گھر تلک آئی یہ روشنی کیسی

ردائے خواب میں لپٹے ہوئے سے دیوانے
تمہارے شہر کی صورت یہ ہو گئی کیسی

ہمارے واسطے خود ہی ملال کیا کم تھا
عطا ہوئی یہ زمانے کی دشمنی کیسی

زباں پہ حرف تمنا ہے رنج کا ہے کا
ابھی سے لہجے میں آئی فسردگی کیسی

قمر لدھیانوی

○

دل تجھے کیوں دسرِ بامِ تمنّا دیکھے
دل ہے کیا چیز چڑھے چاند کو دنیا دیکھے

ہے یہاں فکرِ شب و روز سے فرصت کس کو؟
کوئی دیکھے بھی تو کب تک ترا رستا دیکھے؟

یہ بھی اک طرفہ تماشا ہے بھری محفل میں
کوئی تنہا نظر آئے، کوئی تنہا دیکھے

تو وہ تصویر مصور بھی ہے نازاں جس پر
کس میں ہمت ہے ترا نقش سراپا دیکھے

کیوں مجھے جینے کے آداب سکھائیں احباب
کیوں مجھے اپنے ہی انداز سے دنیا دیکھے

یہیں جنت بھی ہے حوریں بھی ہیں غلماں بھی قمرؔ
شیخ رندوں میں اگر آئے تو کیا کیا دیکھے

ناصر زیدی

○

دیارِ شوق میں کوسوں کہیں ہوا بھی نہیں
وہ اُمس ہے کہ کوئی پات کانپتا بھی نہیں

خفا نہیں ہے مگر اس ادا کو کیا کہئے!
پکارتا ہوں تو وہ مڑ کے دیکھتا بھی نہیں

کہاں تلاش کریں جز ترے سکونِ نظر
کہ اس جہاں میں کوئی تجھ سا دوسرا بھی نہیں

بسا ہوا ہے مرے دل میں بوئے گل کی طرح
وہ دُور ہی سہی مجھ سے مگر جدا بھی نہیں

یہ کس مقام پہ تنہائی سونپتے ہو مجھے
کہ اب تو ترکِ تعلق کا حوصلہ بھی نہیں

کسے سناؤ گے تم مژدۂ سحر ناصرؔ!
وہ رت جگے ہوئے، اب کوئی جاگتا بھی نہیں

محمد رئیس

○

یہ کارواں ہیں عجب بے خبر، پریشان نظر
کہ چل پڑے تو ہیں رختِ سفر، نہ راہگذر

یہ تشنگی، یہ بیاباں سفر نصیب کی خیر
نہ ابرِ تر، نہ مسافر نواز کوئی شجر

اندھیری رات میں اک گمشدہ مکاں کی تلاش
ہے جستجوئے جمالِ حیات و ذوقِ نظر

سلگتی راہ، نہ چھاؤں نہ کچھ پڑاؤ کی آس
یہ قافلے تھکے ماندے، یہ ناتمام سفر

جنہوں نے لعل و گہر رہرووں کو لوٹے تھے
رئیسؔ راہ میں بیٹھے ہیں کب سے دست نگر

بقیہ:۔ علاقائی سرگرمیاں

جس کو پروفیسر عرش صدیقی سکریٹری رائٹرز گلڈ سب ریجن ملتان ترتیب دے رہے ہیں۔ عنقریب مارکیٹ میں آجائے گی۔

گلڈ کی تنظیمی خصوصیتوں نے ادیبوں میں اپنے آپ کو پہچاننے کا جو شعور پیدا کر دیا ہے اس کا ایک آدھ درخشاں مثال قابل ملاحظہ ہے۔

ہمارے ایک ادیب کو شہر کی ایک نیم سرکاری تہذیبی تنظیم کا رکن بننے کے لئے قرطاس رکنیت پُر کرنا پڑا تو اس میں ایک شق یہ تھی کہ آپ کا منصب کیا ہے؟ آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ انہوں نے اپنے تمام سماجی و معاشی مناصب کو نظر انداز کرتے ہوئے اس پر لکھا، "رکن ادارہ مصنفین پاکستان"

اسی طرح ایک اور شاعر ایک بہت بڑے سرکاری افسر سے ملنے گئے تو انہوں نے اپنے نام کی جو چٹ اندر بھجوائی اس کے نیچے لکھا ہوا تھا "رکن ادارہ مصنفین پاکستان"۔

یہ باتیں بظاہر چھوٹی چھوٹی ہیں، لیکن یہی چھوٹی باتیں ہی اس امر کی غماز ہیں کہ رائٹرز گلڈ ادیبوں کی سربلندی کا جو عظیم مقصد پیش نظر رکھے ہوئے ہے، اس کے مخلص اور لگن رکھنے والے اراکین کی ہمتوں سے وہ بطریق احسن پورا ہو رہا ہے۔

سالگرہ

نمبر

۱۹۶۵ء




دورانِ خون کے
حیرت انگیز حقائق!
کیا آپ جانتے ہیں کہ
• ہمارے خون میں ۳۰ ہزار ملین سرخ ذرات ہوتے ہیں۔ اُن کی فنا و بقا کا سلسلہ ہر لحظہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ محض ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ ذرات ختم ہو کر اُن کی جگہ نئے ذرات پیدا ہو جاتے ہیں۔
• ہمارا خون ایک لاکھ میل لمبی شریانوں اور وریدوں میں چودہ ہزار پائنٹ یومیہ کے حساب سے گردش کرتا ہے حالانکہ ہمارے جسم میں صرف چودہ پائنٹ خون ہوتا ہے۔
• ہمارے خون کی اقسام اس قدر ممیز اور متعدد ہیں کہ انگوٹھے کے نشان کی طرح ان کی الگ الگ شناخت ممکن ہے۔
• ہمارا خون ہر وقت جراثیم سے برسرِ پیکار رہتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں جو فاسد مادے پیدا ہوتے ہیں اُن کو جسم سے خارج کرتا رہتا ہے اس کارکردگی پر بیماری سے بچاؤ کا انحصار ہے۔
صافی کے مستقل استعمال سے خون کی اس قدرتی کارکردگی کو تقویت پہنچایئے۔
صافی خون کو فاسد مادوں سے پاک کرتی ہے اور اس طرح سرخ ذرات کی پیدائش اور افزائش کے موانع کو دور کر کے صحت کو برقرار رکھتی ہے۔
صافی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
SAFI
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان


والے
١٦ افسانے

ہم قلم

سالگرہ نمبر

جلد ۵

شمارہ .... ۷، ۸

فروری۔ مارچ ۱۹۶۵ء

سالانہ چندہ: ۶ روپے
قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ

(اراکین ادارۂ مصنفین سے ۵ روپے)

ادارۂ مصنفین پاکستان
پاکستان رائٹرز گلڈ
اسٹریچن روڈ — کراچی

یہ نگاہیں —— آپ کا سہارا چاہتی ھیں

پریمیئر انشورنس کو
موقع دیجئے کہ وہ آپکے
اپنے اور آپکے پیاروں
کے مستقبل کو سنوارنے
کے کام میں آپ کا
ہاتھ بٹائیں۔

حسب ذیل پتے
پر خط لکھئے یا فون
کیجئے (فون نمبر
۸۰۷۵۱ - پانچ لائنیں)
ہمارا نمائندہ فوراً
حاضر ہوکر زندگی کے
بیمے کا بہترین پلان
پیش کرے گا۔



پریمیئر انشورنس کمپنی آف پاکستان لمیٹڈ

پریمیئر انشورنس بلڈنگ، ویلس روڈ، اوف میکلوڈ روڈ، کراچی

اہم سرکاری مطبوعات

نام کتاب		قیمت فی کتاب (روپے/پیسے)
(۱) کونسٹی ٹیوشنل ڈاکومنٹس (جلد اول)		۲۰/ ۳۷
(۲) ”	(جلد دوم)	۱۸/ ۸۷
(۳) ”	(جلد سوئم)	۱۳/ ۳۷
(۴) ”	(جلد پنجم)	۸/ ۱۲
(۵) مینول آف امپورٹس اینڈ ایکسپورٹس کنٹرول		۵/ -
(۶) پاکستان بجٹ ۶۴-۱۹۶۳ء		۴/ ۱۲
(۷) الیکٹری سٹی سپلائی آف پاکستان اسٹیٹسٹکس ۱۹۵۸ء		۳۳/ ۲۵
(۸) فورین ٹریڈ اسٹیٹسٹکس آف پاکستان (امپورٹ) جلد دوئم - جولائی - دسمبر ۱۹۶۰ء		۶۲/ -

ان مقامات سے حاصل کی جاسکتی ہیں

(۱) منیجر آف دی پبلیکیشنز گورنمنٹ آف پاکستان
بلاک نمبر ۲۲ - شاہراہ عراق کراچی

(۲) مغربی پاکستان کی تمام منظور شدہ ایجنسیاں

ہم قلم

سالگرہ نمبر

جلد ۵

شمارہ .... ۸،۷

فروری - مارچ ۶۵ء

سالانہ چندہ: ۶ روپے

قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ

(اراکین ادارۂ مصنفین سے ۵ روپے)

ادارۂ مصنفین پاکستان

پاکستان رائٹرز گلڈ

اسٹریچن روڈ — کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوقِ انسانی پر ایمان رکھتے ہیں جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جن کے بغیر تخلیقِ ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حُبِ وطن کی قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے کماحقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرہ کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری قبول کرتے ہیں۔ جس میں سب کے لئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں اور جہاں دولت و اقتدار انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں اسی لئے ہم علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوشحالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا۔)

فہرست

طابع ناشر و مدیر جمیل الدین عالی نے انٹرنیشنل پریس کراچی سے چھپوا کر ادارۂ مصنفین پاکستان کراچی سے شائع کیا

جمیل الدین عالی

خطبہ بجائے اداریہ

جناب مہمانِ خصوصی، خواتین و حضرات !

یہ بات میرے لئے باعثِ مسرت ہے کہ میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی چھٹی سالگرہ کے موقع پر آپکا انتہائی گرم جوشی سے خیر مقدم کروں ۔ جنابِ جسٹس مرشد ! ہم خصوصاً آپ کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے ذاتی مصروفیات اور بیرونی کانفرنسوں کی پابندی کے باوجود ہمیں وقت دے کر سرفراز فرمایا۔ ہم آپ کو اپنے درمیان پاکر محض اس لئے مسرور نہیں کہ آپ ہماری ہر دلعزیز اور مقتدر عدلیہ کے ایک معزز رکن ہیں، بلکہ اسلئے بھی کہ ہمارے عظیم ملک کے علمی افق پر آپ ایک درخشاں ستارے کی طرح فروزاں ہیں۔ آپ نے علوم و فنون کی سرپرستی فرما کر مشرقی پاکستان کے متعدد اداروں اور افراد میں ثقافتی سرگرمیاں پیدا کر دی ہیں۔ آپ کے وسیع علم، ادب عالیہ سے شیفتگی اور عصرِ حاضر کے ادبی رجحانات کی قدر و منزلت نے ہمیشہ ان لوگوں کو متاثر کیا جنہیں آپ سے قریب رہنے اور آپ کے ادبی مشاغل کو دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر از حد خوشی ہے کہ آپ اس مرتبہ پاکستانی دانشوروں کو ہمارے پلیٹ فارم سے مخاطب فرما رہے ہیں ۔

جناب عالی !

ابھی ابھی ایک کتابچہ تقسیم ہوا ہے، جس سے گلڈ کی تشکیل اور سرگرمی کا ایک ہی نظر میں اندازہ ہو جائے گا اور میں اس مطبوعہ شئے کا نہ اعادہ کروں گا نہ آپ اپنی تعریف کروں گا ۔ اس لئے کہ اگر گلڈ تعریف کا مستحق ہے تو اس کی تعریف دوسروں کا کام ہے۔ بہرحال، دو صفحہ پر مشتمل اس رسالے کے پس پردہ ہمارے اعزازی عہدیداروں کی خصوصاً اور ارکین کی عموماً ایک ایسی تاریخ جانفشانی مضمر ہے جسکے بغیر یہ ادارہ ہمارے عزائم و مقاصد کو پورا کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ میں اس موقع پر ان سبھوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس ادارے سے صبر آزما دلچسپی لی ۔

میں ان لوگوں کا بھی احسان مند ہوں جو ہمارے اغراض کو پورا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔ وزارتِ قو
حکومتِ پاکستان، وزارتِ تعلیم حکومتِ مغربی پاکستان نیشنل بینک آف پاکستان، خانوادۂ آدم جی اور داؤد ہمارے شک
کے مستحق ہیں کہ ان سبھوں نے ہمیں ہر سال امداد دینے کا انتظام فرمایا۔ ورنہ اس کے بغیر ہمیں سارے ملک میں اپنے منصوبو
پایۂ تکمیل تک پہنچانا اور ادبی تحریک قائم رکھنا بے حد مشکل ہوتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے مطالبات زیادہ ہیں۔ ہم حکو
عوام سے زیادہ سے زیادہ مالی اعانت طلب کرنے میں حق بجانب ہیں۔ حکومت خود ہمارے اپنے محصولات کی محافظ
ہمارا اِدارہ ملک میں اپنی نوعیت کا واحد اِدارہ ہے جس نے اپنے دستور کے تحت بیرونی حکومتوں، ایجنسیوں اور افراد
قِسم کی بھی مالی اعانت حاصل کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اس انوکھے انکار کا سبب محض ہمارا بنیادی رویہ ہے کہ ہم ایسا کوئی
اختیار کر کے اپنی ذہنی آزادی کو مفلوج نہ ہونے دیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اِس رویّہ کی بناء پر ہمیں اکثر موقعوں پ
نقصان اُٹھانا پڑا ـــــ لیکن یہ اصول، یہ فیصلہ ہمیشہ ہمیں عزیز رہا۔ اور اب یہ اس ملک کی حکومت اور اہلِ ثروت پر منحص
کہ وہ ہمارے مقتدر فیصلے کا پاس رکھتے ہوئے ہمارے نقصانات کی تلافی کریں۔ ممکن ہے آپ باہر سے مشینیں، تیل نکالنے
انجن، دودھ کے پاؤڈر درآمد کرنا ضروری سمجھتے ہوں۔ لیکن ہم یہ ہرگز ماننے کو تیار نہیں کہ آپ ایک ایسی قوم کے لئے بیرونی
درآمد کرنا بھی ضروری سمجھیں گے، جسکا دنیا کی ثقافتی میراث میں خود ہی بڑا اہم حصّہ ہو اور جسکے پاس خود برآمد کرنے کے لئے
ثقافتی ذخیرہ موجود ہو۔ اگر مجھے رائے دینے کی اِجازت ہو تو میں نہایت عاجزی کے ساتھ عرض کروں گا کہ ایکسپورٹ پرو
بیورو پاکستانی، ادب علم و فن اور کلچر جیسی چیزوں کو بھی برآمدی اشیاء کی فہرست میں شامل کرے۔ بیرونی ممالک کا دورہ کرنے کے
میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ عالمی منڈی میں پاکستانی اشیائے فکر و ثقافت کی سخت ضرورت ہے۔

خواتین و حضرات!

ہم اپنی اس ناکامی سے بخوبی آگاہ ہیں کہ اس چھ سال کے عرصہ میں ہم نے دریائے ٹیمز کو نذرِ آتش نہیں کر دیا۔ ابھی ہم
بہت کچھ کرنا ہے۔ ہماری تمام سرگرمیاں، ہمارا لائحہ عمل، ہماری عمل گر تکلیف وہ انتخابی کارروائیاں اور ہمارے بیرونی روابط تو محض اس
مشین کے چند پُرزے ہیں جو اپنے منشور اور گِلڈ کے دستور کے اہم مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے وضع کئے گئے ہیں۔ ہم
پوری توقع ہے کہ مستقبل میں یہ اِدارہ ان فرائض کی تکمیل بخوبی کر سکے گا، جن کے لئے ہم نے اسے استوار کرنے کی انتہائی کوشش
کی ہے۔ گِلڈ ہنوز عالمِ تشکیل میں ہے اور خاص دیکھ بھال کا مستحق! ۔ یہ اِدارہ ایک ایسے عزیز اور ہونہار بچّے کی مانند ہے
جس کی نگہداشت نہایت ہی خلوص اور ہوشمندی کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ مجھے یہ دیکھ کر ازحد مسرت ہوئی کہ اس سال ہمارے
اراکین نے انتخابات میں کافی دلچسپی لی۔ ہمارا طریقۂ انتخاب ہی وہ اہم بنیاد ہے جس پر یہ اِدارہ قائم و دائم ہے۔ ہمارے انتظ
سے وابستگی کے لئے کسی فرد کا اوّل ادیب ہونا لازمی ہے۔ ہمارے عہدے صاحبانِ اقتدار یا صاحبانِ زر کو ان کی عظمت کے پیشِ نظر
سُپرد نہیں کئے جاتے۔ یہ اصول بھی ہمیں مہنگا پڑا لیکن ہمارا ایمان ہے کہ دولت و اقتدار کو انسانی قدروں اور روحانی تصور
ماتحت ہونا چاہیئے نہ کہ برعکس! ۔ میں اپنے جانشین کارکنوں سے مخلصانہ توقع رکھتا ہوں کہ وہ گِلڈ کی اس روایت کو ختم نہ ہو
دیں گے۔

جنابِ عالی!

مختلف زبان، خیالات اور رجحانات کے ادیبوں کو ایک مشترک مقصد کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا کوئی آسان کا

ستراکی دنیا سے باہر یہ ایک بے مثال تجربہ تھا جواب تک خاصا کامیاب ہے۔ اس کامیابی کا خاص سبب یہ ہے کہ جہاں ہم نے اراکین کے انفرادی، سیاسی اور ثقافتی رجحانات پر پابندی نہیں لگاتے وہاں ہم اس امر کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ گلڈ کسی سی اور نظریاتی نزاع کا اکھاڑہ بن جائے۔ ہمارا واحد نظریہ "نظریۂ پاکستان" اس کا استحکام اور اس کی عظمت ہے۔ اور ایسے شمار طریقے ہیں جن کے ذریعہ ہم بغیر کسی نزاع کے بھی وطن کی خدمت کر سکتے ہیں۔ یہاں اس امر کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پہلے آٹھ ممبروں میں سے، جو قومی اسمبلی کے رکن ہیں، چار سرکاری پارٹی میں ہیں اور بقیہ چار حزبِ اختلاف سے تعلق رکھتے ہیں۔ صاحب مرکزی وزیر ہیں اور ایک صاحب حزبِ اختلاف کے ڈپٹی لیڈر مگر . . . . آج بھی جب کو ان کے مشترکہ تعاون کی ضرورت پیش آتی ہے، وہ سب نہایت ہی ذوق و شوق کے ساتھ باہم مل کر سارے مسائل حل کرنیکی شش کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہمارے اراکین و عہدیداران آئندہ بھی ذاتی اختلافات کے باوجود اس رنگِ اتحاد کو برقرار رکھیں گے۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ جب ہم اپنے ذاتی میلانات کو گلڈ کے معاملات میں مخل ہونے نہیں دیتے، تو پھر غیر ملکی اثرات کو، اس دور میں عام ہیں، کیونکر قبول کر سکتے ہیں۔ مجھے توقع ہے کہ ہمارے غیر ملکی دوست ہماری اس حیثیت کو نہ صرف سمجھیں گے بلکہ اسکی بھی کریں گے۔ جب کبھی ضروری ہوا ہم انھیں اپنا تعاون پیش کرتے رہے اور ہم نے ان کے تعاون کا بھی خیر مقدم کیا ہے لیکن ان کی کسی ثقافتی جارحیت یا مدافعت کی جنگ میں حصہ لینے کے روادار نہیں، جو بیرونی ممالک میں عام ہے۔ ابھی اس سلسلہ میں میرا کچھ اور کہنا مناسب نہیں !!

جنابِ والا !

دوسری آزاد جماعتوں کی مانند ہم بھی اندرونی اختلافات رکھتے ہیں اور ہمیں بھی دوسری ابھرتی ہوئی جماعتوں کی طرح بیرونی طوفانوں کا سامنا ہے۔ ہم ایسے بہت سارے طوفانوں سے بچ کر نکل آئے ہیں، جنھوں نے ہمارے وجود کو ہی خطرہ میں ڈال دیا تھا۔ اس شخص کی حیثیت سے جو روزِ اول سے اس ادارے کے تمام امور سے وابستہ رہا ہے، آئندہ آنے والے طوفانوں کے آثار بھی دیکھ رہا ہوں۔ لیکن میں یہ پیشن گوئی بھی کروں گا کہ گلڈ ان پر بھی فتح پائے گا — ہاں، اسکے لئے گلڈ کے اراکین کو اپنے مقاصد پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپس میں متحد رہنا ہوگا۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ کم از کم ادیبوں کو یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہیئے۔ میں یہاں اس موضوع پر مزید بحث نہیں کروں گا، اسلئے کہ عام طور سے ایسے امور پر تفصیلی غور و خوض ہم اپنی مجلسِ عاملہ اور مجلسِ عاملہ میں کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات !

روایت ہے کہ ایسے جلسوں میں پچھلے سال کی اہم کارروائیوں کی رپورٹ پیش کی جائے۔ میں ان میں سے چار کا تذکرہ کروں گا۔ ایک تو ہمارا وجود ہے۔ جب نومبر ۱۹۶۲ء میں جناب قدرت اللہ شہاب وطن سے باہر تشریف لے گئے تو ہمارے چند احباب نے خوشی خوشی ادارے کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ بعض نے مراثی بھی شائع کئے۔ بہر حال خدا نے گلڈ کی مدد کی اور اب یہ پہلے سے کہیں زیادہ مستحکم ہے۔ دوسری قابلِ ذکر بات نیشنل بینک ادبی انعام ہے جو گذشتہ اگست میں قائم ہوا پچیس ہزار روپے سالانہ کا مستقل انعام ہے۔ اس کے لئے ہم نیشنل بینک کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کے شکر گذار ہیں، خصوصاً اس کے منیجنگ ڈائریکٹر جناب ممتاز حسن کے، قوم کی عظمت کی خاطر پاکستان میں ادبی اور سماجی مشاغل کے ہمیشہ ہی خواہ رہے ہیں، سرکاری طور سے بھی اور ذاتی حیثیت میں بھی۔

گذشتہ جولائی میں ایفرو ایشائی ادیبوں کے وفد کا ورود ہمارا تیسرا کارنامہ تھا۔ ہماری تاریخ میں پہلی مرتبہ اپنے وطن میں

ایفرو ایشائی ہم قلم دوستوں کا وفد آیا تھا۔ مقامِ مسرت ہے کہ اس واقعہ نے ہمارے باہمی تعلقات کو اور بھی قوی کر دیا۔

حسبِ معمول ہم نے اپنے مرحوم اراکین کے خاندان کی کفالت کے لئے اقدامات کئے لیکن وسائل کی قلت نے ہمیں اس امر کا موقع نہیں دیا کہ ہم ان سب کی خاطر خواہ خدمت کر سکیں۔ تاہم ایک موقع پر ہم نے اپنی مدد آپ کی روایت قائم کی۔ بایں ہمہ حکومت پر بھی زور دیا گیا کہ وہ اس مقصد کی تکمیل کے لئے اِمداد میں اضافہ کرے۔

گذشتہ سال ہم نے اپنے اراکین ناصرہ جلیبدی مرحوم اور نظر حیدرآبادی مرحوم کے مداحوں کی مدد سے ایک مقامی مشاعرے کا اہتمام کیا تھا جس میں شریک ہونے والے بہت سے شعراء نے بھی ٹکٹ خریدے تھے۔ اس کی نقد آمدنی ۲۶ ہزار روپے ہوئی، جسے مرحوم دوستوں کے خاندان والوں کے سپرد کر دیا گیا۔ ممکن ہے متمول طبقے کی نظر میں اس کام کی کوئی وقعت نہ ہو۔ مگر مجھے ذاتی طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے یہ بڑا ہی اہم کارنامہ تھا۔ مجھے اس بات کا اشتیاق ہے کہ آرام دہ کرسیوں پر متمکن دانشور اور ڈرائنگ روم میں بیٹھنے والے شاعری کے مُربّی کیا کبھی انسانی مسائل پر عملی ہمدردی کے اقدامات پر بھی غور و خوض کریں گے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ انھیں ایسا کرنا چاہیئے۔ یہاں اپنی رائے زنی کے لئے آپ سے معافی چاہتے ہوئے اپنے اس یقین کا اظہار کر دوں کہ میری ناچیز رائے میں چند سال تک ادیبوں کے خاندان کی کفالت ایک ایسی بزمِ مباحثہ سے کہیں افضل ہے جہاں آپ محض تفریحی یا نظریاتی تحریریں پڑھتے ہیں۔ بہرکیف، اس وقت اس خیال کی زیادہ وضاحت مناسب نہیں۔

ہماری علاقائی شاخوں نے ایک ناخوشگوار واقعے کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ گذشتہ موسمِ گرما میں سندھی کے ایک انعام یافتہ مجموعۂ کلام پر بغیر کسی اطلاع یا عدالتی نوٹس کے، پابندی عائد کر دی گئی۔ ہم نے صوبائی حکومت سے درخواست کی کہ وہ اس معاملہ کو سندھی زبان کے ایسے تین یا پانچ ادیبوں کے سپرد کر دے، جن کی شخصیت و دیانت پر اسے اعتماد ہو، یا پھر کسی قانون داں کا فیصلہ حاصل کرے۔ اسلئے کہ ہم اِن چھوٹے چھوٹے افسروں کی، جو حکومت کے محکموں میں محتسب بن کر بیٹھے ہیں، ملائےعالیہ ماننے کو ہرگز تیار نہیں۔ مجھے نہایت افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری اس درخواست پر اب تک غور نہیں کیا گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ صوبائی حکومت سندھی کے ایسے تین یا پانچ ادیبوں کا انتخاب کر سکے گی جن کا صحیح فیصلہ، علمیت، اخلاقی جذبہ اور حب الوطنی ان افسروں سے کسی طرح کم نہ ہوگی، جو اس کتاب کو مخربِ اخلاق یا منافیٔ وطن قرار دیتے ہیں۔ بدقسمتی سے میں اس معزز زبان سے واقف نہیں، لیکن مجھے اس بات کا علم ہے کہ بہت سے سندھی بولنے والے اس فیصلہ کو یکطرفہ اور غلط قرار دیتے ہیں۔ میں گورنر مغربی پاکستان سے اپیل کرونگا کہ وہ اس معاملہ کی جانب ذاتی توجہ مبذول فرمائیں اور تمام کاروائیوں کا وسیع پیمانے پر جائزہ لینے کا حکم صادر فرمائیں۔ اگر ان ماہروں نے کتاب کو واقعی مخربِ اخلاق قرار دیا تو ہم خود بھی مصنف کو موردِ الزام قرار دیں گے کیونکہ ہمیں خود اس امر کا اعتراف ہے کہ آزادیٔ رائے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ مخربِ اخلاق خیالات اور ملک دشمن عناصر کی تشہیر کی جائے۔ بایں ہمہ ایک مصنف کو پرکھنے کیلئے آپکا صحیح قاری ہونا لازمی ہے۔ ہر ایک کو یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ کسی ایک کتاب یا تمام کتابوں یا تمام تحریروں پر چھوٹے بڑے افسروں کے حکم سے پابندی عائد ہو سکتی ہے لیکن ادیبوں کی روح و مقید نہیں کیا جا سکتا۔ ابھی تک اس مقصد کے لئے دنیا میں کہیں بھی ایسا کوئی قانون یا آلہ ایجاد نہیں ہو سکا ہے۔

جنابِ مہمانِ خصوصی، خواتین و حضرات!

مجھے افسوس ہے کہ خطبہ خاصا طویل ہو گیا ہے۔ آپ نے یقیناً یہ محسوس کیا ہوگا کہ میں نے کلیات و مسلمات کی زبان میں گفتگو کرنے سے دانستہ گریز کیا ہے۔ اسکا سبب واضح ہے۔ میں ایسی باتیں کرنے کا اہل نہیں ہوں اور آپ نے کوئی ایسا گناہ بھی نہیں کیا جسکی سزا میں آپکو مجھ سے ایسی باتیں سننی پڑیں۔
آپ نے جلسہ میں شرکت فرما کر ہمیں جو اعزاز بخشا ہے، اسکے لئے ہم دوبارہ آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

ادارۂ مصنفینِ پاکستان کی چھٹی سالگرہ کے موقع پر

صدرِ مملکت کا پیغام

ایوانِ صدر۔ راولپنڈی
۲۸ جنوری سنہ ۱۹۶۵ء

میں پاکستان رائٹرز گلڈ کو، اس کی چھٹی سالگرہ کی تقریب کے موقع پر، انتہائی مسرت کے ساتھ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

قوم کے اتحاد اور استحکام میں ادیبوں کے کردار کی اہمیت نمایاں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس موقع پر آپ لوگ دوبارہ اس مقدس کردار کے لئے خود کو وقف کرنے کا ایک بار پھر عہد کریں گے۔

آپ کے گذشتہ اجتماع کے بعد، پاکستان میں قابلِ قدر سماجی اور اقتصادی ترقی ہوئی ہے۔ قوم ایک مکمل اور بھر پور زندگی کے حصول کے لئے زبردست جدوجہد کر رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ اپنی تخلیقی لگن کی تکمیل کے ساتھ ساتھ قومی اتحاد اور قومی تعمیرِ نو کے لئے بھی کام کریں گے۔

میں آپ کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں۔

(دستخط)

فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں

(ترجمہ)

خطبۂ صدارت

(مسٹر جسٹس سید محبوب مرشد چیف جسٹس ہائیکورٹ مشرقی پاکستان)

جناب قائم مقام سکریٹری جنرل، اراکین ادارہ مصنفین پاکستان

خواتین و حضرات:

ادارۂ مصنفین پاکستان کی سالگرہ کی تقریب میں شمولیت میرے لئے انتہائی فخر کا باعث ہے۔ اس ادارہ کا قیام ایک بنیادی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس میں پاکستان کے ادارۂ ملی برائے ادب و فن بن جانے کے امکانات مضمر ہیں۔ اس وجہ سے یہ موقع بہت مبارک ہے۔ یہ ایک نوخیز ادارہ ہے۔ ادارے کی عمر میں کوئی سال گزرتا جاتا ہے۔ ایسے ہر مبارک دن کو اور بھی زیادہ پائیدار اہمیت کے ساتھ ہمارے دلوں میں متمکن کئے جاتا ہے اس سفر کے سلسلے میں ہر سال ہی سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے جب کہ ہم ادارے کے مقاصد پر اتفاق کی دوبارہ تائید کرتے اور خود کو ایک بار پھر ان اور شعور کے لئے وقف کر دیتے ہیں۔ جو اس کو معرض وجود میں لانے کا باعث ہوئے۔ ہر سال منظر زمانہ پر ایک علامت توقف ہے جو تھوڑی دیر تک کر معنوی جائزہ لینے اور دم لے کر آگے بڑھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس تقریب میں شمولیت کی دعوت دی۔ میں اپنے گرد و پیش مشعل برداران حق۔ مبلغین اخلاق، مفسران روحانی، متشکلین اذہان، معلمین حیات سفیران سلف، مشاہدین خواب اور ہنرمندانِ الفاظ کا ہجوم پاتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں تاریخ کے سحر نگار موقع پر ادب کی محفل میں شریک ہوں تعظیم و تکریم کا احساس لئے ہوئے جو انسان نغمات سرمدی کے ایک عظیم ہیکل میں پہنچ کر محسوس کرتا ہے۔ وہ نغمات جو اعماق روح تک ایک دعا بن کر پہنچتے ہیں۔ مجھے علم و فضل میں زیادہ دستگاہ کا دعویٰ نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں کبھی کبھار تھوڑا بہت غور و فکر ضرور کرتا ہوں۔ لہٰذا نسخۂ استغفار اور آپ کی خدمت میں ایک ایسی طبع سیار کے افکار پریشاں پیش کرتا ہوں، جو ایسے میدانوں میں جا سکتی ہے جن پر نہ اس کے مالکانہ حقوق ہیں اور نہ حقوقِ آمد و رفت۔ یہ افکار گاہ گاہ ایسے علاقے میں مداخلت ہیں جو تمام تر آپ ہی سے مخصوص ہے۔ اس لئے ان کی وضع و نوعیت لازماً فوقیہ ہے۔ میں نے محض چند اشارات قلم بند کرنے ہیں جو ممکن ہے ایک دائمی مسلک دعوت فکر کا باعث ہوں۔

ایک نقیب کی حیثیت سے زندگی مادی اعتبار سے تو اس کی سرگرمیوں میں چنداں توسیع کی اجازت نہیں دیتی لیکن روحانی و معنوی اعتبار سے کسی

ایسی حد بندی کا ہونا لازم نہیں جو اس کی تخلیق کی تبلیغ یا ابداع و اشکال کے اظہار میں سد راہ ہو۔ یہی حقیقت آج آپ حضرات میں میری موجودگی کا باعث ہوئی ہے۔ ادب انسان کو ایک آبرو مندانہ چیز قرار دیتا ہو کہ، اس صورت میں جبکہ اس کے پرستار روح کی دعوت پر لبیک کہنا ترک کر کے خالی پیٹ کی دعوت پر جو اپنی تسکین چاہتا اور اپنے بہکنے جانے کا تقاضا کرتا ہو۔ اسے ہرگز شعر و سخن کا مرتد نہیں بن جانا چاہئے۔ یہ صرف اس وقت ہی روح کے آہنگِ جمال کی عکاسی کرتا ہے اور تمام چیزوں کو مرگ و زوال کے چنگل سے نجات دلاتا ہے۔ جب کہ یہ دل بے قید و بند کی جاودانی روح سے سرشار ہو۔ اس کا وجود صرف اس لئے ہے کہ یہ خستہ جانوں کو تازگی بخشے۔ غم زدوں کو تسلی دے۔ افسردہ و ملول انسانوں کا حوصلہ بڑھائے۔ انسانوں کی دنیا میں دلچسپی اور لطفِ حیات کو دوبالا کرے اور اس کی روح کو مقاصدِ عالیہ کی آتشِ الٰہی سے فروزاں کرے۔ ادب زندگی کی پیش بینی ہے۔ یہ اس کی نقل نہیں اتارتا بلکہ اسے اپنے سانچے میں ڈھالتا ہے۔

حضرت سلیمان نے ہمیں حق کو خرید لینے کی ہدایت کی ہے لیکن بڑی دانشمندی سے یہ بتانے سے احتراز کیا ہے کہ اس کی قیمت کیا ہوگی۔ دو ہزار سال ہوئے پونٹیئس پائیلیٹ نے اس پر ایک ابدی سوال اٹھایا تھا بغیر اس کے کہ وہ اس کے جواب کا انتظار کرے۔ تاہم حقیقت کا ہر جزو بہرحال بیش بہا ہوتا ہے۔ یہ وہ دولت ہے جسے ہمارے آباؤ اجداد نے اپنے خون سے خریدا ہے۔ اگرچہ حقیقت، جیسا کہ زینو جانس نے کہا ہے، کسی کنوئیں کی تہ میں پڑی ہے، پھر بھی اس کی تلاش دشوار نہیں لیکن یہ چیز جوہروں کے بلوں میں نہیں پائی جاتی۔ حقیقت کی راہ ایک ایسی شاہراہ عام ہے جو سب لوگوں پر کھلی ہے۔ وہ فقط یہ مطلب رکھتی، یہی چاہتی ہے کہ اسے آشکار ہونے کی آزادی حاصل ہو۔ سورج کو اندھیرے سے بچانے کے لئے کسی تحریک کی ضرورت نہیں۔ یہ کچھ دیر گہنا جائے تو گہنا جائے لیکن اس کی روشنی کبھی بجھ نہیں سکتی۔

دورِ زمانہ جس کے جبڑے ہر چیز کو چبا چبا کر کھا جاتے ہیں حقیقت کے سامنے بالکل بیکار ہیں۔ انسان آتے اور گزرتے جاتے ہیں۔ نسلیں چلتی پھرتی پرچھائیاں ہیں مگر حقیقت ابدالآباد تک زندہ و پائندہ رہنے والی شے ہے۔ میں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ شمالی علم الاصنام میں حکمت کا خزانہ کہیں قوس قزح کے دوسرے کنارے پر واقع ہے سنا ہے حقیقت بھی وہیں کہیں پوشیدہ ہے۔ اس تک رسائی کی کوشش اپنے ساتھ بہت بڑا انعام لاتی ہے۔ ہم صرف کوشش ہی سے اس کے حسن حیرت آفریں کی جھلک پا سکتے ہیں۔ اور آخر تک بالاستقلال جستجو کئے جانے کے لئے تجسس کے مقدس ہونے پر یقین رکھنا لازم ہے بس ایقان کے بغیر طالب کہیں راستے میں ہی تھک کر رہ جائے گا۔ لیکن کوئی جویائے نور جس نے اپنا ہاتھ تحقیق کے ہل پر رکھا ہو کبھی پیچھے نہیں لوٹتا اس کا دل اسے اونچا ہی اونچا لئے جاتا ہے۔ اور وہ بڑے ہی جرأت مندانہ ناقابل شکست ارادے کے ساتھ چوٹی تک پہنچنے کی سعی کرتا ہے۔ اس کے سامنے پہنائے بے کراں موجود ہوتا ہے کہ اس کے سرِ افتخار کو نگوں کرے۔ لیکن وہ اپنی تحقیقات کو انجام کی منزل تک پہنچانے میں برابر سرگرم رہتا ہے۔

کسی فنکار، مفکر، فلسفی یا اہلِ فضل کو مایوس نہیں ہونا چاہئے اور نہ شکست خوردگی کا شکار ہونا چاہئے۔ یہ لوگ تو بت شکن ہیں اصنام باطل کے خلاف گرز۔ اس لئے وہ آسودہ خاطری کے لئے سامانِ آشوب ہونے کے باعث جو روایتی جمود کے قلعہ کو پاش پاش کر دیتا ہے، ناپسند کئے جاتے ہیں۔ لیکن یقین رکھئے آپ ایسے مردِ حق کو نذرِ صلیب کر سکتے ہیں۔ یا اس بیدلی کا شکار بنا سکتے ہیں جو بے اعتنائی کا نتیجہ ہو۔ لیکن اگر اس نے اپنی شمع کو حقیقت کے عرفانی شعلوں سے روشن کیا ہے تو اسے بجھانا ناممکن ہے۔

اربابِ فن سے میں اتنا ہی کہنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر آپ کا کام اچھا ہے، اگر یہ سچا ہے تو اس کی آواز ضرور سنی جائے گی۔ چھ دن، چھ مہینے، چھ سال، یا ممکن ہے وفات کے بعد اس کے کوکب کو عدم ہی میں اوجِ قبولی حاصل ہو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ کا کام، ہر سچے کام کی طرح اپنا صلہ خود ہے۔ صلہ جیسا کہ دنیا اسے سمجھتی ہے کام کا معاوضہ اس کے تابع ہے ——— آخری بات ہے جو فن یا ادب کے کسی طالب کو پریشان کرتی ہے۔

اگر دنیا کی تحسین یا صلہ کوئی معنی نہیں رکھتے تو پھر صاحب فن کا

تحریک کیا ہے؟ ایک ایسی زندگی جو تمام تر تلاشِ حق کے لئے وقف ہو۔ صرف اس ہی عظیم تلاش کی طفیل وہ بلند ترین مقاصد حاصل ہوتے ہیں جو انسانی جدوجہد کو تحریک دلاتے ہیں۔ پائجر کا قول ہے کہ "مبارک ہے وہ شخص جو ایک خدا کو اپنے ساتھ لے اور اس کی اطاعت کرے" وہ سب لوگ جو حقیقت کا علم بلند کرتے ہیں بھلائی ہی کا بول بالا کرتے ہیں۔ اگرچہ جن سمندروں پر وہ سفر کرتے ہیں جدا جدا ہیں لیکن ان کا ستارۂ منزل تمام ایک ہی ہے، خلاؤں میں اس قدر دور دور کھویا ہوا سہی ان سب کے راستے ایک ہی بن جاتے ہیں۔ وہ جہاں بھی ہوں ان کی بولی ایک ہی ہے کیونکہ یہ کسی کمزور لمحے کی آواز نہیں بلکہ ابدیت کی نوائے غیب ہے۔

ارسطو کا قول ہے کہ "فن کچھ تو اس چیز کو مکمل کرتا ہے جسے فطرت ادھورا چھوڑ دیتی ہے۔ اور کچھ فطرت کی نقالی ہے"۔ لیکن فن کار اپنی روح کے پردے میں سے قدرت کو بھانپ لیتا ہے۔ اس کی زبان محبت کی زبان ہے۔ ایسے الفاظ پر مشتمل جو اپنے اندر طاقتِ پرواز رکھتے ہیں۔

جب ستارے آسمان کی سقفِ نیلگوں پر ٹمٹماتے ہیں تو نفسِ انسانی سکون و سکوت کا جویا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ ان کا مطالعہ کرے۔ ایسے ہی وجدانی کیف کا عالم ہوتا ہے جب انسان خود کو لاانتہا کے روبرو پاتا ہے اس کی روح بلند ہو جاتی ہے اور اس پر ایسا ہی جذبہ طاری ہوتا ہے جس سے سرشار ہو کر حضرتِ داؤد نے اپنے خالق سے پوچھا تھا کہ "آدمی ہے کیا جو تو اس کی پروا کرے اور ابنِ آدم جس کی طرف تو آتا ہے۔" اگر ایسے برگزیدہ خیالات مغنّیِ زبور کے وجدان سے اس وقت ابھرتے تھے جب وہ آسمانوں پر نظر ڈالتا تھا۔ تو آپ کون سے الفاظ ان احساسات کی ترجمانی کے لئے کافی ہوں گے جو کائنات کے بے حد وسیع علم سے آج انسان کے مافی الضمیر سے پیدا ہوں۔

تخیّلِ انسانی ان بے پایاں کائناتوں کے شعور سے ملا سیر ہو جاتی ہے جن میں سے ہر ایک ہماری اس واحد کائنات سے جسے ہمیں مشاہدہ کرنے کی اجازت ہے کہیں زیادہ مہتم بالشان ہوگی۔ یہ تصور اپنی شان و شوکت میں کس قدر پرجلال ہے۔

تدبّر کے ان لمحات میں ہم پر ویسی ہی انوکھی کیفیات طاری ہو جاتی ہے۔ جن سے پلوٹارک اس وقت ایک جذبِ والہانہ سے سرشار ہو اٹھا جب وہ عالمِ تخلیق کے عجائبات پر غور کر رہا تھا۔ واقعی یہ کس قدر حیرت انگیز بات ہے کہ یہ ہوائیں، یہ پانی، یہ بادل، یہ بارشیں، وہ وسیلے ہیں، جن سے خدا تعالیٰ اپنی مخلوقات کو زندہ رکھتا اور ان کی پرورش کرتا ہے۔ وہ اپنے کاموں کے لئے انسانوں کو ذریعہ نہیں بناتا۔ یہ فرض کرنا بڑا ہی مناسب ہے کہ انسان تمام تر خدا تعالیٰ کی قدرت پر انحصار کرتے ہوئے اس کی ہدایت پر عمل کریں۔ اور اس کے منشا کو پورا کریں۔ بجائے اس کے کہ کمان ہستیوں کا حکم مانے اور نائے دیوتا اہلیانِ یونان کا۔ یہ وہ الفاظ ہیں جن میں پلوٹارک نے فن کاروں، شاعروں اور پیامبروں کے مقصد کی توضیح کی ہے۔

انسانوں کو ایک ایسا حیوان بتایا گیا ہے جو ابھی تک اپنے ماحول سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ جہاں تک اس کے طبعی ماحول کا تعلق ہے اس نے اس کے ساتھ اتنی ہی موافقت پیدا کر لی ہے جتنی کہ دیگر حیوانات نے۔ لیکن نقطہ طبیعیات ہی تو سب کچھ نہیں اور نہ یہ اس کے ماحول کا اہم ترین حصہ ہی ہیں۔ اس کی زندگی تو دراصل اس کے خیالات عقاید، اصولوں، تمناؤں، خوابوں اور وجدانی احساسات کی تسکین و تکمیل سے عبارت ہے جن میں وہ اپنی زندگی بسر کرتا ہے جہاں تک ان کا تعلق ہے وہ کبھی سکون آشنا نہیں ہوتا اور خدانخواستہ ایسا ہو جائے تو جو کچھ بھی ہم انسانی ترقی سے تعبیر کرتے ہیں، اس کا یک قلم خاتمہ ہو جائے گا۔

ایمرسن کہتا ہے "ہر سچا آدمی غیر مقلد ہوتا ہے" اس نے یہ الفاظ شرعی معنوں میں استعمال نہیں کئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسان میں ایک اچھی، ایک غیر معمولی، ایک عظیم بات ہوتی ہے جو واقعی عظیم کہلانے کی مستحق ہو۔ ایک بلند تر قانون اور عجیب تر احساس ان کو تسلیم کرتی ہے۔ اور اس کی فطرت کا یہ عنصر ہے جو قدرت کے نزدیک اس کی قدر متعین کرتا ہے۔

ہم میں سے اکثر اپنی روزمرہ زندگی کی بے کیف روش سے بالکل

ہوتے ہیں سوائے ایک نقطے کے جہاں کچھ خلش سی رہتی ہے۔ ایک بے چینی کا احساس۔ ایسا احساس جو ہمیں سرِ تسلیم خم نہ کرنے پر مجبور رکھتا رہتا ہے یہ خود فی کا مقام جہاں ہمارے اپنے اور دنیا کے لئے امید کا ایک دھندلا سا نشان ہوتا ہے، غالباً ہمارے وجود میں سب سے اہم بات ہے۔
آیئے ہم اس کو ایسا ہی روشن رہنے دیں، اس کو بھینٹ نہ چڑھنے دیں۔ اس کو سمجھوتے کی بھینٹ چڑھا دینے سے ایک وقتی مسئلہ تو حل ہو سکتا ہے لیکن جب یہ مفاہمت زندگی کے مقاصد کی تحدید کر دیتی ہے تو آسمان کی بلندیوں سے ایک ستارہ نیچے گر کر اندھا تاریکیوں میں غرق ہو جاتا ہے۔

خدائے تعالیٰ ہر نفس کو حقیقت اور طمانیت میں سے ایک کو چن لینے کا موقع دیتا ہے ہم جسے بھی چاہیں چن لیں۔ مگر ہم بیک وقت دونوں کو نہیں چن سکتے۔ صداقت ایک ایسی اقلیم نہیں، جسے معاہدہ کے ذریعے تقسیم کیا جا سکے۔

ہمارے اس بے کیف معمولِ حیات میں، ہمارے وجود کا ترین حصہ بت شکن ہے۔ جھوٹے معبودوں کا غارت گر۔ وہ اس صداقت کی تبلیغ کرتا ہے، جو اس پر نازل ہو، اور اس نئے صحیفے کا پرچار جس کی تعلیم دیتا ہے۔ ایک ایسا فریضہ جس سے اس کے ہم جنسوں کی ملامت جیسی بھی نہیں روک سکتی۔ آج ہم فکر و خیال کی ایک بہت توسیع کے حدود میں سے گزر رہے ہیں عظیم الشان کارناموں لامحدود امکانات کا دور۔ ہم ایک ایسے دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جب کہ خیالات کے نئے نئے دھارے اپنے ساتھ ایک حیرت ناک بیداری لے کر آئے ہیں جس کے مقابلے میں پندرھویں سولھویں صدی عیسوی کی شان دار نشاۃ الثانیہ طلوعِ سحر کی ایک دھیمی سی جھلک معلوم ہوتی ہے۔
لیکن ہمیں خلاؤں کی مہم سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اگر آئی بیل کی محرابیں ہماری روحوں کو اپنے سایۂ عاطفت میں ؟ آخر دور دراز عالم سیاروں میں پرواز کرنے سے کیا فائدہ ہے اگر وحدتِ مقصد کوئی بڑا اتحاد اور اشتراک مقصود ہمیں در رشتہ منسلک نہیں کرتا ؟

انسان کو لازم ہے کہ وہ بلند ہو اور ان اندھے حسیات پر فتح پائے جو اس کو نیچی راہ پر چلاتے ہیں۔ اسے اپنی عظیم الشان کامیابی میں اس بات کا دھیان رکھنا چاہیئے کہ اس کے اندر جو حق نما عنصر ہے وہ نہ مر جائے۔ اپنی تمام کامیابیوں میں گھر کر اسے یہ خطرہ در پیش رہتا ہے کہ کہیں وہ اپنی روحانی تاب و تواں نہ کھو بیٹھے جس سے وہ اس وقت بہرہ ور تھا۔ جبکہ وہ اس دنیائے آب و گل کی تسخیر کے لئے اٹھا تھا۔ اس لئے آشوب اور افراتفری کے ہنگامہ ہائے شور و شر میں ایک شبیہ جمال پیدا کی ہے۔ وہ اب بھی اپنی روح کی حرارت کو خلا کی بعید ترین گہرائیوں میں پہنچا کر ان کو الوہیت سے پُر کر سکتا ہے۔ اس کے سینے میں جو ابدیت کا شرار روشن ہے وہ اسے اب بھی یہ کہنے کی صلاحیت بخش سکتا ہے کہ "ہر طرف میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے"۔ دنیا کو اپنی دریافتوں پر بجا طور پر ناز ہے۔ انسان نے جوہر کے اسرار فاش کر دیئے ہیں۔ اس نے خلائے بعید میں سپوتنک پھینک کر دکھا دیئے اور وہ چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے پھر بھی نئی دریافتوں کی سرحد پر کھڑا نفسِ انسانی لاتعداد کائناتوں کے امکان پر سراسیمہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جن میں سے ہر ایک اس واحد کائنات سے زیادہ شاندار ہے۔ جس کی تحقیق و تفتیش کی اسے اجازت ہے۔ ابھی تو انسان فضا کے لامحدود کنارے تک بھی نہیں پہنچا۔ آج کے گویتھے کو اور بھی زیادہ دردناک حد تک منفی رہ کر اس یاددہانی کی ضرورت ہے کہ وہ آسمان کو غور کی نظر سے دیکھے
تکراروں اور تنازعوں کے درمیان جب ہم بابل کے معماروں کی طرح بے سود کوشش کرتے ہیں کہ اپنی بات دوسروں کو سمجھائیں، وہ وسیلہ جس سے ہم ایک مشترکہ مقصد کے لئے اس دیرِ خراب آباد سے فردوسِ بریں تک پہنچ جاتے برابر تشنۂ حصول، اور نا ممکن ہی رہتا ہے
ہمارا اسلامی مژدہ آج انیسویں صدی کی قوم پرستی کے بوجھ تلے ہارا ہوا انسان کو پہنچ رہا ہے اور ہمیں امید دلاتا ہے کہ ہم دنیا کو غلامی سے نجات دلا کر سربلند کرنے میں ایک موثر کردار ادا کر سکنے کے اہل ہیں اسلئے موجودہ کرۂ کے عالم میں نوعِ انسان اس دن کیلئے پکار رہی ہے جب یہ کہا جا سکے گا کہ
اب طبلِ جنگ نہیں بجتے اور کوئی علم لہراتے نہیں
اس انسانوں کی سنگت میں اس سارے جہاں کی وحدت میں

جہاں تک ادب کا تعلق ہے اقوامِ عالم میں دکسی تصادم کی حاجت ہے اور نہ ہونی ہی چاہئے۔ واحد تصادم جو ہمارے شایانِ شان ہے، وہ جیسا کہ ہر ملک میں ہے، روشن خیالی اور جہالت، نظم و ضبط اور انتشار کے مابین ہونا چاہئے۔

آئیے اب ہم اپنی قومی صورتِ حال کی طرف رجوع کریں۔ پاکستان مسلمانانِ برصغیر کے غیر متزلزل ایقان اور ایک ارضِ موعود کے شاندار تصور سے ہی پیدا ہوا جس میں ایک متبرک ماضی کی پاکیزہ خوشبوؤں کی بازیافت کریں۔ اس لئے نہیں کہ ہم اپنی سابقہ شان و شوکت کی یادوں میں کھوئے رہیں بلکہ ایک عظیم الشان مستقبل کی طرف قدم بڑھائیں۔

پاکستان کا مغرب زدہ اعلیٰ طبقہ جس کے ہاتھ میں ملکی قیادت کی عنان ہے اپنے آپ اور ان لوگوں میں ولولہ پیدا کرنے میں ناکام رہا ہے جن کی سربراہی کا وہ دعوے دار ہے۔

ہمارا اپنا نصب العین ہماری نظروں سے اوجھل ہوتا چلا گیا ہے۔ ہمارے مقاصد بیش از بیش ناکارہ ہوتے جاتے ہیں، اخلاق کو گھن لگتا جا رہا ہے۔ اور سمت و رخ کا احساس مفقود ہوتا جا رہا ہے۔

یہ ہمارے باشعور طبقے کا کام ہے کہ اس عظیم الشان اور بصیرت کی بدولت جس سے ہماری قومیت وجود پذیر ہوئی، اس صورتِ حال کو بامعنی بنائے۔

کہتے ہیں کہ ہر مذہب موجودہ دنیا اور آنے والی بادشاہت میں ایک وسیلہ کا کام دیتا ہے۔ اسلام میں یہ دونوں دنیائیں آپس میں مربوط ہیں۔ یونانِ قدیم میں انسان، معین، محدود۔ اور سیاسی نظامِ کائنات میں رشتۂ باہمی عقلِ کل تھی۔ نصاریٰ کے لئے حضرت مسیح اور مسلمانوں کے لئے؟ مردِ مومن میں راست بازی۔

مگر مادی ترقی کتنے ہی بلند درجہ پر کیوں نہ پہنچ جائے، اس کی انسان کی آزاد روح کی قلمرو میں دراندازی کبھی جائز نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ حیاتِ انسانی صرف خورد و نوش ہی سے عبارت نہیں۔ ہم انسانوں کی زندگی درختوں کی طرح نشو و نما پانا یا پودوں کی طرح اونچا ہونا نہیں اسے احساسِ آزادی سے بالیدہ ہونے

والی نا سیاتی چیز ہونا چاہئے۔ خیالات و تصورات کی اندھا دھند بھرمار محض بلند بانگ الفاظ ہی کا بے معنی شور و غل ہو سکتا ہے اور بس۔ مابعدیات کی طرح ادب میں بھی فکری افراط اور غریبی دونوں ساتھ ساتھ موجود ہو سکتے ہیں۔

ہم ایک ایسے دور سے تعلق رکھتے ہیں جو آزاد اور سرگرم فکر کا دور ہے

پھر بھی آزادیٔ فکر کی مقدار جس پر یہ دور ناز کر سکے بہت ہی متنازعہ فیہ ہے۔ صرف افکار و خیالات کا آزادانہ بہاؤ ہی تخلیقی جذبہ کو تحریک دلا سکتا۔ نابغہ کی روشنی کو تیز تر کر سکتا۔ شاعر کے دل میں ذوقِ نغمہ کو بیدار کر سکتا اور زندگی کو فن کے قبول اور حسن کی آب و تاب سے جلا دے سکتا ہے۔ اس آزادی کے بغیر وجدان کی جولانیاں ایک بے کیف جبر کی لامتناہی ظلمتوں میں دفن ہو کر رہ جائیں گی۔ حقیقت کی بہترین کسوٹی کی یہ اہمیت ہے کہ اس کے کھلے بازار میں پذیرائی ہو۔ یہ صرف خیالات کی آزادانہ تجارت ہی میں فروغ پا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ یاد رکھنا مناسب ہوگا کہ انسان صرف مادی قیود سے ہی آزاد نہ ہو بلکہ اسے محض ظاہری وضع و صورت اور عہد روایت کی دار و گیر سے بھی ذہنی آزادی حاصل ہو۔ ایک ایسی دنیا میں جسے ہم مبہم طور پر ہی جانتے اور سمجھتے ہیں: متضاد مطالبے چیخ چیخ کر ہمارا دامن کھینچتے ہیں۔ ہم سرگردانی کے عالم میں ان لوگوں کی طرف رخ کرتے ہیں جو ہمیں یہ بتلاتے ہیں کہ انہوں نے دشت سے باہر نکلنے کی کوئی راہ تلاش کر لی ہے۔ جب وہ لوگوں کو اپنے عقائد بلا حیل و حجت تسلیم کرنے پر آمادہ کر لیتے ہیں تو وہ اس کے گرد تفریح کے خواب آگیں جادو کا تانا بانا بن دیتے ہیں۔ لیکن یہ اس فکری نظام کا بار بار ناقدانہ معائنہ ہی ہے اور اپنے ان پرکھے عقیدہ کا دوبارہ محاکمہ کرنے پر آمادگی جس سے انسان اپنا حیوانی زندگی سے سربلند کر سکا ہے۔

قدیم ترین زمانے سے ہی الحاد کے علم بردار پیدا ہوتے رہے ہیں، ان سے مقاطعہ کیا گیا، انہیں جلا وطن کیا گیا، جور و ستم کا تختۂ مشق بنایا گیا، آوارہ کیا گیا، تہ تیغ کیا گیا۔ جب بھی وہ تحقیق کی کسوٹی

پہلو دے اُترے ہیں۔ انھیں مٹا دینا ناممکن ثابت ہوا ہے اور جو لوگ ان کے نئے خیالات کو دبا دینے میں کامیاب ثابت ہوئے وہ خود تباہ ہو گئے۔

ہم مفاہمت کے جوہر سے تجاوزات کو اسی حد تک دور کر سکتے ہیں۔ جس حد تک ہم اختلاف کے متحمل ہوں، اور فکر کی ناقابلِ برداشت صورت کو برداشت کرنے پر تیار ہوں جو ہمارے معاملات میں سب سے ناگوار اور ناپسندیدہ۔ اگر معاشرہ میں ایسا مزاج اور روشنی پیدا ہو سکے تو اسے انسانی آزادی کے تحفظ کے لئے ہمارے ناقص اداروں کی چنداں ضرورت نہیں رہے گی۔

جان کیٹس نے کہا ہے کہ جمال سرمایۂ راحت جاوداں ہے، اور ادب و فن کا مطمحِ نظر، تحقیقِ جمال اس کی دریافت ہماری تمام ادبی سرگرمیوں کا مقصود و منتہا ہے۔ حسن کے وہ گلہائے رنگ رنگ جو سرِ راہ بکھرے ہوئے ہوں، صاحبِ فن اُن سے ہمارے مشامِ جاں تک ایک ہوئے خوش گوار کا جھونکا بھیجتا ہے جو چپکے ہی چپکے ہمارے دل کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے، ایک روپہلی روپ دھار کر بعینہٖ آفتابِ سحر کی طرح معمورۂ آفاق میں نمودار ہو کر اپنی کرنوں کے ساحرانہ موقلم سے ہر چیز کا رنگ روپ بدل دیتا ہے اگر احساسِ جمال کی پر افشاں لہریں روحِ انسانی تک زر شگانِ سیار کی طرح شعری فیضان کے لمحات میں ہی آتی ہیں۔ پھر بھی یہ تمام تر شعرا کے ہاتھی دانت کے برجوں میں ہی جاگزیں نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہماری روز مرہ کی زندگی کی عام جولان گاہوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعینہٖ اسی خوش الحان قمری کی طرح جو آسمان کی بلندیوں میں نغمہ سرا ہوتی ہے۔ لیکن اپنا نشیمن معمولی سرو ہی کی شاخوں پر بناتی ہے۔ ادب کا کام یہ ہے کہ وہ حسن کی سراغ رسانی کرے۔ شیکسپیر کو درختوں میں گفتگو یاں سنائی دیں۔ رواں دواں ندی نالوں میں حکمت کے دفتر نظر آئے۔ پتھروں نے وعظ ہی وعظ سنایا اور ہر چیز میں اچھائی ہی اچھائی دکھائی دی۔ بلبلِ شیراز سعدیؔ کی بھی یہی کیفیت ہے۔ جنھوں نے اس خیال کی ترجمانی کی ہے:۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفترے ست معرفتِ کردگار

میں اس خطبہ کو اس دعا پر ختم کرتا ہوں کہ ادارۂ مصنفین پاکستان ایک ایسا اسلحہ خانہ ثابت ہو جس میں نہ صرف ماضی کی فتوحات کی نشانیاں محفوظ ہوں بلکہ تسخیر کے ہتھیار بھی ہوں اور اس سے ہر طرف ایسی روشنی پھیلے جس سے نہ صرف رعنائیاں اور دل آویزیاں نمایاں ہوں، بلکہ بعض اوقات وہ چیزیں بھی آشکار ہوں جنھیں ہم گوارا نہیں کرتے۔

یہ امر موجبِ مسرت ہے کہ میرے دوست جمیل الدین عالی نے ادارۂ مصنفین پاکستان کی نگرانی کا کام اپنے ذمہ لیا ہے۔ اس نے اپنے اس عظیم کام پر نہ صرف ایک نوجوان کے بہاریں تخیل کی رنگ آرائیاں صرف کی ہیں بلکہ اس کی توانا رجائیت کو بھی کام میں لایا ہے۔ اس کے گیتوں کے ترنم نے پاکستان کے دونوں دور دراز بازوؤں کو اپنے جادو سے مسحور کیا ہے۔ پھر وہی سحر نوا اور ہم اسے تہِ دل سے دعا دیں گے۔

حضرات! آپ کی تمام کوششوں میں تائیدِ ایزدی شامل ہو۔

پاکستان پائندہ باد!

(ترجمہ: رفیق خاور)

پیغام

جناب قدرت اللہ شہاب
سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ

پاکستان رائٹرز گلڈ کی چھٹی سالگرہ میرے لئے ایک ایسا موقع ہے کہ میں آپ سب کو، پہلا سکریٹری جنرل ہونے کی حیثیت سے الوداع کہوں۔

درحقیقت فرائض کا یہ ایک طویل سلسلہ تھا، لیکن اس تمام مدت میں کسی موڑ پر بھی ہم میں جوش و ولولہ سے بے نیازی نہیں آئی۔ جب میں گزشتہ چھ سال کا زمانہ یاد کرتا ہوں تو چند اطمینان بخش باتیں ملتی ہیں، ساتھ ہی کچھ تاسف بھی ہوتا ہے۔ مگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے کا اہل پاکر خوش ہوں کہ کہیں بھی ناکامی نہیں ہوئی۔

مجھے اس امر کا افسوس ہے کہ ادیبوں کا اپنا اشاعت گھر قائم کرنے کی اسکیم نے ہنوز عملی شکل اختیار نہیں کی۔ میں ایک ایسا اشاعت گھر قائم کرنے کا خواب دیکھتا تھا، جس سے ادیبوں کو زیادہ سے زیادہ رائلٹی حاصل ہو اور قارئین کو سستے دام میں کتابیں دی جا سکیں۔ گرچہ ہم اس سلسلہ میں کچھ کر دکھانے کے قابل نہیں ہوئے لیکن مجھے یقین ہے کہ آئندہ گلڈ کے مقاصد میں اسے بھی شامل رکھنا کارآمد ثابت ہوگا۔ اس اسکیم کو پایۂ تکمیل تک نہ پہنچانے کی نمایاں وجہ وسائل کی شدید کمی تھی۔ پہلے پانچ سال کے دوران تو حالت یہ رہی کہ جو آیا وہ خرچ ہو گیا اور اس معاملہ میں غلطیوں کا بہت کم دخل رہا ہے۔ لیکن کچھ قیمتی اثاثہ کے حاصل ہوتے ہی گلڈ کی صورت نمایاں ہو لی ہے اور میں اپنے جانشینوں سے یہ التماس کروں گا کہ وہ اس نامکمل کام کو اپنے ذہن میں ضرور رکھیں۔

اشاعت گھر کے قیام کے ساتھ ساتھ بچوں اور بالغوں کے ایسے ملک گیر ادب کے فروغ کا مسئلہ بھی تھا، جو سستا ہو اور تمام تر دلچسپ ہو۔ ہمارے ملک میں یہ میدان خطرناک حد تک خالی پڑا ہوا ہے۔ معاشی ترقی اور سماجی امور کی توسیع، اور تعلیمی مراعات کے ساتھ ساتھ اس ضرورت کو بھی حد سے زیادہ شدید ہونا چاہئے۔ اگر اسے کافی عرصہ تک فراموش رکھا گیا، تو یہ ضرورت ایک اہم مسئلہ بن جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ پاکستان میں یا کہیں بھی ایسا کوئی ادارہ اذہان اور افراد سے پوری طرح آراستہ نہیں ہے

اس نوعیت کی ضرورت کو پورا کرنے کا اہل ہو۔ مجھے پوری توقع ہے کہ جیسے ہی ہمارے معاشی اور صنعتی وسائل اجازت دیں گے، اس مسئلہ کی جانب خاطر خواہ توجہ دی جائے گی۔

میں یہ کہنے کی جسارت کروں گا کہ گلڈ کو جو کچھ بھی قیمتی اثاثہ حاصل ہو اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھا جائے۔ میں اس سلسلہ میں بطور انتباہ چند معروضات پیش کروں گا۔

سب سے پہلی بات تو یہ کہ اس اثاثہ کی توسیع اور استعمال ہمیشہ گلڈ کی اپنی روایت کے شایان شان رہے۔
ہمیں اپنے منافع کو بڑھانے کے لئے جہاں تک ممکن ہو، تجارتی اور صنعتی مہم کا آغاز کرنا چاہیئے' لیکن میرے خیال میں اقلیم علم و ادب سے اس کی تھوڑی بہت مناسبت بھی ضروری ہے۔

دوسرے گلڈ کی معنوی ترقی بلا شبہ اس کے دائرۂ عمل کو زیادہ مستحکم اور مرغوب بنا دے گی۔ اس لحاظ سے اس کے انتخابات میں زیادہ گرم جوشی بلکہ خشونت اور تنازع کا پیدا ہونا یقینی ہے۔ جو کچھ ہوا سو ہوا۔ لیکن اب انتخابات جیسے ہی ختم ہوں، اختلافات کو بھی اس وقت تک کے لئے ختم کر دینا چاہیئے، جب دو سال بعد پھر میدان عمل گرم ہو۔ اس کے بغیر ادارے کا فروغ ممکن نہیں۔

آخر میں مجھے گلڈ کے تمام ممبروں، مرکز، ریجن اور سب ریجن کے موجودہ اور گزشتہ عہدیداروں کا شکریہ ادا کرنا ہے کہ اگر ان سب کا تعاون، مدد اور رہبری حاصل نہ ہوتی تو یہ مدت انتہائی غیر منافع بخش ثابت ہوتی۔ رواج ہے کہ ایسے موقعوں پر کسی کا نام نہیں لیتے تاکہ کسی قسم کا مرحلۂ امتیاز پیدا نہ ہونے پائے۔ میں سوائے ایک ذکر کے اس رواج کا پاس رکھوں گا۔ اور وہ ذکر جمیل الدین عالی کا ہے۔

انھوں نے گلڈ کے بنیادی خیال کی تصنیف سے لے کر اس کی تعمیر و تشکیل میں اپنے جس گراں مایہ تعاون اور خدمات کے ذریعہ ہم پر احسان کیا ہے، میں ان کا نام لئے بغیر اسے بہ حسن و خوبی ظاہر نہیں کر سکوں گا۔ گلڈ کی تنظیم و نشوونما میں انھوں نے جس شوریدہ سری اور مضطرب قوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ اسے محسوس کئے بغیر ہم گلڈ کی شکل و شباہت کی تصویر نہیں کھینچ سکتے۔ لہٰذا مجھے خصوصی طور پر ان کا شکریہ ادا کرنا ہے۔

(ہیگ :۔ ۲۲ جنوری ۱۹۶۵ء)

(ترجمہ)

ہم علم کراچی

ادارۂ مصنفین پاکستان کی چھٹی سالگرہ کے موقع پر
الحاج عبداللہ ظہیرالدین لال میاں
صدر پاکستان رائٹرز گلڈ ٹرسٹ
کی
تقریر

جناب مہمان خصوصی، خواتین و حضرات!

میں ایک دن کے لئے کراچی آیا اور آج ہی صبح کو راولپنڈی جا رہا تھا۔ لیکن ایک ہمہ گیر طاقت نے میرے پاؤں پکڑ لئے ـــ وہ طا ـــ دانشوروں کی ہے' گلڈ کی اخوت کی ہے اور مجھے ایک عرصہ سے اس کا ممبر اور کارکن ہونے کا فخر حاصل ہے۔ آج جب کہ آپ اس دلکش و رنگین فضا میں اس عظیم ادارے کی چھٹی سالگرہ منا رہے ہیں' میں کس طرح اپنے آپ کو ریل کے ڈبے میں مقید آہنی پہیوں کی غیر شاعرانہ آواز سننے پر مائل کرتا ـــ لہٰذا میں نے قائم مقام سکریٹری جنرل کی یہ بات مان لی کہ آپ اس جشن میں شریک ہو کر جناب ممتاز حسن جیسے مشہور دانشور کی تقریر سنوں۔ مجھے یہ دیکھ کر بھی فخر محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارے ملک کے ایک نامور فرزند جناب جسٹس محبوب مرشد آج ہمارے مہمان خصوصی ہیں۔ میں ان کی عالمانہ تقریر سننے کے لئے ہمیشہ منتظر رہتا ہوں۔ میں یہ بات کافی عرصہ سے جانتا ہوں کہ وہ اپنے سننے والوں کو ہمیشہ اپنے گراں قدر خیالات سے مستفیض کرتے ہیں۔

خواتین و حضرات!

مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ گلڈ نے ہمارے دونوں خطوں کے مابین ایک ایسی شاہراہ بنا دی ہے جو ہر موسم کے لئے ہے۔ گلڈ کے عالم وجود میں آنے سے پہلے میں نے مختلف جماعتوں اور افراد کو قومی اتحاد کے لئے کوشاں دیکھا ہے۔ لیکن اس ادارے نے معاشی ذرائع کی کمی کے باوجود' اس اہم ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ایک بے مثال خدمت انجام دی ہے' محض اس بنا پر کہ اس نے اپنے پرخلوص مقصد سے دونوں خطوں کے قلمکاروں کے دلوں کو' ایک دوسرے کیلئے دھڑکنے پر مجبور کر دیا۔ لسانی اور جغرافیائی بُعد کے باوجود' ہمارے درمیان کوئی اجنبیت باقی نہیں رہی۔ ہم میں سے بہت سے لوگ دوسرے خطے میں خود کو جلد بے تکلف بنا لیتے ہیں۔ بلکہ نہایت پرخلوص جذبہ کے ساتھ ایک دوسرے کے متعلق سوچتے ہیں۔

آپ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ گلڈ ٹرسٹ کے اس سرمایہ کے ایک حصے سے جو پرنسسز ہوٹل لاہور سے حاصل ہوا ہے، پچھتر ہزار کی رقم
ھا کر میں زمین کا ایک خطہ خرید لیا گیا ہے، جس پر عنقریب گلڈ ہاؤس تعمیر ہوگا۔ گلڈ ٹرسٹ کے صدر ہونے کی حیثیت سے میں اپنے
پاکستان کے رفقا، خصوصاً اپنے دوست جمیل الدین عالی کا ممنون ہوں جنہوں نے اس منقول خریداری کا مشورہ دیا
ے ہمارے مقصد کا بنیادی اتحاد اور غیر متعصب نظریہ واضح ہو جاتا ہے۔ جو فی الحقیقت خدا کا عظیم عطیہ ہے، خصوصاً ہماری
ائی کے لئے، جہاں ہم سب قومی اتحاد کے مسائل سے ہنوز دو چار ہیں۔ ایک طرح سے ہم اسلامی قدروں کو وسیع پیمانے پر فروغ
رنے سرگرم عمل بھی ہیں۔ میں خدائے بزرگ و برتر سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے اور مدد کرنے کے لئے زیادہ
ادہ مواقع عطا فرمائے۔

جیسا کہ آپ کو معلوم ہے مجھے اس موقع پر تقریر نہیں کرنی تھی، مگر میں دل کی آواز پر لبیک کہتا ہوا آپ کے پاس آ گیا ہوں
ں میں شریک ہو رہا ہوں۔

میں آپ سب کی بہبود اور گلڈ کے روز افزوں ترقی کی دعا کرتا ہوں۔

(ترجمہ)

جناب ممتاز حسن

کلاسیکی ادب کی اہمیت

گلڈ کی چھٹی سالگرہ کے موقع پر یہ تقریر پڑھی گئی !

زبان کے فروغ و ترقی کیلئے ادبیاتِ عالیہ ناگزیر ہیں یہ تخلیقی تحریک کا سرچشمہ ہیں چاہے ہم انکی روایت کو مانیں یا نہ مانیں ۔ وہ متاثر بھی کر سکتی ہیں اور ناخوشگوار بھی ثابت ہو سکتی ہیں مگر مستند حوالہ کی حیثیت سے ان کی اہمیت ہمیشہ مسلم رہے گی۔ ادبیاتِ عالیہ سے انکار صحیح معنوں میں ادبی ابتری کا موجب ہوگا۔

یوں تو ہر زبان کی ادبیاتِ عالیہ کی اہمیت مسلم ہے لیکن وہ زبانیں زیادہ اہمیت کی حامل ہیں جنہوں نے آنے والی نسلوں کے لئے کلچر اور ثقافت کی بنیادی روایت کو برقرار رکھا۔ مثال کے طور پر یونانی اور لاطینی ادبیات یورپ کے لئے اہم ہیں ۔ اور عربی و فارسی ادب برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لئے ! ۔ یورپ کی تہذیب یونانی اور رومی تمدن پر مشتمل ہے اور یورپ کی زبانیں یونانی اور رومی ادبیات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح مسلمانانِ ہند کی تہذیب جو اس برصغیر میں ہزاروں سال سے بھی زیادہ قائم رہی عربی اور فارسی پر مشتمل ہے ۔ عربی اور فارسی کے بغیر اردو پر دسترس حاصل کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے یونانی اور لاطینی کا علم حاصل کئے بغیر انگریزی کا صحیح مذاق پیدا ہونا۔

اس برصغیر میں عربی زبان تاجروں اور حملہ آوروں کے ہمراہ، عرب سے آئی۔ اسلام کے ورود سے بہت قبل مشرقی اور مغربی پاکستان میں عربوں سے تعلقات پیدا ہو گئے تھے ۔ سندھ پر عربوں کے قابض ہو جانے کے بعد اس برصغیر میں ایک اہم ادبی روایت کا آغاز ہوا۔ یہ وہی روایت ہے جس نے بہت عرصہ قبل ابو العطا السندھی جیسے ذی مرتبت شاعر کو پیدا کیا جس نے ابو تمام کی "حماسہ" میں، جو "سبعہ معلقہ" سے قطع نظر عربی شاعری کا مشہور و معروف مجموعہ ہے جگہ پائی ۔ کچھ دنوں بعد ہمیں لاہور کے امام صغانی جیسے مشہور فرہنگ نویس اور سیالکوٹ کے ملا عبدالحکیم جیسے بلند پایہ ادیب دکھائی دیتے ہیں ۔ زمانۂ قریب میں بھی ہمیں شاہ ولی اللہ دہلوی، میر غلام علی آزاد بلگرامی، مولانا فضلِ حق خیر آبادی اور بھوپال کے نواب صدیق حسن خان کی تحریریں ملتی ہیں ۔ تقریباً

چالیس سال پہلے علامہ مشرقی مرحوم نے بھی ۱۴۴ صفحات پر مشتمل عربی زبان میں اپنے "تذکرہ" کا دیباچہ سپردِ قلم فرمایا تھا۔ خود ہمارے اپنے زمانے میں عربی روایات مہتم بالشان طریقے سے مولانا عبدالعزیز میمن کے ہاتھوں جلوہ گر ہوئی ہیں، جو عربی ادب کے مصنف کی حیثیت سے شاید ہی دنیا میں اپنا نظیر رکھتے ہوں۔

عربوں کی فتح کا سلسلہ زیادہ عرصہ قائم نہیں رہا۔ مشکل سے ایک آدھ صدی گذری تھی کہ ان کا اقتدار ختم ہونے لگا۔ اور ہندوستان نے عربوں سے براہِ راست تعلق کا موقع کھو دیا۔ یہ دراصل اس دور میں نتائج کے آثار تھے جنہوں نے برِصغیر کی اسلامی تہذیب کو پورے طور پر متاثر کیا۔ عربوں کے بعد جب ترکوں، افغانوں، اور مغلوں کا قافلہ آیا تو اِن سبھوں نے فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا۔ مغربی پاکستان پر ایران کے سیاسی اثرات آج سے ... قبل مسیح کیانی دور میں ہی مرتب ہوئے اور یہ سارا علاقہ جسے آج کے ماہرِ آثارِ قدیمہ گندھارا کے نام سے موسوم کرتے ہیں کیانی حکومت کا ایک حصہ تھا۔ اور ٹیکسیلا میں مقیم ایک صوبے دار سارے علاقے پر حکمران تھا۔ بہرحال محمود غزنوی کے زمانے تک فارسی زبان برِصغیر میں تہذیبی سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنی تھی۔ لیکن بعد میں ہندو مسلم ثقافت پر اس کے ہمہ گیر اثرات رونما ہوئے۔ مسعود سعد سلمان، خسرو، غالب، بیدل، ناصر علی، غنی کاشمیری، شبلی، گرامی اور اقبال جیسے نامور شعراء اس زبان میں پیدا ہوئے۔ برِصغیر ہند و پاک نے فارسی نثر کی جو خدمت انجام دی ہے وہ کم اہمیت حامل نہیں۔ اور ہمارے یہاں ادبی اور سائنسی موضوعات پر نہایت اعلیٰ درجہ کی بے شمار کتابیں تصنیف کی گئیں مغربی پاکستان کے علاقہ اچ میں رہنے والے عوفی نے ساتویں صدی ہجری میں فارسی شعراء کا پہلا تذکرہ "لباب الالباب" مرتب کیا تھا۔ ایسا ایک قدیم تذکرہ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا پہلا تذکرہ ہے، لیکن اب نایاب ہے۔ وہ بھی مغربی پاکستان کے شہر ملتان میں ہی لکھا گیا۔ فخر ہروی نے دسویں صدی ہجری میں فارسی کے خواتین شعراء کا پہلا تذکرہ "جواہر العجائب" سندھ میں لکھا۔ تیرھویں صدی ہجری تک اردو شعراء کے زیادہ تر تذکرے فارسی میں لکھے گئے۔ جن میں میر، مصحفی اور شیفتہ جیسے مشہور شاعروں کی تصنیف کردہ تذکرے بھی شامل ہیں۔

جہاں تک فرہنگ نویسی کا تعلق ہے فارسی کی پہلی تین لغتوں کو چھوڑ کر جو ایران میں مرتب کی گئیں دوسری مشہور و معروف لغت بھی اسی برِصغیر میں، تیرھویں صدی ہجری کے لگ بھگ تصنیف کی گئیں۔ پاکستان میں تاریخی تصنیف کا سلسلہ ساتویں صدی میں "چچ نامہ" اور "طبقاتِ ناصری" سے ہی شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت سے ہمارے یہاں ضیاء الدین برنی نے ... احمد ٹھٹوی، خواجہ نظام الدین، عبدالقادر بدایونی، ابوالفضل، ابوالقاسم فرشتہ، اور غلام طبا طبائی جیسے بلند مرتبت مؤرخ گزرے ہیں۔ یہاں اس امر کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ طبا طبائی نے انیسویں صدی میں برطانوی دور میں "سیر المتاخرین" تصنیف کی۔ انیسویں صدی کے شروع میں بھی خداداد خاں نے فارسی زبان میں تاریخ سندھ لکھی تھی۔

مبادا موضوع سے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ پیدا ہو، میں اس امر کی وضاحت کر دینا چاہتا ہوں کہ مشرقی پاکستان میں بھی عربی فارسی کے اثرات اتنے ہی ہمہ گیر رہے ہیں جتنے مغربی پاکستان میں۔ بنگال کے علمی حلقے میں عربی کا مطالعہ ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اور آج بھی وہاں مغربی پاکستان سے کہیں زیادہ عربی مدارس موجود ہیں۔ برطانوی دور میں انگریزی کے بڑھتے ہوئے اثرات دیکھ کر بنگال اور آسام کے مسلمانوں نے ابتدائی اور ثانوی درجوں میں عربی نصاب مروج کرنے کے لئے باقاعدہ ایک اسکیم بنائی تھی۔ بنگلہ زبان میں عربی کے کثیر الفاظ شامل ہو گئے ہیں۔ اور مجھے معلوم ہوا ہے کہ چاٹگام کے علاقے میں بولی جانے والی بنگلہ زبان ...

وہاں فارسی کے اثرات بھی نمایاں رہے ہیں۔ اور فارسی کی قدیم کتابوں میں تو بنگال کا نام بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے بنگالہ کے ایک عظیم فرمانروا سلطان غیاث الدین نے حافظ کو اپنی حکومت میں آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ حافظ آتو نہ سکے لیکن اپنے مشہور و معروف قصیدے میں شکریہ ادا کر کے خود سلطان اور حکومتِ بنگالہ کو جاوداں بنا دیا ؎

حافظ ز شوقِ مجلسِ سلطان غیاث الدین — خامش مشو کہ کارِ تو از نالہ می رود
شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند — ایں قندِ پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

ایک حافظ ہی پر منحصر نہیں، ایران کے ایسے بے شمار ادبی مشاہیر تھے جو مسلمان حکمرانوں کی فیاضی کا حال سن کر ہندوستان کی جانب متوجہ ہو گئے تھے لیکن چند وجوہات کی بناء پر وہ اس ملک میں نہ آ سکے جہاں ان کی ترقی کے دروازے وا تھے۔ صائب اصفہانی نے ایک مرتبہ اورنگ زیب کے درباری رکن جعفر خان کو مندرجہ ذیل شعر لکھ کر بھیجا تھا۔ جس کے صلہ میں اس نے شاعر کو انعام و اکرام سے نوازا تھا ؎

دوروستاں را بہ احساں یاد کردن ہمت است — ورنہ ہر نخلی بپا می خود ثمر می افگند

ان خوش نصیبوں میں جو ہندوستان آ کر یہیں کے ہو گئے عراقی ہمدانی، کلیم کاشانی، عرفی شیرازی، نظیری نیشاپوری، اور علی حزیں لاہجی قابلِ ذکر ہیں۔

عہدِ مغلیہ کے آغاز تک مشرقی پاکستان میں مسجدوں اور مقبروں پر عربی اور فارسی زبان میں کتبے کندہ کئے جاتے تھے۔ لیکن مغلیہ دور میں یہ سلسلہ فارسی تک ہی محدود رہا۔ عہدِ مغلیہ میں فارسی نے بنگال میں خاصا عروج حاصل کیا اور بعد میں بھی مقبول رہی۔ غلام حسین سلیم نے "ریاض السلاطین" کے نام سے بنگال کی تاریخ اٹھارھویں صدی میں فارسی میں ہی لکھی تھی۔ حمید اللہ نے فارسی میں "تاریخ اسلام آباد" کے نام سے چاٹگام کی تاریخ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مرتب کی تھی۔ آج سے تقریباً ۸۰ سال قبل چاٹگام کے رہنے والے عبدالعلی نے "صحیفۃ العلی و مراۃ الاحوال" تصنیف کی جس میں مشرقی پاکستان پر عربی اور فارسی کے اثرات کے متعلق دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ جیسا کہ وہ رقم طراز ہے، فارسی زبان کا استعمال اسکے زمانے میں اگرچہ بے حد کم ہو گیا ہے لیکن ۳۰ سال پہلے یہ مادری زبان کا درجہ رکھتی تھی۔

"زبان فارسی اگرچہ در بنولا بدیار اسلام آباد بصفت عنقائی موصوف گردیدہ اما بہ اعتبار سابق الحال یعنی قبل سی سال زبانی بود کہ ہمچوں زبان مادری مروج بسرواج کمال۔"

وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ وہ فارسی، عربی، اردو، بنگلہ اور انگریزی زبانوں سے واقف ہے لیکن عربی اور فارسی اسکی پسندیدہ زبان ہیں۔ چونکہ بنگال میں فارسی نے عربی سے قبل نصاب کی زبان اختیار کر لی تھی اسلئے اس نے اپنی کتاب فارسی زبان میں ہی لکھی ہے۔

"از لغات مختلفہ معلوم ام کہ فارسی و عربی و اردو و بنگالی و انگریزی است۔ لغتِ فارسی و عربی را نیکوتر دانم۔ لیکن در اینجا زبان فارسی قبل عربی می خوانند ازایں جا کتاب ہذا بہ لغت فارسی قلمی شد۔"

بہر کیف عبدالعلی اپنے بیٹے کو نصیحت آمیز انداز میں اس امر پر زور دیتا ہے کہ وہ فارسی کی تعلیم حاصل کرے۔ ورنہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ کر وہ فارسی نہ پڑھ سکے گا۔ وہ چاہتا ہے کہ اس کا فرزند اس کی تمام تصانیف پڑھ لے۔

اور ان سے فہم و فراست حاصل کرے یہی اس کی آخری خواہش تھی۔

"اے ریحان باغ زندگی اگر من پیش تربیت تو رخت ہستی بہ بندم وصیت من بتو این است کہ بہ فارسی دانی مصنف طبع رجوع آوردہ از مضامین مصنفہ ام نیکو واقف شدہ برہمہ گوش ہوش بوگماری"

فارسی زبان نے نہ صرف اردو اور بنگلہ پر اپنے اثرات مرتب کئے بلکہ برصغیر کی دوسری علاقائی زبانوں پر بھی اپنے اثرات نقش کئے ہیں۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے اگرچہ اس کی بنیاد سنسکرت یا اس کی شاخوں پر مشتمل ہے لیکن اس کی ظاہری ہیئت سراسر فارسی کی ہے۔ یہاں تک کہ عربی کے الفاظ بھی فارسی زبان کے ذریعے اس میں داخل ہوئے ہیں۔ جہاں تک میرا خیال ہے، بنگلہ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ بنگال کے اکثر مسلم حکمرانوں نے جو سرکاری خط و کتابت فارسی میں کیا کرتے تھے۔ بنگلہ کو ادبی زبان کی حیثیت دینے کے لئے ہمیشہ کوشاں رہے۔

یہاں اس امر کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ فرنگی محل کے مشہور و معروف عربی نصاب "درس نظامی" میں حاشیہ آرائی فارسی زبان میں کی گئی ہے۔ ۱۸۳۰ء تک جبکہ برطانوی حکمرانوں نے انگریزی کو مسلط نہیں کیا تھا فارسی ہی برصغیر کے متعدد علاقوں میں سرکاری زبان کا درجہ رکھتی تھی۔ بہرکیف یہ زبان ۱۸۵۷ء تک سرکار مغلیہ کی درباری زبان رہی۔ جبکہ اس برصغیر میں اسلامی حکومت کا رہا سہا وقار خاک میں مل گیا تھا۔ بایں ہمہ فارسی تہذیب و ثقافت اور ذاتی مکاتبت کی حیثیت سے اس صدی کے آخر تک مروج رہی۔ یہاں تک کہ انگریزی زبان نے اپنا تسلط پوری طرح جما لیا۔ لیکن پھر بھی ہم اس برصغیر میں شبلی اور اقبال کے شاہکار کے ذریعہ فارسی کی جھلک دیکھتے رہے۔

مجھے عربی اور فارسی کی یہ مختصر سی کہانی پیش کرنی تھی۔ ان دونوں زبانوں نے صدیوں تک برصغیر پاک و ہند کی تہذیب و ثقافت کو نکھارا اور تاریخی انقلابات کے باوجود انکی اہمیت کو برقرار رکھا۔ جس طرح قرون وسطی کے یورپ میں لاطینی اہل کلیسا کی ہردلعزیز زبان تھی اور فرانسیسی اہل ثروت میں رسوخ پا چکی تھی، بجنسہ عربی اس برصغیر میں عام طور سے اسلامی تعلیمات کے لئے وقف تھی اور جملہ انتظامات اور ادبی سرگرمیوں کے لئے فارسی مستعمل تھی۔ جہاں تک اردو کا تعلق ہے میں پورے یقین کے ساتھ کہوں گا کہ اس کی آئندہ ترقی اس بات میں مضمر ہے کہ عربی اور فارسی سے قربت حاصل کی جائے نہ کہ اس سے علیحدگی اختیار کر لی جائے۔ میں یہ کہنے کی جسارت کرونگا کہ بجنسہ حالت بنگلہ کی بھی ہو۔ اس سے قطع نظر کہ عربی اسلامی لحاظ سے مسلمانوں میں بڑی اہمیت رکھتی ہے یہ سائنس اور ادب کی ارفع و اعلیٰ اقدار کی محافظ بھی ہے۔ جہاں تک فارسی کا تعلق ہو اگر ہم ایک صدی پیچھے لوٹ جائیں تو ہمیں بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ فارسی سارے برصغیر پاک و ہند میں اسلامی ثقافت کی آئینہ دار تھی۔ ہمیں اپنے عزیز ترین ثقافتی ورثے سے قریب تر ہو کر ایک دوسرے سے متعارف ہونا لازمی ہے میں محض اس بنا پر یہ چاہوں گا کہ پاکستان میں عربی اور فارسی کی جانب خصوصی توجہ مبذول کی جائے۔

کچھ سنسکرت کے بارے میں۔ جیسا کہ میں نے قبل کہا ہے کہ سنسکرت (یا اس کی ایک یا کئی شاخیں) اردو کا سرچشمہ ہیں اور اس نے سنسکرت سے ہی صرف و نحو کی ترکیبیں اخذ کی ہیں۔ میرے خیال میں بنگلہ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی ہے۔ اس حقیقت کے باوجود ہمارے ملک میں سنسکرت کے علم کا بے حد فقدان ہے اور ہمیں اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ پاکستان کی زیادہ سے زیادہ یونیورسٹیوں میں سنسکرت کا شعبہ قائم

کیا جائے اور میں یہ تجویز بھی پیش کرتا ہوں کہ اگر ادارۂ مصنفینِ پاکستان اتفاق کرے تو خود اس معاملہ کو متعلقہ افسروں کے ساتھ مل کر حل کر سکتا ہے۔ اردو اور بنگلہ کو شایانِ شان مقام اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جبکہ عربی فارسی اور سنسکرت کے علوم کی خاطر خواہ ترقی ہو۔ اتنی ساری قدیم زبانوں کو آپ کے سر تھوپنے کی معافی چاہتے ہوئے کیا میں آپکو عظیم البیرونی کی یاد دِلا سکتا ہوں؛ کیا میں برطانوی ادیب سر ولیم جونز اور پروفیسر ای۔ بی کوول کا تذکرہ کر سکتا ہوں جو عربی فارسی اور سنسکرت تینوں زبانوں سے آشنا تھے؟ یقیناً یہ توقع بہت زیادہ نہیں ہے کہ ہم میں سے بعض ان تینوں کا نہ سہی، ایک آدھ زبان کا مطالعہ کریں اور اس طرح اپنی عظیم تہذیبی روایت کو برقرار رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوں۔

(ترجمہ:۔ پرویز کاکوی)

اعلان

حلقہ کراچی کے ریجنل سکریٹری نے اعلان کیا ہے کہ ادارہ کے بہت سے ممبر اپنے نئے پتے سے دفتر کو باخبر نہیں کرتے جسکی وجہ سے ڈاک ضائع ہو جاتی ہے یا واپس آجاتی ہے انھوں نے کہا ہے کہ حلقہ کراچی کے اراکین اگر اپنے پتے اور ٹیلیفون نمبروں سے دفتر کو مطلع کر دیں تو ڈاک کے نہ پہنچنے کی شکایت بھی نہ رہے اور ہمارا ان کے ساتھ رابطہ قائم ہو جائے۔

گلڈ کیسے قائم ہوا

۴ر ستمبر ۱۹۵۸ء

آٹھ ادیبوں نے کل پاکستان کنونشن کے لئے کراچی سے اعلان جاری کیا۔

سرمایہ:- ۱۶۰ روپے

دسمبر۔جنوری (۵۹-۱۹۵۸ء)

عطیات جمع کئے گئے

۲۹-۳۰ جنوری ۱۹۵۹ء

تمام پاکستانی زبانوں اور مکاتبِ فکر کے ۲۱۲ ادیب کومگی حسیم الدین کی زیرِ صدارت کراچی میں جمع ہوئے۔ احمد سعید مرحوم نے کنونشن کا افتتاح کیا ملک بھر سے موصول شدہ ۲۸۰۰ قرار دادوں کا منتخب شدہ کمیٹیوں نے معائنہ اور سفارشات مرتب کی گئیں۔ گلڈ کے مسودہ دستور کا معائنہ کیا گیا۔

۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء

۴ بجے شام

بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم کی زیرِ صدارت گلڈ قائم ہوا۔

پروگرام

- قومی یکجہتی ۔
- بین الانسانی ہم آہنگی ۔
- ادیبوں کے لئے آمدنی پیدا کرنیوالی سرگرمیاں ۔
- ادیبوں کی سرگرمیوں کا فروغ ۔
- ادیبوں اور انکے خاندانوں کی امداد ۔
- ادیبوں کے حقوق کا تحفظ ۔
- اعلیٰ درجہ کی مطبوعات کیلئے انجمن برائے امداد باہمی مصنفین کا اجراء اور انکی امداد ۔
- قوانین کاپی رائٹ اور ادیبوں، ناشروں کے باہمی تعلقات کو بہتر بنانا ۔
- پاکستانی ادب کا مشرقی و مغربی زبانوں سے تعارف ۔
- پاکستان اور دوسرے ملکوں کے مابین ثقافتی وفود کی آمدورفت کا اہتمام ۔
- یونیسکو کے پروگراموں کی مدد ۔

ایک نظر میں

ہیئت

ایک مرکزی دفتر ۔ ۳ علاقائی مرکز ۔ کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں ۔ ۲۵ ذیلی علاقے مشرقی و مغربی پاکستان میں ۔ ۱۰۰۰ زائد ممبر ۳۱ جنوری ۱۹۶۵ء تک ۔

دستور

مرکز : سکریٹری جنرل اور ۲۵ اراکین مرکزی انتظامیہ جو تمام زبانوں کی نمائندگی کرتے ہیں انکی میعاد رکنیت دو سال

علاقے : سکریٹری، خزانچی اور اراکین کی انتظامیہ کمیٹیاں جو دو سال کے لئے منتخب ہوتے ہیں ۔

مجلس عامہ کا اجلاس دو سال میں ایکبار ہوتا ہے ۔ گلڈ کے دستور کے تحت بیرونی عطیات قبول نہیں کئے جاتے

خاص امور

ماہنامہ ہم قلم (اردو)

ماہنامہ باری کرم (بنگالی) ، "لٹریری پاکستان" سہ ماہی (زیر ترتیب)

نیا کاپی رائٹ ایکٹ کا نفاذ از ۱۹۶۲ء

پبلشنگ ہاؤس نے کراچی، لاہور اور ڈھاکہ سے کام شروع کیا ۔

گلڈ کتاب گھر (کراچی) ۔

مشرقی و مغربی پاکستان میں اشاعتی اداروں کا منصوبہ ۔

…شنل بینک ادبی انعام (اردو، بنگلہ، انگریزی)	————	۲۵،۰۰۰ روپے سالانہ
…ر ادبی انعام (اردو، بنگلہ)	————	۲۵،۰۰۰ " "
…جی ادبی انعام (اردو، بنگلہ)	————	۲۰،۰۰۰ " "
…کے انعامات (برائے علاقائی ادب)	————	۱۲۰۰۰ " "
…قلم انعامات	————	۲،۵۰۰ " "
…ی کرم انعام	————	۲،۵۰۰ " "
…ں کے ادب کے لئے انعام (۱۹۶۴ء سے)	————	۲۵۰۰ " "
…ی اجتماعات	————	۲۰۰ سے زائد "
…رقی و مغربی پاکستان کے ادیبوں کے باہمی تبادلے	————	۲۲۵ " " "
…ی رائٹ کے معاملات	————	۸۵
…کی انشورنس اسکیم (بغیر ادائیگی بیمہ) برائے جملہ اراکین۔	————	۱۰۰۰
…ہاؤس — لاہور — ملتان۔	————	۲
…فی ادیبوں کے خاندانوں کی امداد۔	————	۱۴۰
…ع شدہ کتابیں (قومی اور علاقائی زبانوں اور انگریزی میں)	————	۲۵

…ی مہمان تشریف لائے۔

…ممالک کو وفود بھیجے گئے۔

متوفی ادیبوں کی فیملی کے لئے گرانٹ کی رقم ایک لاکھ روپے (۱۰۰۰۰۰) سے بڑھ کر دو لاکھ روپے (۲۰۰۰۰۰) سالانہ ہوگئی اور زندہ …وں کے لئے یہ رقم پینتیس ہزار سے بڑھ کر ۶۵ ہزار روپے سالانہ ہوگئی۔

…رے ملکوں کے تمام اہم و مفید اداروں کے ساتھ روابط۔

…دفتر اقوام متحدہ میں غیر سرکاری ادارہ کی حیثیت سے اندراج۔

…و کے ساتھ منصب مشاورت۔

ادبی انعامات کا اعلان

پاکستان رائٹرز گلڈ کی چھٹی سالگرہ پر کراچی میں ۳۱ جنوری ۱۹۶۵ء کو مندرجہ ذیل ادبی انعامات کا اعلان کیا گیا

آدم جی ادبی انعام

ججوں کی اکثریت نے مندرجہ ذیل کتابوں کو انعام کا مستحق قرار دیا

اُردو

(افسانہ ناول) ۱۔ آبلہ پا ۔ (ناول) مصنفہ:۔ رضیہ فصیح احمد

پانچ ہزار روپے

(شاعری) ۲ ۔ فارقلیط مصنف :۔ عبدالعزیز خالد

۲½ ہزار روپے

۳۔ مطربہ مصنفہ :۔ قتیل شفائی۔

۲½ ہزار روپے

ججوں کی کمیٹی :۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی
پروفیسر وقار عظیم
ڈاکٹر وحید قریشی
ڈاکٹر شوکت سبزواری
جناب مختار صدیقی
جناب جمیل الدین عالی کمیٹی کے سکریٹری تھے

بنگلہ کتابوں کیلئے آدم جی ادبی انعام کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

داؤد ادبی انعام

تمام ججوں نے ہم خیال ہو کر حسب ذیل کتابوں کو انعام کا مستحق قرار دیا۔

آردو

۱۔ پاکستانی کلچر — مصنف :۔ جمیل جالبی

پانچ ہزار روپے

۲۔ تحقیق کی روشنی میں — مصنف :۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی

پانچ ہزار روپے

ججوں کی کمیٹی :۔
جناب ممتاز حسن، ستارۂ پاکستان — چیئرمین
ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں
پروفیسر طاہر فاروقی
جناب پیر حسام الدین راشدی
جناب شیخ چاند حسین
جناب جمیل الدین عالی اس کمیٹی کے سکریٹری تھے

اس کے علاوہ کمیٹی نے مندرجہ ذیل دو کتابوں کو ڈھائی ہزار روپے کے انعامات کا مستحق قرار دیا اور سفارش کی کہ گلڈ ان انعامات کی ادائیگی کے لئے دیگر ذرائع سے روپیہ حاصل کرے۔

۱۔ تاج محل — مصنف :۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی

۲۔ افریقہ ایک چیلنج — مصنف :۔ عبداللہ القدوسی

بنگلہ کتابوں کے لئے داؤد ادبی انعام کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

نیشنل بینک ادبی انعام

انگریزی (متعلقہ معاشیات)

۱۔ اقتصادی منصوبہ بندی کا ایک لائحہ عمل　　　مصنفہ:۔　　　ڈاکٹر محبوب الحق
پانچ ہزار روپے

اردو (متعلقہ سائنس)

۱۔ برق و مقناطیس　　　مصنفہ:۔　　　پروفیسر حمید عسکری
ڈھائی ہزار روپے

۲۔ حیوانی نمونے　　　مصنفہ:۔　　　جناب حفیظ الرحمٰن
ڈھائی ہزار روپے

معاشیات پر ایک ہی کتاب آئی۔ مگر وہ ترجمہ تھی اس لئے انعام کی مستحق نہیں رہی۔ لہذا یہ انعام روک لیا گیا اور نیشنل بینک نے ۵۰۰۰/- (پانچ ہزار) روپے کی رقم گلڈ کی تحویل میں دیدی ہے تاکہ جناب ایم، ایل، قریشی کی نگرانی میں معاشیات پر اردو میں کتاب لکھنے کی مہم چلائی جائے۔

اردو اور انگریزی کمیٹی کے لئے حسب ذیل جج مقرر ہوئے تھے۔

۱۔ جناب ممتاز حسن، ستارۂ پاکستان
منیجنگ ڈائریکٹر نیشنل بینک آف پاکستان (چیرمین)
۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد۔ پی، ایچ، ڈی
سابق چیرمین، اٹومک انرجی
۳۔ جناب ایم، ایل، قریشی
چیف اکونومسٹ۔ پلاننگ کمیشن

بنگلہ (متعلقہ سائنس)

۱۔ مدیہہ بک پدارتکا　　　مصنفہ:۔　　　پروفیسر عبد القاسم
ڈھائی ہزار روپے

۲۔چین، مینا، دوئل، کوئل — مصنفہ :۔ڈاکٹر اے، کے، ایم امین الحق

ڈھائی ہزار روپے

بنگلہ (متعلقہ معاشیات)

۱۔جنا، شنکیائے شمپت — مصنفہ :۔ڈاکٹر محمد مرتضٰے۔ڈھاکہ یونیورسٹی

پانچ ہزار روپے

بنگلہ کمیٹی کے لئے حسب ذیل جج تھے :۔

۱۔ڈاکٹر ایم، او، غنی۔ چیرمین
وائس چانسلر ڈھاکہ یونی ورسٹی
۲۔ ڈاکٹر المطیع شرف الدین
جناب جمیل الدین عالی اس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔

گلڈ انعامات کا اعلان

ادارۂ مصنفین پاکستان، مغربی پاکستان ریجن نے سنہ ۱۹۶۴ء کے دوران علاقائی زبانوں کی مندرجہ ذیل تخلیقات پر انعامات دینے کا اعلان کیا ہے۔

پنجابی

۱۔ دھرتی دیاں ریکھاں (نثر) آغا اشرف
ایک ہزار روپے

۲۔ بیلے بیلے (نظم) احمد ظفر
ایک ہزار روپے

پشتو

۱۔ د مینے غیگ (نظم) حکیم غلام سرور طاہر کلاچوی
پانچ سو روپے

۲۔ یون (نظم) امیر حمزہ شنواری
پانچ سو روپے

۳۔ لیشے (نثر) محمد اعظم
۲½ سو روپے

سندھی

۱۔ سندھی بولی (نثر) سراج الحق
ایک ہزار روپے

۲۔ سوز عشق (نظم) محمد جمن
۲½ سو روپے

پاکستان رائٹرز گلڈ کراچی ریجن
کے
انتخابات کے نتائج

۲۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو صبح دس بجے جناب جمیل الدین عالی صاحب کی زیرِ صدارت کراچی ریجن کا جلسۂ عام، پاکستان رائٹرز گلڈ کے دفتر واقع اسٹریچن روڈ منعقد ہوا اس جلسۂ عام میں ایک سو سے زائد ارکان نے شرکت فرمائی اور مجلس عاملہ کے لئے مندرجہ ذیل اراکین کو منتخب کیا۔

۱۔ جناب شوکت صدیقی
۲۔ لیفٹیننٹ کمانڈر انور
۳۔ جناب صہبا لکھنوی
۴۔ جناب رفیق خاور
۵۔ جناب حاذق الخیری
۶۔ جناب یونس احمر
۷۔ محترمہ نورالصباح بیگم
۸۔ جناب محمد ایوب قادری
۹۔ جناب سرشار صدیقی

گجراتی: جناب زین العابدین محمد
بنگالی: جناب مقصد علی

پاکستان رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان ریجن
کے
انتخابات کے نتائج

پاکستان رائٹرز گلڈ حلقہ مغربی پاکستان کا جلسۂ عام ۷ار جنوری ۱۹۶۵ء کو لاہور میں ہوا۔ اجلاس کی صدارت میاں محمد شفیع سی۔ ایس۔ پی ڈائرکٹر پلاننگ اینڈ ڈیویلپمنٹ بورڈ نے کی۔ ارکان کو قبل ازیں جو ۳۴۹ بیلٹ پیپر بھیجے گئے تھے، ان میں سے ۳۲۰ بیلٹ پیپر نیشنل بینک آف پاکستان کو موصول ہوئے تھے۔ مندرجہ ذیل اراکین علاقائی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔

اردو:۔ ڈاکٹر وحید قریشی
جناب میرزا ادیب
جناب جمیل ملک
جناب الطاف حسن قریشی
جناب محسن احسان
جناب وقار عظیم
جناب محسن بھوپالی
جناب الطاف پرواز

پنجابی:۔ جناب محمد افضل چودھری

سندھی:۔ جناب رشید بھٹی

پشتو:۔ جناب اشرف حسین احمد

پاکستان رائٹرز گلڈ، مشرقی پاکستان ریجن کے انتخابات کے نتائج

پاکستان رائٹرز گلڈ حلقہ مشرقی پاکستان کا جلسۂ عام ۲۴ جنوری سنہ ۱۹۶۵ء کو بنگالی اکادمی ایڈیٹوریم ڈھاکہ میں صبح دس بجے شروع ہوا۔ ڈاکٹر انعام الحق، ڈائرکٹر، ترقی بنگلہ بورڈ نے اجلاس کی صدارت کی۔ مندرجہ ذیل اراکین علاقائی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۔ جناب سید مرتضیٰ علی
۲۔ جناب تعلیم حسین
۳۔ جناب لطف الحمید چودھری
۴۔ جناب علاؤ الدین الآزاد
۵۔ محترمہ جہاں آرا آرجو
۶۔ جناب احمد شریف
۷۔ جناب عبدالغنی ہزاری
۸۔ جناب عبدالرشید خاں
۹۔ جناب حسن حفیظ الرحمٰن
۱۰۔ ڈاکٹر خاں سرور مرشد

سلسلۂ روز و شب

(گلڈ کی سرگرمیاں)

پاکستان رائٹرز گلڈ کی دعوت پر روس کے ممتاز ادیب اور لینن انعام یافتہ شاعر مسٹر رسول حمزہ اپنی بیگم فاطمہ رسول حمزہ کے ہمراہ
وری ۱۹۶۵ء کی صبح کو کراچی تشریف لائے ۔ ہوائی اڈے پر گلڈ کے قائم مقام سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی، لینن انعام یافتہ پاکستانی شاعر
ں احمد فیض، ابن انشاؔ، لیفٹیننٹ کمانڈر انور اور شوکت صدیقی نے ان کا خیر مقدم کیا ۔
سب سے پہلے وہ قائد اعظم کے مزار پر گئے، جہاں انھوں نے فاتحہ پڑھی اور چادر چڑھائی ۔ اس کے بعد وہ انجمن ترقی اردو
دفتر تشریف لے گئے، جہاں انجمن کے چیئرمین جناب اختر حسین نے ان کا خیر مقدم کیا اور انھیں انجمن لائبریری میں لے گئے ۔ جہاں مسٹر
حمزہ کو نادر مسودات دکھائے گئے ۔ روسی شاعر نے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے مزار پر فاتحہ بھی پڑھی ۔
انجمن لائبریری کے معائنہ کے دوران انجمن ترقی اردو کے عہدیداروں سے بات چیت کرتے ہوئے مسٹر رسول حمزہ نے فرمایا کہ وہ اردو زبان
ساحت و بلاغت سے بہت متاثر ہیں۔ انہوں نے یقین ظاہر کیا کہ "یہ زبان جو پاکستان کی قومی زبانوں میں ایک ہے مزید ترقی کرے گی"۔
نے ملک میں اردو کی ترویج و ترقی کے لئے ٹھوس اقدامات کرنے پر انجمن ترقی اردو کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ۔
بعد ازاں جناب رسول حمزہ اپنی اہلیہ کے ساتھ ترقی اردو بورڈ کے دفتر تشریف لائے، جہاں پیر حسام الدین راشدی صاحب نے
خیر مقدم کیا۔ جناب رسول حمزہ کو اردو لغت کی ترتیب کا کام اور بورڈ کی دوسری سرگرمیوں سے آگاہ کیا گیا ۔
اس کے بعد جناب رسول حمزہ اور ان کی اہلیہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے دفتر میں آئے، جہاں انھیں قائم مقام سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی
کی شائع کردہ کتابوں کا ایک سیٹ، گلڈ کا ایک امتیازی نشان اور اس ادارہ کا دوسرا لٹریچر پیش کیا ۔
جناب رسول حمزہ پاکستان کے دس روزہ خیر سگالی کے دورے پر کراچی آئے تھے ۔ لیکن والدہ کی اچانک طبیعت
ب ہونے کی وجہ سے ۸ فروری کی صبح کو بذریعہ ہوائی جہاز ماسکو واپس چلے گئے ۔
ہوائی اڈے پر انہیں گلڈ کے قائم مقام سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی، فیض احمد فیض اور دوسرے دانشوروں نے
ع کیا ۔

روانگی سے قبل موصوف نے فرمایا کہ پاکستان کے اس مختصر دورہ میں وہ جہاں بھی گئے ان کا پُرجوش خیر مقدم کیا گیا، اور جس خلوص و محبت کا مظاہرہ کیا گیا اس سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ پاکستان اور روس کے درمیان بہتر سفارتی تعلقات قائم کرنے کیلئے دونوں ملکوں کے ادیبوں کی اہم تخلیقات کے ترجمے اردو اور روسی زبانوں میں وسیع پیمانے پر شائع کئے جائیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ روس کے ادیبوں کی یونین پہلے بھی پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کے چند روسی ترجمے کر چکی ہے۔ جسکے نتیجہ میں پاکستانیوں کے بارے میں روسی عوام میں مفاہمت پیدا ہوگئی ہے۔

---

۱۹ فروری کی شام کو ہوٹل میٹروپول میں پاکستان رائٹرز گلڈ، کراچی ریجن نے چینی مصنفین کے اعزاز میں دعوتِ استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ سب سے پہلے قائم مقام سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی نے چین کے مصنفین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی ادیبوں کے دل میں چینی عوام کے لئے خیر سگالی اور محبت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ہم چینیوں کے شکر گذار ہیں کہ ان کے وفود برابر آتے رہتے ہیں۔ ہم بھی جلد اپنا وفد بھیجنے والے ہیں، ہمیں یقین ہے کہ صدر ایوب کا دورۂ چین مفید نتائج کا حامل ہوگا۔ اور ترقی پسند تحریک کو ان کے اس دورے سے بہت تقویت پہنچے گی۔

بعد ازاں چینی وفد کے رکن مسٹر شن چنگ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "صدر ایوب کے دورۂ چین سے چین و پاکستان کے عوام کے دوستانہ تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوگا۔ انہوں نے پاکستانی عوام کی طرف سے چین کے عوام کے لئے برادرانہ جذبات اور مفاہمت کے اظہار کی تعریف کی۔ مسٹر چنگ نے کہا کہ پاکستان اور چین زمانۂ قدیم سے ثقافتی رشتوں میں منسلک ہیں۔

سیلون کے ممتاز مصنف اور سیلون میں ایشیائی رائٹرز بیورو کے نمائندے مسٹر پریم رتنا نے جو لاہور میں افروایشیائی مذاکرہ میں شرکت کے لئے آئے تھے دوران تقریر کہا کہ افروایشیائی علاقوں میں مصنفین کے سامنے سب سے اہم کام یہ ہے کہ سامراجی اور نوآبادیاتی نظام جو اثرات چھوڑ گیا ہے اس کو ختم کیا جائے۔

اس موقع پر جمیل الدین عالی نے چین اور سیلون کے ادیبوں کو گلڈ اشاعت گھر کی مطبوعات کا ایک ایک سیٹ بھی پیش کیا۔

چین کے ادیبوں نے شہرہ آفاق چینی ادیب لوہسون کا مجسمہ گلڈ کو تحفہ کے طور پر پیش کیا۔

اس استقبالیہ میں کراچی کے ممتاز ادیب و شاعر شریک ہوئے۔

۔کراچی

ایک خط

ایفرو ایشین رائٹرز بورڈ
۴۳ ۔ کیسل اسٹریٹ
کولمبو ۔ ۸
سیلون

مورخہ ۱۵ جنوری ۱۹۶۵ء ۔

عزیز دوست !

سب سے پہلے میں اپنی جانب سے نیز ایفرو ایشائی ادیبوں کے مستقل شعبے کی طرف سے آپکا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ جب آپ کے ملک میں ایفرو ایشائی ادیبوں کا وفد پہنچا تو آپ سبھوں نے اس کی خاطر خواہ پذیرائی کی ۔

مجھے یقین ہے کہ اس قسم کی سرگرمی اور براہِ راست ربط ہمارے تعلقات کو استحکام عطا کریگا۔ تاکہ ہم آئندہ اپنی تحریک کو قوی تر بنا سکیں ۔

وفد کے قائد نے جو رپورٹ پیش کی ہے' اس سے آپ کے ملک کے موجودہ حالات' آپ کے عوام کی جدوجہد اور خصوصاً ادیبوں کا اپنے ہم وطنوں نیز افریقہ اور ایشیا کے رہنے والوں کے ساتھ ربط اور لگاؤ سے میں بہ خوبی واقف ہو گیا ہوں ۔

صحیح معنوں میں ایفرو ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے مستقل شعبے کے لئے یہ ایک حوصلہ افزا بات ہے اور ہم اس کے ذریعہ تحریک کے تقاضوں کو بخوبی پورا کرسکیں گے ۔

جہاں مجھے آپ سے مزید تعاون کی توقع ہے' وہاں میں آپ سے اس امر کی بھی درخواست کروں گا کہ جب ہمارے وفد نے آپ کے ملک کا دورہ کیا تھا' اس وقت کی مختصر رپورٹ' خبریں' تصاویر' یا کوئی اور ضروری معلومات ازراہِ کرم فراہم کر دیں ۔ اگر یہ سب چیزیں موصول ہو گئیں تو ہم اس کی بے حد قدر کریں گے ۔

مجھے یقین ہے کہ محض اسی تعاون اور آپس کی دوستی سے ہم اپنی تحریک کو مضبوط کرسکتے ہیں اور اپنی قومی آزادی' جمہوریت اور امنِ عالم کو اپنے عام دشمن ــــ شہنشاہیت' قدیم و جدید نوآبادیاتی نظریہ ــــ سے محفوظ رکھنے کی جدوجہد میں باہم متحد ہو کر آگے رواں رہیں گے ۔

افریقہ و ایشیا کے بہادر سپوتو زندہ باد — افرو ایشائی ادیبوں کی دوستی زندہ باد

سیکریٹری جنرل

ڈاکٹر عندلیب شادانی

سنہرا دیس

جغرافیائی حد بندی اور جائے وقوع کے لحاظ سے پاکستان مشرقی اور مغربی دو حصوں میں منقسم ہے جنھیں ہم بازو بھی کہتے ہیں جب تک پاکستان کے مشرقی اور مغربی دونوں بازوؤں کو بیک وقت پیش نظر نہ رکھا جائے پاکستان کا صحیح تصور ممکن نہیں ۔

بدقسمتی سے پاکستان کے دونوں بازوؤں کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلہ ہے اور اس بُعدِ مسافت کی بنا پر مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان اجنبیت اور غیریت کی دیواریں حائل ہیں ۔ حکومت پاکستان اور ہوا خواہانِ وطن شروع ہی سے ان دیواروں کو ڈھانے اور دونوں بازوؤں کے باشندوں کو ذہنی طور پر قریب لانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں ۔ ملک کے ادیبوں نے بیگانگی کے ان پردوں کو اٹھانے میں انفرادی طور پر بڑا کام کیا ہے ، چنانچہ وفا راشدی کی کتاب " سنہرا دیس " بھی اسی قسم کی ایک کامیاب کوشش ہے ۔

قدیم الایام سے شمالی ہند میں بنگالی کے متعلق بعض ایسی باتیں مشہور رہی ہیں جنھیں کسی طرح بھی خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ یہاں کی آب و ہوا خصوصیت کے ساتھ مضرِ صحت سمجھی جاتی ہے ۔ کہتے ہیں کہ مغلیہ سلاطین کے زمانے میں جب کسی امیر پر کا عتاب نازل ہوتا تھا تو سزا کے طور پر اسے گورنر بنا کر بھیج دیا جاتا تھا ۔

آج سے ۲۷ سال قبل جب میں نے مستقل طور پر سے ڈھاکہ آنے کا ارادہ کیا تو مجھے بھی میرے دوستوں نے سمجھایا کہ خدا کے لئے جان بوجھ کر اپنی جان کے پیچھے نہ پڑو مان لو زندہ بھی رہے اور فیل پا جیسا کوئی روگ لگ گیا تو کروگے " ایک صاحب جو بنگال ہو آئے تھے کہنے لگے " میں بنگال بڑا گندا ملک ہے ، مچھر کو مارو تو اس میں سے خون کے با کیچڑ نکلتی ہے " غرض اس قسم کی بہت سی خرافات سنی لیکن جب میں ڈھاکے آیا اور یہاں کے حالات بچشم خود دیکھے تو بنگال کا جا پر چل گیا ۔ اور ایک مجھ ہی پر کیا منحصر ہے جو ایک بار یہاں آیا یہیں کا ہو رہا ۔

وفا راشدی نے " سنہرا دیس " میں مشرقی پاک کے بہت سے اہم پہلوؤں کی بڑی دلکش تصویریں پیش کی ہ

اور یہ تصویریں خیالی نہیں واقعی ہیں ۔ مشرقی پاکستان کی قدیم و جدید پوری تاریخ کو نہایت سلیقہ مندی کے ساتھ ایجاز و اختصار کے دامن میں سمیٹ لیا ہے ۔ صوفیائے کرام جن کی روحانیت کے اثر سے یہ پورا خطہ اسلام کا گہوارہ بن گیا اپنے اپنے مقام پر بڑی شان سے جلوہ گر ہیں ۔ ڈھاکہ چاٹگام کوکس بازار اور سلہٹ میں سے ہر ایک قاری کا دامنِ دل اپنی طرف کھینچتا ہے ۔ قدیم ادبیات کا مختصر تذکرہ پوتھی ادب کا ذکر، انیسویں اور بیسویں صدی کے ادیبوں خصوصاً قاضی نذرالاسلام، کوئی غلام مصطفےٰ اور کوی جسیم الدین کا تعارف ذہن کو بالیدگی اور دل کو سرور بخشتا ہے ۔ دیہاتی زندگی کی سادگی اور بے تکلفی عوام الناس کی وطن دوستی اور اسلام پر مبنی ان کا تمدن اور کلچر، فنونِ لطیفہ سے ان کی گہری دلچسپی ملک کی سرسبزی اور شادابی و موسموں کا اعتدال، قدرتی مناظر کا حسن غرض ہر چیز کو اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ پڑھنے والا اس دیس کا نادیدہ شیدائی ہو جاتا ہے ۔ اس زرخیز ملک کو انہوں نے سنہرا دیس کہا اور بجا کہا ۔ بیشک یہاں کی زمین سونا اگلتی ہے ۔۔ بلا شبہ پاٹ کے ریشے چاندی کے تار ہیں، دیکھنے میں بھی، قیمت میں بھی ۔ پھر کتاب کا اندازِ بیان نہایت دلکش ہے، زبان سادہ اور آسان، باتیں سچی اور دلنشیں، اپنے ملک کی خوبیوں کا یہ دلچسپ تذکرہ پڑھ کر قدرتی طور پر دل باغ باغ ہو جاتا ہے ۔

واقعہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں ایسی بہت سی چیزیں بہت سی باتیں ہیں جو مشرقی پاکستان میں نہیں ۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں ایسی کتنی ہی چیزیں کتنی ہی باتیں ہیں جو مغربی پاکستان کو نصیب نہیں ۔ اس لئے جب مغربی اور مشرقی دونوں بازوؤں کو یکجا کر کے دیکھئے تو پاکستان ایک مکمل ایک عظیم الشان اور ایک قابلِ رشک مملکت بن جاتا ہے ۔ اور دونوں بازوؤں کو علیحدہ علیحدہ کر کے دیکھئے تو پاکستان اپنی خوبی اور عظمت کے لحاظ سے کچھ بھی نہیں رہتا ۔ سنہرا دیس کے مطالعے سے اہلِ وطن کی بہت سی بدگمانیاں اور غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی —— وفا راشدی نے "سنہرا دیس" لکھ کر ایک قابل قدر خدمت انجام دی ہے جو ہر طرح تحسین اور ہمت افزائی کی مستحق ہے ۔

بقیہ: سرخ چوڑیاں

پہننے کی آرزو ختم ہو جائے گی ۔ سرخ سنہری کام والی چوڑیوں کے لئے وہ برسوں سے کہہ رہی ہے ۔۔ مگر وہ ہمیشہ ٹال جاتا ۔۔ اب وہ خوش ہو جائے گی ۔۔ وہ سوچنے لگا ۔۔ شمو کتنی بھولی ہے ۔ کتنی معصوم ہے اس نے کبھی سونے کے زیور کی فرمائش نہیں کی ۔۔ ہمیشہ چوڑیوں کے لئے روتی رہی ۔۔ اور پھر اسے اپنے آپ پر غصہ آیا کہ آخر کیوں وہ اتنے دن ٹال مٹول کرتا رہا ۔۔ پر میرا بھی کیا قصور ۔۔ عید سے پہلے کام ہی مندا تھا ۔۔ اب ذرا پیسہ آیا تو میں چوڑی لے آیا ——

سارے راستے وہ شمو کی گوری گوری کلائیوں میں سرخ سنہری کام والی چوڑیوں کا تصور کرتا رہا ۔

گھر آکر اس نے کنڈی کھٹکھٹائی ۔۔ شمو اٹھ اٹھ کر کنڈی کھولنے آئی ۔۔ اس کی چوڑیوں کی جلترنگ گونجی ۔۔۔ اور امین اپنے تصور پر مسکرا دیا ۔۔ جیسے ہی شمو نے کنڈی کھولی امین کی نظر ایکدم شمو کی کلائی پر گئی

"ارے ! ۔۔ تو نے یہ چوڑیاں کہاں سے پہن لیں"

"امینے ! یہ سرخ سنہری کام والی ۔۔۔۔ بھر بھر ہاتھ چوڑیاں مجھے کریم نے پہنائی ہیں ۔۔ بڑے نرم ہاتھوں سے پہنائے ہیں"

اور امینے کے ہاتھ سے ایک چھناکے کے ساتھ وہ دو درجن چوڑیاں گر کر زمین پر بکھر گئیں ——

—— سرخ سنہری کام والی چوڑیاں ——

فہمیدہ اختر

سہ نثر ظہوری

فارسی ادب کا ایک یادگار باب

فارسی نظم و نثر کے ارتقاء میں برصغیر ہند و پاک کا بڑا حصہ ہے عادل شاہی اور مغل خاندانوں کے عہد میں تو خصوصیت کے ساتھ اس زبان میں معیاری تخلیقات پیش کی گئیں۔ لیکن تعجب کا پہلو یہ ہے کہ فارسی ادبیات کی تاریخوں میں ان کا ذکر بڑا سرسری طور پر ملتا ہے ۔ حالانکہ اکثر تصانیف بعض حیثیتوں سے منفرد رنگ رکھتی ہیں۔ اس لحاظ سے زبان و ادب کے ارتقار کی تاریخ میں ان کا ذکر اور بھی لازمی ہو جاتا ہے۔ ان یادگار تحریروں میں سے ایک سہ نثر ظہوری بھی ہے ۔

دکن کے عادل شاہی خاندان کے حکمراں ابراہیم عادل شاہ نے علم موسیقی میں ایک کتاب "نورس" لکھی تھی سہ نثر ظہوری اسکے تین دیباچے ہیں ۔ ترتیب کے لحاظ سے کتاب قدیم رنگ رکھتی ہے شروع میں خدا کی تعریف ہے اس کے بعد رسول اکرم صلعم کی ثنا ہے بعد ازاں اصل مدعا کی طرف رجوع کیا گیا ہے اور مختلف حیثیتوں کو سامنے رکھ کر ابراہیم عادل شاہ کی تعریف کی ہے ۔ اسکی شاعرانہ صلاحیتوں کو سراہا ہے اسکی مصورانہ خصوصیات کی مدح کی ہے اور اس کی ادب نواز اور علم پرور طبیعت کی توصیف کی ہے ۔

موضوع کے لحاظ سے سہ نثر ظہوری کی کوئی اہمیت نہیں موضوع وہی ہے جو تاریخ کے مختلف ادوار میں درباروں سے واسطہ بیشتر اہل قلم کا رہا ہے یعنی مدح و ستائش ۔ لیکن جو صفت فارسی نثر کی تاریخ میں سہ نثر ظہوری کو زندہ رکھ سکتی ہے ۔ وہ زبان و بیان پر ظہوری کی غیر معمولی قدرت ہے ۔

ظہوری ان اہل علم میں سے ہے جو مشکل پسندی کو تخیل کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور جن کی توجہ نفسِ مضمون سے زیادہ عبارت کی آرائشگی کی طرف رہتی ہے ۔ ظہوری اس میدان میں بہت زیادہ کامیاب رہا ہے اور اس کی کئی وجوہ ہیں ۔ اس کے پاس پر شکوہ اور جاندار الفاظ کا بھاری ذخیرہ ہے وہ ان الفاظ کو سلیقہ کے ساتھ استعمال کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے ۔ اس کا تخیل بے پناہ طاقت کا حامل ہے اسکا ذہن اس کے قلم کے ساتھ برابر ہم آہنگ رہ سکتا ہے ۔ چنانچہ ظہوری نے جس نثر کی تخلیق کی ہے وہ رنگ

متقفیٰ اور مسجع ہے ۔ فقرے طویل طویل ہیں اکثر مقامات پر عبارت میں الجھاؤ پیدا ہوگیا ہے لیکن یہ بات بھی ضرور ہے کہ مفہوم دبنے نہیں پاتا اور یہ امر اس بات کا ثبوت ہے کہ ظہوری مشکل پسند ہونے کے باوجود معنی کی اہمیت کو جانتا ہے اور الفاظ کی میناکار دنیا میں بھٹکنے نہیں پاتا۔ گو معنی محض تعریف و توصیف سے تعلق رکھتے ہیں کہنا یہ ہے کہ تعریف و توصیف کا احساس برابر برقرار رہتا ہے ـــــ ظہوری صنائع لفظی و معنوی کا استعمال بھی کثرت سے کرتا ہے، تشبیہ، استعارہ، تجنیس، اشتقاق اور حسن تعلیل وغیرہ وغیرہ، صنائع لفظی و معنوی کی مثالیں ہر صفحے پر ملتی ہیں اسکا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ عبارت پر تکلف کا رنگ چھا گیا ہے۔ ظہوری کی نثر میں حُسن ہے لیکن بہت زیادہ تکلف نے اسے ابھرنے نہیں دیا۔ نفس مضمون کی رعایت سے مبالغہ آرائی کی کوئی حد ہی نہیں۔ اشعار کا استعمال بھی عام طور پر کیا گیا ہے لیکن ہر شعر موقع و محل سے پوری نسبت رکھتا ہے۔ اس لئے اشعار کے استعمال سے عبارت کو بڑی تقویت ملی ہے نثر کی نسبت اشعار دقیق بھی نہیں

فارسی ادبیات میں کئی ایسی اہم کتابیں موجود ہیں جو اندازِ بیان کے لحاظ سے سہ نثر ظہوری سے مشابہت رکھتی ہیں جب تک ان کے ساتھ موازنہ نہ کیا جائے سہ نثر ظہوری کا مقام ٹھیک طور پر معین نہیں ہو سکتا۔ مقامات حمیدی، اخلاق ناصری، ظفرنامہ تیموری، تاریخ وصاف، ابوالجنان، اعجاز خسروی، تاریخ فرشتہ، خزائن الفتوح، پنج رقعہ، اخلاق محسنی اور شبنم شاداب وغیرہ ـــــ فارسی ادب کی یہ یادگار کتابیں طرزِ ادا کے لحاظ سے سہ نثر ظہوری سے بہت حد تک مماثلت رکھتی ہیں۔ جہاں تک نفسِ مضمون کا تعلق ہے ان تمام کتابوں کی بنیاد کسی نہ کسی موضوع پر ہے، کسی کی حیثیت تاریخی ہے، کسی کی اخلاقی اور کوئی خطوط کا مجموعہ ہے۔ اس لحاظ سے سہ نثر ظہوری کو ان سے کوئی نسبت نہیں۔ اس کے نفس مضمون کا اطلاق تاریخ، سیاست، ادب، اخلاق اور فلسفہ وغیرہ کسی موضوع پر نہیں ہو سکتا، اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ ظہوری نے نثر میں ابراہیم عادل شاہ کا قصیدہ لکھا ہے ـــ البتہ اس کے اسلوب کو ہم فارسی ادب کی زندہ رہنے والی بعض کتابوں کے اسلوب کے برابر درجہ دے سکتے ہیں۔

سہ نثر ظہوری کے طویل طویل اور الجھے الجھے فقروں کو سامنے رکھ کر یہ رائے بھی دی جا سکتی ہے کہ یہ چیستان سے کم نہیں اور "مقامات حمیدی" کے متعلق ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں کہ یہ کتاب چیستان پر مشتمل ہے۔

"تاریخ وصاف" پر بناوٹ کا رنگ غالب ہے اسمیں تشبیہ اور استعارہ کا اسقدر استعمال کیا گیا ہے کہ معنی دب کر رہ گئے ہیں۔ فقرے ہم قافیہ ہیں طولِ کلام اور لفاظی کی کوئی حد نہیں یہ تمام خصوصیات کم و بیش سہ نثر ظہوری میں موجود ہیں اگر فرق ہے تو یہ کہ ظہوری وصاف کی طرح ہر صفحے پر عربی عبارتوں کا استعمال نہیں کرتا۔

"اعجازِ خسروی" اس لحاظ سے سہ نثر ظہوری سے مشابہت رکھتی ہے کہ اس میں سہ نثر ظہوری کی طرح ایہام، تضاد، طباق اور مراۃ النظیر کی بہت زیادتی ہے۔ بقول مولانا محمد حسین آزاد ـــــ "لغت بازی اور جگت بازی کا مینہ برس رہا ہے اس دھواں دھار میں تاریخی آگاہی، اخلاقی تاثیر، عملی مسائل اور مذہبی ہدایت کچھ کم نظر نہیں آتی"۔

"خزائن الفتوح" پر مبالغہ کا رنگ گہرا ہے اور سہ نثر ظہوری کی سب سے نمایاں صفت یہی ہے۔ مثلاً ظہوری ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں کہتا ہے۔

"سورج نے تمام دنیا میں اپنی شعاعوں کا جال اس لئے پھیلایا ہوا ہے کہ بادشاہ کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ لے"۔

"بادشاہ کے بلند مرتبہ کے محل کو دیکھ کر عقلِ دوررس کا سررشتہ کے ساتھ گم جاتا ہے"۔

"جب وہ مصوری کیلئے تیار ہوتا ہے تو اسکا مو قلم حور و پری کے بالوں سے تیار کیا جاتا ہے"۔

"اس نے مصوری کا فن اسقدر سنوارا کہ
اس کی معمولی تصویر رونمائی میں چین کا ملک
مانگتی ہے"
"اگر بلبل کی تصویر کھینچے تو اس میں اتنی
اصلیت ہوگی کہ بلبل کی آواز سنی جا سکتی ہے
اور وہ آواز میں پرواز بھی پیدا کر سکتا ہے'
اس کی بنائی ہوئی چڑیا کاغذ پر ٹھہر نہیں سکتی
اگر اس کے پاؤں میں بادشاہ سلامت کی
محبت کا پھندا نہ پڑا ہو"

جہاں تک "ابواب الجنان" کے رنگین الفاظ اور صنائع وبدائع میں اُلجھے ہوئے فقروں کا تعلق ہے اس میں اور سہ نثر ظہوری میں کوئی بُعد نہیں، یہی نوعیت مینا بازار کی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے شبنم وشاداب پر یوں تبصرہ کیا ہے۔
"فقط ایک باغ کی تعریف ہے، وہی استعارہ اور تشبیہ کی بہار، خیال کے پھول مہک رہے ہیں رنگ اُڑتا ہے ثمر کچھ نہیں۔ وہم کی نہر بھی جاری ہے مطلب ندارد — سہ نثر ظہوری میں ابراہیم عادل شاہ کی ثنا رہے۔ مولانا آزاد کی شبنم وشاداب کے متعلق رائے کا اطلاق پوری طرح سے اس پر کیا جا سکتا ہے۔

ظفر نامہ تیموری، تاریخ فرشتہ، اخلاق ناصری — اخلاق محسنی اور بہارستان کا انداز نگارش بھی دقت پسندی کے لحاظ سے سہ نثر ظہوری کے عین مطابق ہے۔

ظہوری کے اسلوب پر ہم کتنی سختی سے نکتہ چینی کریں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ پُرشکوہ پُرشوکت اور رنگین الفاظ کا ایک وسیع ذخیرہ رکھتا ہے۔ صنائع لفظی اور معنوی کے بے دریغ استعمال پر اُسے بے پناہ قدرت حاصل ہے مبالغہ آرائی کے باب میں وہ یکتا ہے اس کے تخیل کی قوت لامحدود ہے اگر نظم میں اس لحاظ سے انوری کا درجہ بلند ہے تو نثر میں ظہوری کا۔ برمحل اشعار لکھنے میں وہ بے مثل ہے۔ ہم ظہوری کے طرز کو بناوٹی پُرتصنع اور لایعنی بھی قرار دے سکتے ہیں لیکن زبان وبیان پر جو قدرت اسے حاصل ہے اس سے انکار نہیں کر سکتے نیز اپنے سامنے کوئی ٹھوس موضوع رکھے بغیر بھی قلم اور ذہن میں مکمل ربط کا قائم رکھنا انشا پردازی کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ درباداری کے رواج سے اعلیٰ صلاحیتیں ضائع ہوئی ہیں اور قیمتی قلم بھٹکے ہیں اگر ظہوری کا تعلق دربار سے نہ ہوتا تو اس ذہن اور قلم کا مالک یقیناً ایسی تخلیقات وجود میں لاتا جن سے فارسی ادب میں موضوع، زبان اور اسلوب کے لحاظ سے گرانقدر اضافے ہوتے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ وقت کے نامناسب تقاضے نے ایک اور ممتاز ادیب چھین لیا۔

بہرحال کئی حیثیتوں سے سہ نثر ظہوری فارسی ادبیات میں اب بھی ایک بلند مقام کی حامل رہ سکتی ہے اور عالمی ادب میں بھی یہ اپنی طرز کی واحد کتاب سمجھی جا سکتی ہے۔

گلڈ کی چھٹی سالگرہ



ڈھاکہ ہائیکورٹ کے چیف جسٹس مسٹر جسٹس سید محبوب مرشد
خطبہ صدارت پڑھ رہے ہیں



قائم مقام سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی خطبہ پڑھ رہے ہیں
دائیں سے بائیں: جناب ممتاز حسن، مینیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک آف پاکستان
جناب اختر حسین، چیئرمین نیشنل پریس ٹرسٹ ۔ عبداللہ ظہیر الدین



جناب ممتاز حسن، مینیجنگ ڈائرکٹر نیشنل بینک آف پاکستان تقریر کر رہے ہیں۔
بائیں سے دائیں: جمیل الدین عالی۔ مسٹر جسٹس سید محبوب مرشد۔
عبداللہ ظہیر الدین لال میاں



عبداللہ ظہیر الدین لال میاں صدر پاکستان رائٹرز گلڈ ٹرسٹ
تقریر کر رہے ہیں

روسی شاعر ۔ کراچی میں



(دائیں سے بائیں) [illegible] رسول حمزہ ۔ [illegible] ۔ جناب رسول حمزہ ۔ [illegible] ۔

چینی ادیبوں کے اعزاز میں دعوت استقبالیہ



[illegible] جناب فیض احمد فیض ۔ [illegible]

چینی ادیبوں کی یونین کا خط

Chinese Writers' Union

中国作家協会

22 TUNGTSUNGPU HUTUNG
PEKING, CHINA
北京東總布胡同廿二號

巴基斯坦作家同人会代理总书記

親敬的阿里先生：

中国作家姜彬先生和石鈡先生到貴国訪問，希望他們在貴国訪問期間能得到您的协助，和巴基斯坦作家能有亲切的会晤。謹向您并通过您向巴基斯坦的作家致以良好的祝愿。

محترم عالی صاحب!

قائم مقام سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ

دو چینی ادیب مسٹر چیانگ پن اور مسٹر شی چنگ آپ کے ملک کے دورے پر تشریف لے جا رہے ہیں
اُمید ہے کہ آپ ان کے ساتھ پورا تعاون کریں گے۔ وہ پاکستانی ادیبوں سے ملاقات بھی کریں گے۔
ہماری نیک تمنائیں آپ اور جملہ پاکستانی ادیبوں کے ساتھ ہیں۔

چینی ادیبوں کی یونین
مورخہ ۷ر فروری ۱۹۶۵ء

حزیں لدھیانوی

مرزا غالب

زیست کا پاسدار تھا غالبؔ
مشعلِ رہگذار تھا غالبؔ
تیرِ ظلمت شکار تھا غالبؔ
روشنی کا منار تھا غالبؔ

اس کے دم سے تھی شانِ سرو قداں
کشتۂ زخمِ دار تھا غالبؔ

ہاتھ ہوتے رہے قلم پھر بھی
داستانِ جنوں لکھی اُس نے
زیست تھی انقلاب کی تصویر
پھر بھی ہنس کر گذار دی اس نے

عرفیؔ و انوریؔ کا ہم پایہ،
ثانیٔ صائبؔ و کلیمؔ و اسیرؔ
میرؔ و بیدلؔ کی عظمتوں کا امیں
افقِ شعر کا تھا ماہِ منیر

هم قلم کراچی

اُس کے نغمے تھے زندگی افروز
باغِ ہستی کا عندلیب تھا وہ
دیو و جن و پری کے دَور میں بھی
کتنا انسان کے قریب تھا وہ

اس کے ہر شعر میں تھا سحرِ حلال
گنجِ معنی تھی شاعری اُس کی
ظلمتوں کے جگر کو چیر گئی
مثلِ خورشید روشنی اُس کی

لیکن اُس روشنی کو ڈال دیا
زرپرستوں نے قصرِ زنداں میں
یوں بھی ڈھلتے ہیں ظلم اہلِ ستم
یوں بھی ہوتا ہے بزمِ دوراں میں

جانے کب سے یہ رسم جاری ہے
"آج وہ، کل ہماری باری ہے"

○

ریاض انور

آوازوں کا بھنور

(مشرقی پاکستان کے بارے میں زیر تحریر نظم کا ایک حصّہ)

یہ موسمِ برشگال
عہدِ وصال
گاتے ہوئے سموں کے دلوں کی دھڑکن
سمن بروں، مہ وشوں، حسیناؤں کے
دلوں کے سکون کا دشمن
گلی گلی مستیوں کا ڈیرا
نگر نگر قہقہوں کا مسکن
ہر ایک گوشۂ گشت، مثلِ بہشت رشکِ ہزار گلشن
کنواریوں کے دلوں سے ابھرے
لبوں سے چھلکے
وہ گیت جن پہ نثار ہو چاندنی کا جوبن

مچل رہے ہیں تڑپتی لہروں پہ شام کے سرمئی اندھیرے
نثار ہوں جن کی دلکشی پر بہار کے عنبریں سویرے
ندی[1] کے سینہ پر جل اٹھے ہیں چہار جانب چراغ کتنے
جھکی گھٹاؤں کے زیرِ سایہ دمک رہے ہیں ایاغ کتنے

---

[1] بنگلہ میں دریا کو ندی کہتے ہیں۔

اداس مانجھی، فریب مانجھی دلوں میں صدیوں کا غم چھپائے
قدم قدم جن کے ساتھ چلتے ہیں موت کے بیقرار سائے
صبا کی رفتار سے اڑے جا رہے ہیں اپنے گھروں کی جانب
کنارِ دریا پہ چشم پرنم
پیا کی رہ تک رہی ہے برہن
ہے منتظر جس کے دل کا آنگن
کرے گا اپنے جوان ہاتھوں سے
آکے کوئی چراغ روشن
ندی کے ساحل پہ ہانپتی سر پٹکتی لہروں کا شور پیہم
پھسل کے ہونٹوں سے آتشیں گیت، ہجر کا میت
تیرتا ہے گرجتے بادل کے دوش پر مثلِ نوحۂ غم

لوٹ آؤ من موہن[۱]
تم کس دیس سدھارے
روؤں ندی کنارے
گھاٹ پہ بیٹھی راہ تکوں میں تیرا تو کب آئے
تجھ بن ساجن بے کل من اک پل بھی چین نہ پائے
دریا کی لہروں کے ساتھ یہ پاگل بہتا جائے
تم جیتے ہم ہارے
لوٹ آؤ من موہن
روؤں ندی کنارے
تم تو تھے میرے جیون کی ناؤ کے پتوار
کس نگری میں جا کے بسے ہو چھوڑ اس پار
دل دریا میں دکھ کی لہریں اٹھیں سو سو بار
ڈوب چلے ہیں تارے
لوٹ آؤ من موہن
روؤں ندی کنارے

۱۔ بنگلہ لوک گیت بھٹیالی کا ترجمہ۔

کنواریاں شوخ ناریاں
رنگ رنگ کی ساریوں میں لپٹی
لجاتی، شرماتی، گنگناتی
قدم قدم خود ہی مسکراتی
حسین کھیتوں کی ٹیڑھی پگڈنڈیوں پہ ایسے رواں دواں ہیں
فضا سے جیسے دھنک اتر کر زمیں پر ہر سو بکھر گئی ہو
کہیں کہیں رک کے دھان کی نرم کونپلوں کو وہ چومتی ہیں
کہیں کسی تاریل کے سائے میں بیٹھ کر چشم نیم وا سے
فضا میں بہتی ہوئی گھٹاؤں کو دل ربائی سے دیکھتی ہیں
طویل زلفوں، سیاہ چشموں کا سحر سارے میں پرفشاں ہے

گھنے درختوں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بزمِ یاراں سجی ہوئی ہے
نفس نفس میں مسرتوں اور سکوں کی خوشبو لسی ہوئی ہے
کسی کے ہونٹوں پہ قہقہے ہیں کسی کے ہونٹوں پہ بنسری ہے
ہوا میں گیتوں کی گنگناہٹ، فضا میں قوسِ قزح کھچی ہے
چھڑی ہوئی ہیں گئے زمانوں کی، مہ لقاؤں کی داستانیں
دکھوں کے لمحوں۔ خوشی کی گھڑیوں، حسیں گھٹوں کی داستانیں
جو قحط کی نذر ہو گئے ان الم نصیبوں کی داستانیں
جو بادوباراں میں مر مٹے ان غریب لوگوں کی داستانیں
کسی جگہ دوڑ کشتیوں کی کہیں کبڈی کا شور برپا
کہیں مزاروں پہ جمگھٹے ہیں کہیں کوئی گان محفل آرا
کہیں تو ہلکی سی پھوار جیسے ہوائیں ملہار گا رہی ہوں
کہیں گھٹا ٹوٹ کر برستی ہے جیسے آکاش پھٹ پڑا ہو
ہرے بھرے کنج، بہتے نوکے، مہکتے رنگ اور مچلتے دریا
لگا ہوا ہے فنا کے سائے میں زندگی کا حسین میلا

مہ دیہات میں بیت بازی کی محفلیں۔

صادق مصور

دریچے

پھر تری یاد نے خوابوں کے دریچے کھولے
نیلے پربت، کھلا آکاش، صنوبر کے درخت
وادیاں سرخ گلابوں سے چراغاں جیسے
لہریا ندیاں، بل کھاتا چمکتا پانی
تیری زلفوں کا ہر اک موڑ فروزاں جیسے
شوخ رنگوں میں سا گئی ہو کہسار کی شام
حاشیئے رات کے آتش بہ گریباں جیسے!

نیلگوں، سبز، سیہ، بھوری چٹانوں کا وجود
عشرتِ زیست میں سنگین حوادث کی نمود
جن سے ٹکرا کے کئی پیکرِ رنگین جمال
کانچ کے ریزوں کی مانند بکھر جاتے ہیں
جنکی پرچھائیں ہیں احساس کے شعلوں کے الاؤ
سرد، بے جان چتائیں سی نظر آتے ہیں
نیلگوں، سبز، سیہ، بھورے نکیلے پتھر
جیسے بے مہریٔ ایام کے زخموں کے نشان
جن کی بے نام خلش سے دلِ ہستی ہے فگار
جنکی بے رحم جراحت سے رُخِ زیست دھواں!

ایسے عالم میں ترے حسنِ گریزاں کی شفق
کتنے ہی رنگ فضاؤں میں لٹاتی جائے
رات کے پھیلتے سایوں میں ترے روپ کی لو
کتنے ہی دیپ خلاؤں میں جلاتی جائے
غم کی راہوں میں تری زلف پریشاں کی مہک
خوشبوؤں کی کوئی دیوار اٹھاتی جائے
ذہن کی دھند میں اس تیرے تبسّم کی کرن
فکر و تخلیق کے آئینے سجاتی جائے
تلخ لمحات میں گھُل کر ترے لہجے کی مٹھاس
وقت کے زہر میں تریاق ملاتی جائے!

۲

لیکن اس وقتِ خرابی کے گرانبار ستم
زہر ایسے ہیں کہ تریاق کو ڈس جاتے ہیں!
خاک کی گود میں سمٹے ہوئے نازک ذرّے
جاگ پڑتے ہیں تو آفاق کو ڈس جاتے ہیں
جوہر و برق کی تابش سے ابھرتے سائے
سانپ بن کر ترے عشاق کو ڈس جاتے ہیں

یہ تری زلفِ طلائی کا اچھوتا ریشم
جس سے ہر شعر کے اطلس کی زمیں بنتی ہے
تیری آنکھوں کے یہ سیّال نگینے جن میں
نکہت و رنگ کی ہر موجِ حسیں بنتی ہے
اس نئے جوہری ماحول کی تابانی میں
کتنے پژمردہ و بیمار نظر آتے ہیں

ہم قلم۔ کراچی۔

تابکاری کی فضاؤں میں ترے حسن کے رنگ
ذوق و وجدان پہ یوں بار نظر آتے ہیں
جس طرح گردشِ دوراں میں غمِ دل کی لپک
شام کے حبس میں جیسے ترے جوڑے کی مہک!

صبح دھندلا گئی پروانوں کی خاکستر سے
دل کے ویرانوں میں آوازِ بکا آتی ہے
شب کے آنچل سے ستاروں کا دھواں اٹھتا ہے
معبدِ حسن سے ماتم کی صدا آتی ہے

جیسے اس شہر میں تیری یہ سنہری آواز
زیست کی تلخ نواؤں کا گلہ کرتی ہو
جس طرح وقت کے ہاتھوں کسی احساس کی موت
تیری رنگین اداؤں کا گلہ کرتی ہو
دشتِ افلاس میں جیسے کسی فنکار کی لاش
اپنی دنیا کے خداؤں کا گلہ کرتی ہو

احمد رئیس

آخری خط

........!
میں کہ فرصت کے رنگین اوقات میں
تیرے خط کے چمن زار سے
تیری تحریر کے پھول چنتا رہا
زندگی کے حسیں خواب بنتا رہا

تیرے لفظوں کی توس قزح
میری آنکھوں کی ٹھنڈی خنک جھیل میں
لہلاتی رہی
تیرے وعدوں کی، اقرار کی چاندنی
پیار کی روشنی
میرے دل کے افق زار پر جگمگاتی رہی

میں کہ فرصت کے رنگین اوقات میں
تیرے خط کے چمن زار سے
تیری تحریر کے پھول چنتا رہا

آہ! لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ تو
اک نئے موڑ پر
یوں اچانک بچھڑ جائے گی
ہجر کا داغ دے جائے گی
چاندی، سونے کے اک دیوتا کے لئے
اجنبی آشنا کیلئے

تیرے لفظوں کی قوسِ قزح
تیرے وعدوں کی، اقرار کی چاندنی
پیار کی روشنی
آپ ہی آپ ڈھل جائے گی

تیرے خط کا چمن زار جل جائے گا
تیری تحریر کے پھول کملائیں گے!

○

ہم قلم۔کراچی۔

رحمٰن جامی

گریزاں

ایک حسین لمحہ گزرا تھا
جسکی یاد قیامت بن کر
میرے دل کو کتنے دھوکے دے جاتی ہے

پھر بھی میرا دل ــــــــــ
ذہن کو اپنا دوست بنا کر
کھول کے اُمیدوں کا دریچہ
شہرستاں سے آنے والے ہر جھونکے سے
حال کسی کا پوچھ رہا ہے
پوچھ رہا ہے ــــــــــ
کیا میرا ابھی نام کبھی اسکے ہونٹوں پر
آجاتا ہے
کیا میں اس کو یاد آتا ہوں

لیکن اِس پر
شہرستاں سے آنے والا ہر جھونکا خاموش ہے ابتک

کوی جسیم الدین
ترجمہ۔ انور شعور

او پدما کے مانجھی

او پدما کے مانجھی پیارے
ہم ساتھی ہیں تیرے، تیری
یہ ہچکولے کھاتی کشتی
اتراتی، اٹھلاتی کشتی
جلتی مستی کرتی لہریں
دبتی اور ابھرتی لہریں
اس کشتی میں، ان لہروں پر
ہم بھی تیرے ساتھ چلیں گے
اور بھاگوں کے پھل پھولوں پر
لائیں گے شاداب بہاریں
وہ بھی، ہم بھی تو بھی سارے
او پدما کے مانجھی پیارے

ہم نہیں ڈرتے طوفانوں سے
طوفانوں کو، طوفانوں میں
دُور بہالے جائیں گے ہم
کشتی کھیتے جائیں گے ہم

طوفاں ہیں پتوار ہمارے
او پدما کے مانجھی پیارے!
نیل گگن کے پیمانے میں
گو ہم پی تو چکے ہیں جانی
ساتوں دریاؤں کا پانی
ہم وہ شرابی ہیں کہ ہمارا
گنبدِ نیلوفر ساقی ہے
لیکن پیاس ابھی باقی ہے
اور پلا دے، اور پلا دے
او پدما کے مانجھی پیارے
علم کی دھن میں علم کی خاطر
اک رنگیں شاداب نگر سے
نکلے ہیں یہ سوچ کے گھر سے
گھر نہیں لوٹیں گے ہم ہرگز
علم کے سچے موتی جب تک
ہات نہیں آئیں گے ہمارے
او پدما کے مانجھی پیارے

(آزاد ترجمہ)

○

ہم آہنگ کراچی

جوش نمبر اور حفیظ نمبر جیسی بے مثال و لازوال دستاویزی اشاعتوں کے بعد

اب

افکار

اردو کے مایہ ناز شاعر

فیض احمد فیض

کی گراں مایہ خدمات کے اعتراف میں

فیض نمبر

پیش کر رہا ہے جو تیاری کی آخری منزلوں میں ہے

- فیض کی زندگی، شخصیت اور فن کے تمام پہلوؤں کا مکمل احاطہ۔
- فیض پر پاک و ہند کے مشاہیر اہل قلم اور بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیتوں کی گراں قدر تخلیقات
- ذاتی خطوط اور نادر و یادگار تصاویر۔
- فیض پر شائع شدہ مضامین کی کتابیات۔
- فیض کو طلبا و طالبات کا خراج عقیدت۔

سالانہ ممبر

بارہ روپے بذریعہ منی آرڈر بھیج کر یہ عظیم دستاویزی
پیش کش رعایتی قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں

مکتبہ افکار۔ رابسن روڈ۔ کراچی

واحد نظامی

نیا مکان

جمیل جب کھانا کھا کر چلا گیا تو اس کی ساس نے آواز دی۔

"بانو! او بانو!"

بانو چولہے کے پاس بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ ساس کی آواز سن

"آئی، اماں!"

بڑھیا چٹائی پر بیٹھ گئی اور انتظار کرنے لگی۔

تھوڑی دیر میں بانو آگئی۔ اس کا ہاتھ آٹے میں سنا ہوا تھا

اور ہتھیلیوں کو رگڑ رگڑ کے اسے چھڑا رہی تھی۔

"کیا بات ہے اماں؟"

"اری! آج جمیل کیوں بگڑ رہا تھا؟"

بانو کا چہرہ مرجھا گیا ——— لب سے کھسلتی ہوئی بولی۔

"کہتے تھے سالن پھیکا ہے!"

"سالن پھیکا ہے؟"

"جی!"

"عجیب لڑکا ہے ——— ذرا ذرا سی بات پہ بگڑ جاتا ہے ———

یہ بھی کوئی بگڑنے کی بات ہے!" اپنی حمایت کے دو بول سن کر بانو کا کمہلایا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔

سر جھکا کر بولی۔

"نہ جانے انھیں کیا ہو گیا ہے۔ جب سے اس گھر میں آئے ہیں ——— چھوٹی چھوٹی باتوں پر جرح کرتے ہیں ——— کچھ کہو تو بگڑ جاتے ہیں!"

"ہاں میں بھی یہی دیکھ رہی ہوں۔ جب سے اس گھر میں آیا ہے کچھ سے الجھتا رہتا ہے۔ کچھ پوچھتی ہوں تو بگڑ جاتا ہے۔ ٹھہر! آج دیکھتی ہوں!"

"نہیں اماں! آپ کو میری جان کی قسم! آپ انھیں کچھ نہ کہیں میں خود پوچھ لوں گی۔ خود سمجھا لوں گی۔"

بہو کی ضد کے آگے بڑھیا خاموش ہو گئی۔ لیکن اس کا جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ مرجھا گیا۔ اس نے غور سے بہو کو دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئی۔

جب سے جمیل اس گھر میں آیا تھا اس کا اطمینان چھن گیا تھا۔ ہر وقت ایک بے چینی، ایک اداسی اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی جس طرح

سوڈے کی بوتل میں بھری ہوئی گیس راہ نہ پاکر اندر ہی اندر سرد پڑ جاتی ہے جمیل بھی کچھ ایسا ہی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے اندر بھری ہوئی گیس آہستہ آہستہ سرد پڑ رہی تھی اور زندگی بے کیف ہوتی جا رہی تھی۔ وہ اکثر اس نئے جذبے کو سمجھنے کی کوشش کرتا۔ لیکن سمجھ نہ پاتا اس کی طبیعت میں بیزاری کا عنصر بڑھتا گیا اور وہ بانو کی ہر بات سے نفرت کرنے لگا۔

اس مکان میں آنے سے پہلے یہ لوگ نواب گنج میں رہتے تھے۔ مکان خاصہ بڑا تھا۔ دو کمرے تھے۔ صحن تھا۔ بیچ میں کنواں تھا۔ روشنی کے لئے بجلی بھی تھی اور فرش بھی پختہ تھا۔ جمیل نے ایک کمرہ ماں کو دے دیا تھا اور دوسرے میں خود رہا کرتا تھا۔ ماں اپنے کمرے میں بیٹھی اللہ اللہ کیا کرتی تھی۔ اور جمیل دوسرے کمرے میں بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا زندگی سکھ اور سکون سے کٹ رہی تھی۔

لیکن کون جانتا تھا کہ یہ مکان اتنی جلدی چھوڑ دینا پڑے گا۔ ایک دن مکان کے مالک نے کہا کہ آپ کوئی اور گھر تلاش کریں۔ میری لڑکی رنگپور سے آنے والی ہے۔ اس کو اس گھر کی ضرورت پڑے گی۔ جمیل کا دل تو نہ چاہتا تھا کہ یہ گھر چھوڑے۔ لیکن مجبور تھا۔ اسے اس گھر سے ایک گونہ محبت ہو گئی تھی۔ آس پاس بسنے والوں سے الفت ہو گئی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جلیل، خلیل، شمیم اور کلثوم سے کبھی جدا نہ ہو جلیل اسے اپنا بھائی سمجھتا تھا خلیل اس کا ہمراز تھا۔ شمیم سے اسے گہری عقیدت تھی۔ اور کلثوم تو جیسے اس پر جان چھڑکتی تھی۔ دیگر ہمسائے بھی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک بار جب جمیل بیمار پڑا تو محلے والوں نے اس کا بہت ساتھ دیا تھا۔ جلیل روزآنہ اسپتال سے دوا لاکر دیتا۔ خلیل نے کافی روپیوں سے مدد کی تھی شمیم نے بھی اپنا فرض پورا کرنے میں کمی نہ کی۔ کلثوم نے بھی تیمارداری میں رات دن ایک کر دیا۔ گھنٹوں سرہانے بیٹھی برف کی تھیلیاں سر پر رکھا کرتی۔ جمیل کی ذرا سی تکلیف کو وہ بہت سمجھتی۔ اور بانو کے دکھ سکھ میں برابر کی شریک رہتی۔ کبھی کبھی کلثوم اور جمیل کی بڑھتی ہوئی محبت کو دیکھ کر بانو کا دل کانپ جاتا۔ لیکن کلثوم کی صاف اور بے داغ آنکھوں کو دیکھ کر اسے محسوس ہوتا اس کی آنکھ کی طرح اس کا دل بھی آئینہ ہے۔

اگر محلے کے لوگ نہ ہوتے تو وہ اس بیماری سے نہ اٹھتا۔ اس نہ تھا۔ صرف بوڑھی ماں تھی اور بے چاری نقشین بیوی۔ گھر میں کوئی اور جو علاج معالجہ کے سلسلے میں اس کا ساتھ دیتا۔ یہ لوگ صرف تیماردا سکتے تھے۔ لیکن صرف تیمارداری سے کیا ہوتا ہے۔ وہاں تو کوئی بھی تھا جو بازار سے دوا لانے کا ساگو دانہ لا دیتا۔ یہ محلے ہی والے تھے نے اس کی ہر طرح مدد کی اور جب وہ اچھا ہو گیا تو سب کی آنکھ خوشی سے چمک اٹھیں۔

کلثوم بولی —— "بھائی جان! میں نے منت مانی تھی اچھے ہو جائیں گے تو گڑ چنے بانٹوں گی — خدا نے آپ کو اچھا کر دیا گڑ چنے۔"

جمیل مسکرایا۔ سوچنے لگا: "یہ لڑکی مجھ سے کتنی محبت کر خلوص اور محبت کے اس ماحول سے نکلنا، یہ گھر چھوڑ نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مکان کے مالک کا حکم خدائی فوجدار کے حکم کم نہ تھا۔ وہ بادل ناخواستہ مکان ڈھونڈنے نکلا۔ لیکن مکا ملنا آسان نہ تھا۔ بڑی مشکلوں سے شاہ جہاں پور میں ایک کم کچا مکان چالیس روپے ماہوار کرایہ پر ملا۔ وہ اس سے زیادہ کرا دے سکتا تھا اور دیتا بھی کیسے؟ کھانے والے چھ افراد تھے اور تنخ صرف ۔/۱۲۰ روپے ملتی تھی۔ نواب گنج والا مکان اس سے بڑا تھا لیکن کرایہ صرف ۲۰ روپے تھا۔ یہ مکان اس سے چھوٹا تھا لیکن کر اس سے دوگنا تھا۔ نواب گنج والا مکان اس نے آج سے پانچ پہلے کرایہ پر لیا تھا۔ ان دنوں کرایہ کافی کم تھا۔ لیکن جوں جوں ز گزرتا گیا مکانوں کے کرائے بڑھتے گئے۔ جو مکان ۲۰ روپے کرا پر مل جاتا تھا اب اس کے لئے ۶۰ روپے طلب کئے جاتے تھے۔ مجبوراً اس نے چالیس روپے کرایہ پر ایک مکان لے لیا اور گزارہ کرنے لگا۔ چھوڑتے وقت ہمسایوں کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ کلثوم جمیل کو الو کہتے ہوئے رونے لگی۔ اور بانو سے لپٹ کر بولی —— "بھابی! بھا تو نہ جاؤ گی؟" جمیل نے سب کو تسلی دی اور کہا: "میں مکان کی تلاش میں ہوں اگر اس طرف کوئی مکان مل گیا تو چلا آؤں گا۔ ویسے تم بھی کوشش کرو۔"

جمیل کو نئے گھر میں رہتے ہوئے تین مہینے ہو گئے تھے۔ لیکن ان پُر خلوص ہمدردیوں کی یادیں اب تک تازہ تھیں۔ کلثوم اسے بار بار یاد آتی۔ اس کا معصوم چہرہ۔ بے داغ آنکھیں، متبسم نظریں اس کے دل کے دامن کو کھینچتیں۔ وہ اس کے محبت آگیں لہجے کے سُرور میں کھویا رہتا۔ اس کی پُر خلوص خدمات کی یاد اسے بے چین رکھتی۔

دوسری طرف گھر کے بگڑے ہوئے حالات اور بانو کے غیر ہمدردانہ سلوک نے اسے اور بھی رنجور بنا دیا تھا۔ جو شخص روزمرّہ کو ہنستا اپنا محبوب مشغلہ سمجھتا تھا۔ آج خود ہنسنے کو ترس رہا تھا۔ اسے بانو سے نفرت ہو گئی اور مکان سے بھی اس کا دل دور ہونے لگا۔ وہ اس گھر کو دیکھ کر کڑھتا ــــ یہ مکان بھی کوئی مکان تھا۔ ــــ چاروں طرف بیڑے کی دیواریں تھیں جن کے روزنوں سے سرد ہوائیں اندر داخل ہو کر مکینوں کی نیند حرام کر دیتیں۔ چھت دھوئیں سے سیاہ ہو گئی تھی۔ دیواروں کا نچلا حصہ بارش سے بوسیدہ ہو گیا تھا اور اس میں بڑے بڑے سوراخ ہو گئے تھے۔ چھت کافی نیچی تھی کئی بار آتے جاتے اس کی پیشانی لہو لہان ہو گئی تھی۔ جگہ کی تنگی کے باعث میلے کپڑے دیوار اور چھت سے بندھے ہوئے بانس پر لٹکائے جاتے۔ یہ کپڑے جھنڈوں کی مانند پھڑپھڑاتے اور جمیل کا دل ڈوبنے لگتا۔ اسے اس گھر سے نفرت ہو گئی۔ لیکن حالات کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے سوا چارہ نہ تھا!

رات کو جب چولہا چکی نبٹا کر سونے کیلئے جگہ بنائی جاتی تو عجیب منظر ہوتا ــــ ٹوٹے پھوٹے برتن ایک طرف کو سرکا دیئے جاتے۔ اور اس طرح جو جگہ نکل آتی وہاں بچوں کو سُلا دیا جاتا۔ کونے میں بڑھیا تان کر سو جاتی۔ بچوں کے قریب بانو کا بستر ہوتا۔ اور کونے میں ٹوٹی ہوئی ایک پرانی چارپائی پر جمیل دراز ہو جاتا۔ اس چارپائی کے تختے جگہ جگہ سے دبے ہوئے تھے اور ایک پایہ غائب تھا۔ پائے کی جگہ چند اینٹیں رکھ دی تھیں۔

جمیل اکثر اپنا بستر چھوڑ کر بانو کے بستر پر آ جاتا۔ لیکن وہاں بھی نیند نہ آتی۔ بانو سے کسی بات پر جھڑپ ہو جاتی اور دونوں ایک دوسرے سے کئی دن تک نہ بولتے۔ جب سے اس گھر میں آئے تھے یہی حالت تھی۔

جمیل اکثر دوسرا مکان لینے کی سوچتا۔ لیکن کرایہ سن کر چپ ہو جاتا۔ وہ عجیب الجھن میں پھنس گیا تھا۔ بانو بھی کہتی "آپ دوسرا مکان کیوں نہیں لیتے۔ میرا تو یہاں دم گھٹتا ہے۔"

لیکن جمیل مجبور تھا۔ اس کے پاس اتنے روپے نہیں تھے کہ وہ زیادہ کرایہ ادا کر کے اس سے بڑا مکان لیتا۔

احساسِ ناکامی انسان کو چڑچڑا بنا دیتا ہے۔ جمیل بھی چڑچڑا ہو گیا تھا۔ بات بات پہ بانو سے لڑ پڑتا۔ کبھی کہتا سالن پھیکا ہے۔ کبھی کہتا کپڑے صاف نہیں دُھلے ہیں۔ کبھی بولتا "اب تم پہلی سی بانو نہیں رہیں" غرض آئے دن ایک نہ ایک بات ایسی کہہ دیتا جو جلتی پہ تیل کا کام کرتی اور دونوں الجھ جاتے۔

رات کا وقت تھا۔ لالٹین کی مدہم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ آس پاس سکوت تھا۔ بچے سو چکے تھے بانو بھی سو گئی تھی اور بڑھیا کے خراٹوں سے کمرہ گونج رہا تھا لیکن جمیل کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ جھوٹے برتنوں کے گرد چھچھوندر بار بار چکر لگاتی اور انہیں گرا کر چلی جاتی۔ جمیل کو اس سے بہت کوفت ہوتی لیکن جب بھی وہ اسے مارنے کیلئے اٹھتا وہ بھاگ جاتی اور جمیل ہارے ہوئے سپاہی کی طرح بستر پر لیٹ جاتا۔ چھت سے بندھے ہوئے بانس پر لٹکے ہوئے کپڑے نیم تاریکی میں چمگادڑ کی طرح پھڑپھڑا رہے تھے۔ سرد ہوائیں کمرے میں آ رہی تھیں۔ باہر چاند چمک رہا تھا اور اس کی روشنی بیڑے کی دیواروں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی۔ جمیل کی آنکھیں اب تک کھلی ہوئی تھیں۔ دماغ خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ اور نیند آنکھوں سے دور تھی۔ اس نے بچوں کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح سو رہے تھے۔ ماں پر نظر ڈالی وہ بھی سو رہی تھی۔ بانو کو دیکھا اس کی بھی آنکھیں بند تھیں۔ جمیل کا دل دھڑکنے لگا۔ اس کی نظریں بانو پر جم گئیں۔ سوئی ہوئی بانو بہت حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اور پلکوں کی ریشمیں جھالر اس کی آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور بانو کے قریب جا کر لیٹ گیا۔ بانو کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے مخمور آنکھوں سے جمیل کی طرف

دیکھا اور کروٹ بدل لی جمیل کا دم گھٹنے لگا ۔ اس لئے اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کی لیکن بانو اسی طرح لیٹی رہی جمیل سے ضبط نہ ہو سکا ۔ اس نے بہت مشکل سے اس کا منہ اپنی طرف کیا اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا ـــــ ۔

" بانو ! "

بانو نے نیم باز آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولی

" جی ! "

جمیل کے دل کا غنچہ کھل گیا ـــــ مسکرا کر بولا ـــــ

" تم اتنی چڑچڑی کیوں ہو گئی ہو ؟ "

" چڑچڑی ؟ "

" ہاں ! "

بانو چپ ہو گئی ۔ لیکن تھوڑی دیر بعد بولی ـــــ

" آپ سے کئی بار کہہ چکی ہوں کہ مجھے تنگ نہ کیا کریں ۔ "

" کیوں ؟ "

" بس ! "

" بس کیوں ؟ پہلے تو تم ویسی نہ تھیں ۔ "

بانو کی نظریں جھک گئیں ۔ اس نے لحاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ـــــ

" اب میں آپ کو کیسے سمجھاؤں ! "

جمیل کی سمجھ میں جیسے بات آ گئی ۔ مسکراتے ہوئے بولا ۔

" یقین مانو ۔ میں نے گھر کے سلسلے میں بے حد کوشش کی ۔ لیکن کم کرایہ میں اس سے بڑا مکان نہ مل سکا ۔ دو کمرے کے مکانوں کا کرایہ آج کل ۶۰ روپے سے کم نہیں ۔ اب تم ہی بتاؤ ! ہم غریب آدمی اتنا کرایہ کیسے دے سکتے ہیں ۔ "

بانو نے کوئی جواب نہ دیا ۔ صرف تکتی رہی ۔

جمیل نے باتوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا " وہ تو اللہ کی مہربانی تھی جو اتنا بڑا مکان بیس روپے کرایہ پر مل گیا تھا ۔ لیکن اس میں کب تک رہتے ۔ ایک نہ ایک دن تو چھوڑنا ہی پڑتا ۔ کوئی اپنی جائیداد تو تھی نہیں ۔ "

بانو کا دل پسیج گیا ـــــ جمیل نے اپنا ہاتھ اس کی کمر میں دیا ۔ اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا ـــــ

" بانو ! تم کتنی اچھی ہو ! "

بانو شرما گئی ۔ اس وقت بڑھیا کی آنکھ کھل گئی ۔ اس نے کھانستے ہوئے لحاف کو الٹ دیا ۔ لیکن جمیل اور بانو پر نظر پڑتے ہی فوراً لحاف ڈال لیا اور کروٹ بدل کر سو گئی ۔ بانو کا چہرہ احساس سے سرخ ہو گیا ۔ اس نے شرمائی ہوئی نظروں سے شوہر کی طرف دیکھا اور تیزی سے اٹھ کر باہر چلی گئی ـــــ

آفاق احمد

انکھیاں برسیں رم جھم رم جھم

ایک ایسی ہی رات تھی۔ پورے چاند والی رات۔ جب کوئی ابر نہ تھا۔ کالا بادل نہ تھا، چاروں طرف روشنی میں کائنات کی ہر شے غسل کرتی نظر آ رہی تھی۔ "سنبلستان" میں آج سے کہیں زیادہ چہل پہل نہ تھی۔

میں جانتی تھی کہ آج وہ آخری بار اس "دیارِ عاشقاں و بزمِ دلبراں" میں نظر آ رہا ہے۔ ہاں! ہم نے "سنبلستان" کو اس زمانے میں یہی نام دیا ہوا تھا ــــ آج کے بعد وہ یہاں آئے یا نہ آئے ــــ اسے کوئی کہہ نہیں سکتا تھا۔ میں نے چاہا کہ اس سے ملوں اور وہ سب کچھ کہہ دوں جو مدت سے آرزو بن کر میرے سینہ میں پل رہا تھا، جو دل بن کر دھڑک رہا تھا اور جو سانس بن کر مہک رہا تھا۔ وہ میرے پاس آیا۔ میں اس سے ملی بھی۔ پر نہ وہ کچھ کہہ سکا اور نہ میرے ہونٹ کھل سکے۔ جانے کے لیے مڑا تو میں اپنی ساری ہمتیں سمیٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"دیکھو! پتہ نہیں اب ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکیں گے، میں ــــ تم ــــ اور تم۔"

اس نے میرے ہاتھ میں ایک خوبصورت سی ڈائری تھما دی اور وہ تیز تیز چلتا ہوا میری نگاہوں سے دور ہو گیا۔ میں تا حدِ نگاہ اسے دیکھتی رہی۔ دل نے چیخ چیخ کر کہا کہ اسے اگر تو اس وقت نہ روک سکی تو زندگی بھر اسے ڈھونڈھتی رہے گی مگر پا نہ سکے گی وہ آوارہ بادل کی طرح اڑ کر نہ جانے کہاں برس جائے گا۔ اور تیری آنکھوں کو سدا کے لیے برستا چھوڑ جائے گا۔

لیکن میرے قدم من من بھر کے ہو گئے، آگے بڑھ کر اسے روک بھی نہ سکی، میرے ہونٹوں کو کسی نے سی دیا تھا۔ میں اتنا بھی تو نہ کہہ سکی کہ "جانے والے رک جاؤ۔"

اور جانے والا چلا گیا ــــ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

اس کی دی ہوئی ڈائری میری ہتھیلی پر موجود تھی۔ میں دھڑکتے دل اور سلگتی آنکھوں کو لئے ایک تنہا گوشہ میں چلی گئی۔ پہلے تو فقط دھندلے لگے، مگر پھر صاف ہو گئے۔

اس نے ایک دن لکھا تھا ....

وہ آئے بزم میں اتنا تو میرؔ نے دیکھا
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

یہ اس دن کے لئے تھا جب اس نے پہلی بار مجھے دیکھا تھا۔ پھر

دو دن بعد اس نے لکھا تھا۔

"ساری تمنائیں، ساری کامنائیں ایک مرکز پر سمٹ آئی ہیں، وہ میری منزلوں کا اُجالا بن گیا ہے۔ دِل کی آوارگی ختم ہوگئی ہے۔ آج سے پہلے جانے کتنے حسینوں کی پھیلی باہیں مجھے بلاتی رہیں۔ گلے لگانے کو تڑپتی رہیں۔ پر جی کہتا تھا رکو نہیں۔ بنجارہ کا مقدر تو چلتے رہنا ہے، ٹھہرنا نہیں۔ دِل پر کتنے ڈھیر سے نقش تھے — اس لمبی چوڑی دنیا میں بس ایک دلِ زندہ ہی تو تھا جو جیت ہار کی پرواہ کیے بغیر دھڑکتا رہتا تھا۔ وہ چپکے چپکے سرگوشیاں کرتا رہتا اور کہتا نگاہوں کے لڑنے کو جانتے ہو۔۔؟ نہیں — رسیا کی رنگ بھری باتیں، شفق کے رنگ، دھنک، چھیڑ چھاڑ، مسکراہٹیں، نین ڈوریں باندھ کر کسی کو اشاروں پر نچانا چاہتا مگر خود بندھ جانا، وصلِ یار؟ — ارے سدا کے مورکھ! تم تو بالکل بدھو ہو۔ کچھ بھی تو نہیں جانتے!۔ میں چپکا ہو جاتا، چپ نہ ہوتا تو کیا کرتا۔ بدھو ہی تو تھا — مجھے کچھ بھی تو معلوم نہیں تھا — مگر اے میرے دِلِ زار! آج یہ سب مجھ سے پوچھ، میں بتا دوں گا — آج میں نے ان سے بات جو کرلی ہے۔"

یہ اس دن کے لئے لکھا جب اس نے پہلی بار مجھ سے بات کی تھی۔ بات کیا کی تھی بس یہ پوچھا تھا کہ "کیا آج رخسانہ نہیں آئی؟" رخسانہ! اس کی دوست تھی — میں مسکرائی اور کہا "شاید نہیں — وہ مجھے تو نہیں ملی"۔ اور بس! قصہ ختم — "شکریہ"۔ کہا اور چلا گیا۔

اس کے کچھ دن بعد لکھا تھا۔

"بادل آتے ہیں، اُمید ہوتی ہے اب آسمان کے جو تارے چھپ گئے ہیں ان کی جگہ پانی کی بوندیں لے لیں گی۔ دھرتی کی خشک کوکھ میں یہ بوندیں نئی زندگی کا مژدہ لے کر داخل ہوں گی اور یہ جو بلا کی گرمی ہے، یہ اپنا رختِ سفر باندھے گی — برکھا کے جلو میں بہار کے کاروانوں کے دَل کے دَل سطحِ زمین پر اپنے خیموں کو ایستادہ کردیں گے — لیکن یہ سب سراب تھا۔ وہ بادل پھر چھپ گئے۔ آکاش پھر ستاروں سے سج گیا ہے۔ میں غور سے ستاروں کی اس آباد دنیا کو دیکھ رہا ہوں اور شمال کے سب سے بڑے ستارے

سے پوچھ رہا ہوں "کیا کل اتنا ہی تابناک ہوگا جتنا آ — مجھے ایسا لگا ہے جیسے ستارہ مسکرا دیا ہے اور لگا ہے۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو — مجھے خوش خیالی ہو کہ جس سا کوئی دوست نہ جس سا کوئی دشمن — انداز میں کہہ رہا ہے کہ تم نے پہلے جو سوچا تھا وہ ہی کولمبس ہو — یہ ستارہ تمہاری نصیب آوری کا پیغا تمہارا امریکہ تمہیں مل چکا ہے۔ سمندر کی موجوں سے ساحلِ امید صاف تو نظر آرہا ہے، لنگر کھول دو"

پھر وہ دوسرے دن مجھ سے ملا تھا — میں بڑی دیر تک باتیں کرتا رہا مجھے اس کی باتیں بہت مگر رخسانہ یہ سوچ کر اداس ہوگئی اور پھر وہ جب میں چاہتے ہوئے بھی اس سے گھل مل نہ سکی۔ دو بیت گئے۔ ہم ملے تو مگر مل کر بھی نہ مل سکے — و رُکھائی کو کیا سوچتا رہا۔ اس کا پتہ تو مجھے اس و جب اس کی ڈائری میرے ہاتھوں میں کانپ ر رُخسانہ کو جو میں سمجھتی تھی، "وہ" اس کی تھی ہی نہ کامریڈ تھی بس اس کی — مجھ بوزُرژوا قسم کی لڑکی کو تھا کہ وہ اس طرح گھلے ملے رہتے ہیں تو ایک مقصد

اس کی ڈائری کے آخری صفحہ پر لکھا تھا۔

"ذہن میں آگ جل رہی ہے۔ امنگیں تھک ہار کر دل گوشہ میں سوگئی ہیں۔ ہر سُو تلخیوں کا بسیرا ہے۔ صبح کی آندھیوں کے جھکڑوں جیسی کیفیت ہے۔ مجھے ایسا لگ جیسے پتوں کی سرسراہٹ کی آڑ میں ویران روحوں کے ہوئے ہیں۔ بند شگوفے بالکل میری قسمت کی طرح ہیں۔ میرے سُکھوں کی کلیوں پر سخت سخت ٹھیکریوں کا پہرہ لگا محاصرہ میں لے لیا ہے۔ پھول اُداس ہیں چاروں طرف ڈیرا ہے۔ آج مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ مجھے کیا سمجھتی میں مذاق ہوں اس کے لئے اور میری چاہ؟ — چھو اب میں کبھی اس نگری میں نہیں آؤں گا"

(باقی صفحہ

نفیس رضا زیدی

سرخ چوڑیاں

"دیکھ امین اتنے زیادہ دن ہوگئے پر تو ہمیشہ ٹال دیتا
— کریم کی بیوی آج آئی تھی۔ ہاتھ بھر بھر چوڑیاں پہنی تھیں۔
ۓ چوڑیاں .... خوب سنہری کام والی، اس کا میاں ہر مہینے نئی
ان لادے ہے .... ایک میں ہوں، کریم کی بھی اتنی کمائی ہو
ی .... تو چوڑی والا ہے پر بیوی کے ہاتھ میں وہی چھ آنے
والی چوڑیاں۔"

"شمو خواہ مخواہ دماغ مت چاٹ۔ گذری عید پر میں نے
پے درجن والی چوڑیاں لاکر دی تھیں۔"

"پر کتنی کتنی — تین تین ..... مجھے تو بھر بھر ہاتھ چوڑی
شوق ہے کریم کی بیوی جیسے ...."

"کریم کا نام مت لے میرے سامنے .... اس میں اور
رق ہے، اس کی چوڑیوں کی دکان ہے .... میرا ایک دکان
جو فٹ پاتھ پر چھوٹا سا کیبن ہے۔ دو روپے روز پولیس
ہتا — اور پھر جس دکان سے لگا کر کیبن بنایا ہے۔ اس
ے کو بھی روپیہ روز دینا پڑتا ہے — تین روپے روز
تو یہ نکل گئے — اور پھر ہماری تقدیر بھی خراب ہے۔ جس
عورت کو کبھی چوڑیاں پہناؤں تین چار چوڑیاں تو ہاتھ پر ضرور
ٹوٹیں۔"

"پر تو سخت ہاتھ سے چوڑی کیوں پہناتا ہے — نرم
ہاتھ سے پہنایا کر — کریم کی بیوی کہہ رہی تھی کہ اس کے میاں
سے ایک چوڑی بھی نہ ٹوٹے ہے۔"

"بے وقت کریم — کریم کی بیوی کی رٹ — ایکدفعہ
کہہ دیا میرے سامنے ان کا نام مت لیا کر ... ورنہ مجھ سے
برا کوئی نہ ہوگا۔"

"اچھا زیادہ بک بک مت کر روٹی کھا۔"

"روٹی تو کھاؤں پر تو روز یہ جو میرا دماغ کھاتی ہے۔"

اور وہ منہ پھلا کر خاموش بیٹھ گئی — امین بھی نرم
پڑ گیا بولا "دیکھ شمو! تیرے ہاتھوں میں تو یہی چھ آنے درجن
والی چوڑیاں اچھی لگتی ہیں — گوری گوری کلائیوں میں۔"

"تجھے پہنانی نصیب جو نہیں ہیں۔" شمو نے ناک چڑھا کر

کہا — اور وہ خاموشی سے روٹی کھانے لگا۔

دوسرے دن وہ رات کو گھر میں آتے ہی چیخنے لگا "میں سالے کریم کا سر توڑ دوں گا — یہ سالا ہماری کوٹھری کے سامنے کیوں کھڑا رہتا ہے"۔

"پر میں کیا کروں" شمو بولی —"میں نے کھڑا کیا ہے۔ جو تو میرے سر چڑھ رہا ہے' مجھے کیا پتہ کیوں کھڑا رہتا ہے میں نے تو اسکے گھر جانا بھی چھوڑ دیا کمبخت خراب نظروں سے دیکھتا تھا"۔

میں اس کی آنکھیں پھوڑ دونگا"۔

"اچھا اب غصہ مت کر روٹی کھالے .... فضل چاچا بھی سندھ سے مال لے کر آگئے ہیں۔ تیرا مال یہاں دے گئے ہیں یہ پوٹلیاں رکھی ہیں"۔

"اچھا! — فضل چاچا آگئے میں ابھی ان کے پاس جاؤنگا ابھی مال بھی دیکھنا ہے راستے میں چوڑیاں وغیرہ نہ ٹوٹ گئی ہوں"۔

اس نے جلدی جلدی کھانا کھایا — اور مال کھول کر دیکھنے لگا اس کے پاس ہی شمو دری پر بیٹھ گئی "یہ سارا مال عید پر ختم کرنا ہے"۔

شمو خوش ہو ہو کے چوڑیاں دیکھتی رہی پھر وہ چوڑیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "دیکھ امینے — امینے .. یہ چوڑیاں کیسی اچھی ہیں..... بالکل ایسی ہی کریم کی بیوی نے پہنی ہیں"۔

"پھر نام لیا تو نے" امین نے غصہ سے کہا۔

"پر آخر کون سا گناہ کر لیا"!!

"دیکھ شمو آخر یہ سالا کھڑا کیوں رہتا ہے — دیکھ شمو یہ تجھے دیکھنے کو کھڑا ہوتا ہے — میں نے ایک صاحب سے سنا تھا اپنی لکھائی اور دوسرے کی جورو اچھی لگے ہے"۔

"پر لکھائی کا کیا مطلب"؟ شمو نے کہا" وہ جو کہانی وغیرہ لکھے ہیں۔ ان کو اپنی کہانی اور دوسرے کی بیوی اچھی لگے — پر کریم کی بیوی تو مجھے ایک آنکھ بھی نہ بھائے — کالی چڑیل جیسی"۔

"لیکن — تو تو بہت خوبصورت ہے — تیری آنکھیں بڑی بڑی ہیں — بال بھی خوب لمبے ہیں — اور تیرا رنگ بھی بہت سفید ہے — شادی کو پانچ سال ہو گئے — پر تو ذرا بھی بدلی .... ویسی ہی لڑکی ہے چھوٹی سی"۔

شمو کا چہرہ سرخ ہو گیا "تم ایسے ہی خواہ مخواہ باتیں کرتے ہو — چوڑیاں دیکھو ..... فضل چاچا کے پاس بھی جا میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی چاچی سے باتیں کرونگی"۔

عید سے تین دن پہلے اس نے پھر امین سے کہا "دیکھ امینے — مجھے سنہری کام والی چوڑیاں لا دے"۔

"شمو تو تو ہر ایک چیز کے پیچھے پڑ جاتی ہے — وہ چوڑیاں تین روپے درجن بکتی ہیں، دو درجن چھ روپے کی آئیں گی — اور اس عید پر تو تیرے کپڑوں کا بندوبست ہی بڑی مشکل سے ہوا ہے میں اپنی قمیص کا کپڑا بھی نہ لا سکا — تیرے لئے دکان سے سستی سی چوڑیاں لا دونگا ...... بس تجھے تو ہر وقت سنہری کام والی سرخ چوڑیوں کی پڑی ہے"۔ اور شمو کا منہ اتر گیا۔

صبح عید تھی رات بھر امین کی دکان پر بڑی بھیڑ رہی۔ اس رات تقریباً ساری دکانیں تمام رات کھلی رہتی ہیں۔ امین نے دکان میں بیٹھے بیٹھے سوچا عید کے دن تو ہر عورت چوڑیاں پہنتی ہے۔ خود میرے ہاتھوں سینکڑوں عورتیں چوڑیاں پہن کے جا چکی ہیں۔ تقریباً ساری عورتوں نے سنہری کام والی چوڑیاں پہنی ہیں — میں اپنی شمو کے لئے چوڑیاں ضرور لے جاؤنگا — ضرور لے جاؤنگا۔

اور آج خلاف معمول اسکے ہاتھ سے چوڑیاں پہناتے وقت بھی زیادہ چوڑیاں نہیں ٹوٹیں — حیدرآباد سے جتنا مال منگوایا تھا سب ختم ہو گیا۔ ۲ بجے رات تک برابر بھیڑ رہی اور اس کا خیال تھا کہ وہ چار بجے رات تک دکان کھولے رکھے گا۔ کیونکہ چوڑی کی اور دکانیں تو صبح تک کھلی رہتی تھیں — پر آج اسے گھر پہنچنے کی بڑی بے چینی ہو رہی تھی۔ شمو کے لئے اس نے دو سنہری کام والی دو درجن چوڑیاں الگ رکھ لی تھیں۔

اور آخر تین بجتے ہی اس نے جلدی جلدی دکان بند کی اور گھر کی طرف چلا — وہ سوچنے لگا آج شمو کی بھر بھر باتوں

عرفان حسین

بھنور

جمیل نے انگڑائی لی تو "با آواز" جماہی بھی آگئی۔
جماہی سے نجات پانے پر اس نے پھر انگڑائی لی۔ اور لیتا چلا گیا۔ رات بھر ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے بدن کی نس نس دکھ رہی تھی۔ اور انگڑائی لینے سے تمام جسم میں ایک سرور سا تیر گیا تھا۔ ایک نیا میٹھا میٹھا سا درد ابھر آیا تھا جس سے ایک عجیب سی لذت کا احساس ہوا تھا۔

تقریباً پون منٹ کی طویل انگڑائی لینے اور بدن کو تین چار جھٹکے دینے کے بعد اس نے ہاتھ نیچے گرا دیئے۔ ایک نظر گرد و پیش پر ڈالی اور قریب ہی چوراہے کے نل پر پہنچا۔ پہلے ہاتھ دھوئے، پھر نتھنوں میں پانی ڈال کر ناک صاف کی، اور پھر ہاتھ دھوئے جیب سے رومال نکال کر ہاتھ منہ پونچھا پھر رومال کو چہرے سے ہٹا کر پینٹ کی جیب میں رکھ لیا اور بالوں پر ہاتھ پھیرتا ہوا آگے بڑھ گیا — بازار ابھی کھلا نہیں تھا چہل پہل بھی معمولی سی تھی وہ یونہی ادھر اُدھر نظر دوڑاتے ہوئے اس نے اوپر دیکھا تو تمام عمارتوں کے بالائی حصوں پر صبح کی ہلکی اور نرم دھوپ پھیلی نظر آئی۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا تو اس نے کئی لمبی لمبی سانسیں لیں۔ اور سامنے دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔

اچانک بایاں ہاتھ جو رومال جیب میں ٹھونسنے کے بعد ابھی تک جیب ہی میں تھا، نیچے کو اُتر گیا اور جیب میں پڑی ہوئی ریزگاری سے ٹکرا گیا — "دس آنے" — "دس آنے" — ذہن نے گردان کی اور اس نے ریزگاری کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ رات سے اب تک غالباً سو بار وہ ریزگاری کو اسی طرح مٹھی میں بھینچ چکا تھا۔ کیونکہ پس انداز کی ہوئی رقم کے یہ آخری دس آنے تھے جو پچھلے تین مہینوں سے برابر گھٹتی جا رہی تھی۔ اور یہ باقی کے دس آنے شاید آج یا شاید کل تک اس کی جیب سے ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نکل جانے والے تھے — "دس آنے! — دس آنے — اب؟ — اب اس کے بعد؟" ذہن سوچ رہا۔ اور وہ کوئی تسلی بخش جواب ڈھونڈے بنا آگے بڑھتا رہا۔

تقریباً دو فرلانگ چلنے کے بعد وہ اپنے مخصوص چائے خانے پہنچا۔ چائے خانہ خالی تھا۔ صرف ایک آدمی آخری گوشے میں بیٹھا

چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ "ایک چائے کا آرڈر دے کر وہ کمرے کے درمیان میں لگے دو قدِ آدم آئینوں میں سے ایک کے مقابل جا کھڑا ہوا۔ ایک بار سراپا کا جائزہ لیا۔ پھر جیب سے رومال نکال کر چہرے پر کئی بار رگڑا اور پھر سارے چہرے پر پھیر کر بالوں پر پھیرا۔ اور رومال سے ہی سامنے کے بے ترتیب بالوں کو درست کرتا ہوا درمیانی میز کی ایک کرسی پر جا بیٹھا۔ میز پر مقامی روزنامہ "دنیا" پڑا تھا اس نے سرسری نظر سے پہلے صفحہ کی سرخیاں دیکھیں اور اندر کے صفحات پر بھی یونہی سی نظر ڈال کر اخبار پلٹ دیا۔ اُسے "ضرورت ہے" کے جلی حروف کی تلاش تھی۔ توقع تو نہیں تھی لیکن آخری صفحہ پر ایک کونے میں "ضرورت ہے" کی سرخی نظر آ ہی گئی۔ اشتہار کا مضمون پڑھا تو ایک لمحے میں پھوٹ پڑنے والی مسرت کی کرنیں دوسرے ہی لمحہ میں معدوم ہو گئیں کیونکہ اشتہار روزنامہ ہذا کے منیجر کی طرف سے تھا۔ اور ضرورت دو چپراسیوں کی تھی اور اس نے اس ضمن میں آج تک سوچا بھی نہیں تھا — اس نے بے دلی سے پورا اشتہار پڑھا۔ نیچے امیدوار کو درخواست کے ساتھ خود ملنے کی تاکید تھی اور پڑھے لکھے امیدوار کو ترجیح دیئے جانے کا نوٹ تھا —" ہونہہ" اس نے مشتہر کی اس حرکت اور جذبے پر نفرت کا اظہار کیا "پڑھے لکھے چپراسی! — ذلیل سالے" وہ زیرِ لب بڑبڑایا۔ اور پھر پہلا صفحہ پلٹ کر خبریں دیکھنے لگا۔

لڑکا چائے لا کر رکھ گیا تو اسے دو پیسٹری لانے کو کہہ کر چائے کا ایک چھوٹا سا گھونٹ لیا۔ لڑکا پیسٹری لے آیا تو حسبِ معمول نہایت اہتمام سے چھوٹا سا ناشتہ کرنے لگا۔ یعنی ایک ٹکڑا پیسٹری اور ایک گھونٹ چائے اور ایک سطر خبر۔

دس منٹ بعد چائے اور پیسٹری ختم ہو گئی لیکن اخبار رہ گیا۔ لہٰذا اخبار کو ختم کرنے کے لئے مزید پندرہ منٹ بیٹھا۔ تب کو لک پر چونی دے کر باہر سڑک پر نکلا — "چھ آنے — صرف چھ آنے!" اُس نے ایک سرد سانس لی اور چل پڑا۔ اس بار اس کا رُخ گھر کی طرف تھا۔

اب چاروں طرف خاصی دھوپ پھیل گئی تھی جس میں تمازت بھی آ گئی تھی اور فضا بازار کے مخصوص شور و غل سے بوجھل ہونے لگی تھی — ہر طرف انسان ہی انسان نظر آ رہے تھے۔ انسانوں سمندر میں تیرتا وہ بھی آگے بڑھنے لگا — چائے پینے سے رات بھر مشاعرے میں جاگنے اور ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے سے پیدا ہونے والی تکان ختم ہو گئی تھی۔ لہٰذا کچھ دیر قبل کی بہ نسبت اب اس کی چال بھی تیز ہی تھی۔ رات کا مشاعرہ اچھا اور کامیاب رہا تھا۔ اسی وہ رات بھر جاگا رہا تھا ورنہ وہ تو کچھ دیر ہی سُن کر واپس آ جانے کے خیال سے وہاں گیا تھا۔ اس وقت بھی مشاعرے کے متعلق سوچتا ہوا وہ گھر جا رہا تھا۔ اور گھر پہنچ کر وہ خیالوں کی دنیا سے حقیقت کی بستی میں لوٹ آیا۔ کیونکہ باورچی خانہ میں گھسے ہوئے چھوٹے بہن بھائی حسبِ معمول صبح کے دلیہ کے لئے ایک دوسرے کی آوازوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ رہے تھے۔

"پک گیا یا ابھی نہ؟"

"اِتنی دیر ہو گئی ابھی تک نہیں پکا ہے۔"

"جلدی پکاؤ۔"

اور اس کی ماں چولھے سے لگی بیٹھی "ابھی لو۔ ابھی ہے، چُپ چاپ بیٹھو، بھائی صاحب آ گئے" کہتی ہوئی انہیں کرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی — اس نے ہاتھ منہ دھو پھر کنگھے سے بال سنوار کر دالان میں بچھی چارپائی پر آ لیٹا۔ مغرب سمت ہونے کی وجہ سے دھوپ ابھی اِدھر نہیں پہنچی تھی۔ لیٹ کر سستانے لگا، راستے میں اس نے سوچا تھا کہ گھر پہنچ کر لمبی تان کر سوئے گا مگر اب وہ سوچ رہا تھا "آخر ایسے کب تک چلے گا؟" — اور نیند کا کہیں پتہ نہ تھا۔ باورچی خانہ میں بہن بھائی چیخ چیخ کر اپنے خالی پیٹوں کا اعلان کر رہے تھے — اور دالان میں پنشن خوار باپ ایک بوسیدہ سی کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ جسے دیکھتے ہی اُسے اپنی بدنصیبیاں یاد آ جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ جیب میں باقی بچے صرف چھ آنے بھی اس وقت کانٹے کی طرح اس کے دل میں کھٹک رہے تھے "اُف —" اندرونی کرب کی شدت سے اس کے منہ سے آہ نکل گئی۔

اپنی بے روزگاری ۔ باپ کی مختصر پنشن ۔ گھر کے بڑھتے ہوئے اخراجات اور جوان ہوتی ہوئی بہن کے خیالات میں وہ ایسا غلطاں ہوا کہ وقت کا بھی احساس نہیں رہا ۔ اور جب ماں نے دلیہ کی رکابی لاکر "لے دلیہ کھالے" کہا تو وہ یوں چونکا گویا بچھو نے ڈنک مار دیا ہو ۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور مسکرانے کی کوشش میں باچھیں پھاڑ دیں تاکہ ماں کو دلی کیفیات کا علم نہ ہونے پائے ۔ ماں ایک رکابی اس کے آگے رکھ کر دوسری اس کے باپ کو دینے گئی پھر واپس آکر اس کے پاس بیٹھ گئی ۔ اس نے دیکھا ماں کے چہرے پہ مامتا کھیل رہی تھی ——— چند منٹ خاموش بیٹھنے کے بعد وہ بولی "بارہ ایک بجے کو کہہ کر گیا تھا بیٹا ——— رات بھر نہیں آیا؟" ۔ اس چھوٹے سے جملے میں سوال ، شکایت اور محبت سبھی کچھ پنہاں تھا ۔

"اچھے شاعر تھے ——— سو میں نے سوچا اب آیا ہوں تو سن لوں ، اس لئے رہ گیا" وہ گویا بڑبڑایا اور دلیہ کا چمچہ مونہہ میں ڈال لیا ۔ پھر وہ کچھ اور نہ بولا ۔ ماں بھی خاموش بیٹھی رہی ۔ اسے محسوس ہو رہی تھی ، اکثر ایسا ہوتا کہ کھانا کھاتے وقت ماں اس کے پاس بیٹھتی ۔ ماں کے ایسا کرنے سے اسے ہمیشہ الجھن ہوتی تھی ۔ پھر اس وقت تو بھائی بہنوں کی چیخ پکار دل پر آرے چلا رہی تھی ۔

چھوٹا بھائی شبو کہہ رہا تھا ۔

"میں تو نہیں پیوں گا ——— میں تو اور لوں گا" ۔

اور صابرہ ۔ جو جمیل سے صرف تین سال چھوٹی تھی شبو کو سمجھا رہی تھی ۔

"تجو کا بھی اِتنی سی ہے ۔ بلو کا بھی اتنی سی ہے ۔ اور دیکھو ابا اور اماں دونوں جنوں کا بھی اِتنی سا ہے" ۔

"میں تو کچھ نہیں جانتا ——— میں تو اور لوں گا ۔ ۔ ۔ اوں ۔ ۔ ۔ اوں ۔ ۔ ۔ اوں" ۔

"تو اور کہاں سے دوں میں تجھے ؟ ۔ ۔ ۔ ۔ دیکھ دیگچی بھی خالی ہوگئی ۔ ۔ ۔ ۔ زیادہ شور مچائے گا تو بھائی صاحب ماریں گے بس ۔"

یہ آوازیں زہریلے تیر بن کر اس کے دل کو چھید رہی تھیں اور دلیہ اس کے حلق میں پھنسنے لگا تھا ——— آخر جب ضبط نہ ہوا تو وہ بول ہی پڑا ۔

"صابرہ کیوں رُلا رہی ہے ۔ لے یہ دلیہ ۔ ۔ ۔" مگر ماں نے درمیان ہی میں قطع کلام کر دیا ۔

"تو کھا بیٹا ——— یہ تو دن بھر ہائے ہتیہ دیتے رہتے ہیں" اور اٹھ کر باورچی خانہ کی طرف چلدی ۔ "کیا ہے رے شبوا ، کمبختو کوئی گھڑی تو چین سے بیٹھنے دیا کرو ، ہر وقت ہائے ہائے ۔ کھاتا کیوں نہیں ——— اتنا بھوت سا تو ہے ۔ اور کتنا لے گا ۔ ۔ ۔ ۔ کھا سیدھے سیدھے ۔ نہ تو پٹائی کرونگی" ۔ ماں شاید شبو کو دھمکانے کیلئے زور سے چیخی تھی ۔ لیکن اسکے باپ کو سچ مچ جلال آگیا ۔ وہ اچانک یوں کڑکے کہ خود جمیل اچھل پڑا ۔

"یہ ایسے نہ مانے گا" انھوں نے بھرپور آواز میں کہا ۔ اور چارپائی سے تڑپ کر باورچی خانے کی سمت لپکے ۔ "پٹ کے صحیح ہوگا" ۔

"ارے تم بیٹھ جاؤ ۔ تم کاہے کو اٹھتے ہو ، کھائیگا ان کا تو کام ہی رونا پیٹنا ہے" ۔ اس کی ماں سٹ پٹا کر بولی ۔ اور اس کے ابا کے سامنے کھڑی ہوگئی ۔ مبادا وہ شبو کو پیٹ نہ ڈالیں ۔ پر وہ سنی ان سنی کر کے اس کی ماں کو ایک طرف ڈھکیلتے ہوئے بولے ۔

"نہ نہ یہ ضدی بھی بہت ہوگیا ہے ، یہ ایسے نہ کھائے گا" پھر شبو کے سامنے اکڑوں بیٹھتے ہوئے اس سے کہا "کیوں بے کیوں نہیں کھاتا ؟ ——— پر وہاں تو باتوں کا ایک ہی جواب وہی "آں آں ——— آں آں آں ۔ ۔ ۔ ۔ آں" تھا ۔

"نہیں کھائے گا ؟" ———

"آں ۔ ۔ ۔ ۔ آں ۔ ۔ ۔ ۔ آں ۔ ۔ ۔ ۔ آں" ۔

"کھا سالے !!!"

چٹاخ ———

باپ کا تھپڑ شبو کے گال اور جمیل کے دل پہ پڑا ۔ اور

اور دونوں تلملا گئے ـــــ جمیل اٹھا اور تیر کی طرح گھر کے باہر آگیا ـــــ پیچھے ماں چیختی ہی رہ گئی۔

جمیل کے اندر ایک طوفان سا آبل پڑا تھا ـــــ ذہن میں ہیجان سا برپا رہا تھا، کنپٹیاں یوں جل رہی تھیں جیسے کسی نے آگ بھر دی ہو ـــــ خیالات کی آندھیاں! ـــــ جذبات کا اُبال "نہیں کھائے گا؟" ـــــ "آں .... آں .... آں .... آں"۔ "کھا سالے!!!" ـــــ چٹاخ!" ـــــ "اوہ میرے خدا ـــ یہ سب کیوں؟ ـــــ کیا یہی زندگی ہے؟" ـــــ کیا یہی زندگی ہے؟" .... کون کہتا ہے یہی زندگی ہے؟ ـــــ پر اس کے لئے قصوروار کون ہے؟ ـــــ ذرا یہ بھی تو سوچو!.... میں قصوروار ہوں؟ ـــــ میں؟ ـــــ میں؟" اس کے خیالات میں جنگ ہونے لگی "ہاں تم! ـــــ تم بے عمل ہو .... کیسے؟ ـــــ کیسے؟ ـــــ ان حالات کو بدلنے کے لئے میں نے کیا نہیں کیا؟ ـــــ تعلیم نامکمل چھوڑ دی ـــــ اپنے ہر ارمان اور جذبہ کا گلا گھونٹ کر ملازمت کی۔ کیا یہ عمر اس لئے ہوتی ہے؟ بتاؤ؟ ـــــ اب اس میں میرا کیا قصور ہے کہ میں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا ـــــ اور تین مہینے سے کٹی پتنگ کی طرح مارا مارا پھر رہا ہوں ـــــ جب تک ملازمت نہیں ملتی۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ کیا کروں؟ .... کچھ ہمت کرو ـــــ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو ـــــ میں کہتا ہوں صبح والا اشتہار کیوں بھولے جاتے ہو؟ .... چپراسی! .... ہاں، کیوں؟ کیا چپراسی کی ملازمت، ملازمت نہیں ہوتی ـــــ ارے محنت کرنے میں کیا حرج ہے! آخر کسی سے بھیک تو نہیں مانگو گے، ملازمت ہی تو کرو گے؟ .... نہیں نہیں ـــــ مجھ سے یہ نہیں ہوگا ـــــ ذرا سوچو چپراسی کی ملازمت کر لی تو ہم چشم کس نگاہ سے دیکھیں گے ـــــ میں کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہ جاؤنگا؟ ـــــ نہیں! ـــــ مجھ سے یہ ذلت برداشت نہیں ہوگی ...... تم آدمی نہیں جانور ہو ـــــ بلکہ جانور سے بھی بدتر۔ ماں باپ کتنی محبت کتنے پیار سے پرورش کرتے ہیں کہ اولاد بڑھاپے میں سہارا بنے گی اور تم اتنے ذلیل ہو کہ تمہیں کسی بات کا احساس ہی نہیں ـــــ بے حیا ـــــ بے غیرت ـــــ بے حس ـــــ گھاٹ کا پتھر .... تم کچھ بھی کہو ـــــ لیکن مجھے ہر بات کا احساس ہے ـــــ پھر بھی میں چپراسی کی ملازمت نہیں کر سکتا ـــــ مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا!.... نہیں ہو تو مت کرو تا ـــــ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے .... ہاں! ہاں .... ہاں! .... ہاں! ہاں!"

"اوہ" خیالات کی آگ سے گھبرا کر جمیل نے غیر ارادی طور پر سر کو ایک بار جھٹکا دیا۔ وہ ذہن میں کلبلاتے ہوئے خیالات کے کیڑوں سے نجات پانا چاہتا تھا۔ سر جھٹک کر ذہن کو بٹانے کی غرض سے وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ یونہی بلا مقصد۔ آگے اور آگے دیکھتا رہا۔ اور چلتا رہا۔ انسانوں کے سمندر کا ہر قطرہ اپنی اپنی دھن میں مگن تھا۔ اور اپنی اپنی غرض میں محو تھا۔

جمیل کافی دیر تک اُلجھے ہوئے خیالات لئے لاشعوری طور پر اِدھر اُدھر منڈلاتا رہا۔ پھر جب اچانک اسے یاد آیا کہ کل ایک ہمسائے نے چرم کے ایک تھوک بیوپاری کا پتہ دے کر کہا تھا کہ وہ اس کے یہاں جائے۔ شاید اسے محرری کی ملازمت مل جائے۔ کیونکہ اس کے یہاں دو چار منشی صرف اوپر کا کام دیکھنے کے لئے رہتے ہیں۔ ممکن ہے اسے ملازمت مل ہی جائے ـــ اس چرم بیوپاری کا پتہ اسے یاد تھا۔ لہٰذا وہ اس کی طرف چل دیا۔ تقریباً تین میل چلنے کے بعد وہ منزلِ مقصود پر پہنچا۔ لیکن وہاں پہنچنا اور نہ پہنچنا برابر ہی رہا ـــــ وہاں فی الحال کسی آدمی کی ضرورت نہیں تھی۔ ہاں! ان لوگوں نے اس بات کا پتہ لے لیا تاکہ وقتِ ضرورت اسے مطلع کر سکیں۔

وہاں سے ناکام لوٹنے کے بعد وہ سہ پہر تک شہر کے مختلف حصوں میں چکر لگاتا پھرا۔ لیکن کہیں اور بھی کامیابی نہیں ہوئی اور سہ پہر ڈھلے اس ناکامی اور اپنی سیاہ بختی کا احساس لئے جب وہ بجلی کے اس کھمبے کے قریب پہنچا جو اس کے محلہ میں داخلے کی بڑی گلی اور سڑک کے اتصال پر واقع ہے۔ تب وہ گویا سونے

سے جاملا۔ اس کھمبے کو دیکھ کر اسے اس بات کا صحیح احساس ہوا کہ وہ "گھر" جا رہا ہے "گھر"! ۔ اس احساس کے ساتھ ہی سینکڑوں زہریلے تیر اس کی رگ و پے میں تیر گئے ۔ "نہیں کھائے گا؟" ۔ "آں ... آں .... آں ... آں" ۔ "کھا سالے!!!" ۔ "چٹاخ!" ۔ "اُف میرے خدا میں کیا ۔ میں کیا کروں؟ ۔ میں کیا کروں میرے رب؟" ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ۔ اور وہ وہیں کھمبے سے لگ کر سسکنے لگا، اسے اس کا بھی احساس نہیں رہ گیا تھا کہ راہ گیر اسے اس حالت میں دیکھ کر کیا سوچیں گے "میں کیا کروں! ۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟" ۔

"چپراسی!" ۔ یہ چھ حرفی لفظ بجلی کی طرح اچانک اس کے ذہن پر چمکا ۔ اور اس کی سوچوں میں چکا چوند مچا گیا ۔ اور ایک نئے عزم ایک نئے جذبے سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں! ہاں!! ۔ ہاں!!!" وہ زیر لب بڑبڑایا ۔ اور کھمبا چھوڑ کر پھر بازار کی طرف لوٹ پڑا ۔ اس نئے فیصلے کے بعد وہ رگ و پے میں ایک نئی طاقت کا احساس کر رہا تھا ۔ اور دل کو ایک انجانی مسرت سے سرشار پا رہا تھا ۔ اسی نئی مسرت میں کھویا ہوا وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا ۔ بڑھتا رہا ۔ اگر کوئی اس سے یہ پوچھتا کہ اخبار "دنیا" کے دفتر تک پہنچنے کیلئے تم کن کن راستوں سے گذر کر آئے ہو ۔ اور راستے میں تم نے کوئی غیر معمولی بات بھی دیکھی ۔ آیا کہ نہیں ۔ تو وہ یقیناً بغلیں جھانکنے لگتا ۔ اپنے خیالات میں وہ اتنا ہی محو ہو کر یہاں تک آیا تھا ۔

کچھ دیر بعد وہ اخبار "دنیا" کے منیجر کے سامنے کھڑا تھا۔

"کہئے؟" ۔ منیجر نے زیر لب مسکرا کر پوچھا ۔

"آج کے پیپر میں آپ نے چپراسیوں کی دو آسامیوں کے لئے اشتہار دیا تھا"

"جی ہاں!" ۔

"انہیں آسامیوں کے لئے میں ایک امیدوار ہوں ۔ کیا مجھے ملازمت مل سکے گی؟" ۔ اس نے نہایت متانت اور ملائمیت سے کہا ۔

"نہیں!" ۔

"نہیں! ۔ کیوں؟" ۔

"کیونکہ آپ دیر سے آئے ہیں ۔ ہم صبح ساڑھے دس بجے ہی دونوں آسامیوں کا چناؤ کر چکے ہیں ۔ بیس پچیس امیدوار تھے"

"اوہ ۔ لیکن میں ہائی اسکول پاس ہوں ۔ آپ کے اشتہار کا نوٹ ہے کہ پڑھے لکھے کو ترجیح دی جائیگی"۔

"بے شک! لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ ہم نے جن لوگوں کا انتخاب کیا ہے وہ دونوں بھی ہائی اسکول پاس ہیں"

"اوہ!" ۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

"نہیں کھائے گا؟" ۔ "آں .... آں .... آں .... آں" ۔

"کھا سالے" ۔ "چٹاخ!" ۔ اس کا دم گھٹنے لگا ۔

"اُف! ...." "اُف!! ۔ اُف!!!"

بقیہ:۔ انکھیاں برسیں رم جھم

اس کی "وہ" میں تھی! دراصل اس دن جب وہ مجھ سے ملا تھا تو میں رخسانہ کی کسی بات پر جلی بھنی بیٹھی تھی ۔ اور میں نے اس سے بڑی طنزیہ باتیں کی تھیں ۔ حالانکہ من ہی من میں خود اپنے آپ کو اس کے لئے کوستا تھا ۔ اور جس دن اس نے مجھے ڈائری دی ۔ اس دن میں اس سے معافی مانگنے والی تھی ۔ مگر وہ چلا گیا ۔ اور اس کے چلے جانے کے بعد پتہ چلا کر چپ رہنے اور جھوٹے بھرم کو برقرار رکھنے کی کتنی بڑی سزا بھگتنی پڑتی ہے ۔ ۔ کاش میں نے اسے نہ جانے دیا ہوتا ۔ جاتے جاتے اسے روک لیا ہوتا ۔ اور رک جاتا تو اسے منا لیا ہوتا!

۴- کراچی۔

کوثر حیات

○

آرزو اشک فشاں ہو تو غزل ہوتی ہے — دل پہ اک بارِ گراں ہو تو غزل ہوتی ہے
آنکھ سے خون ٹپکتا ہے تو لب کھلتے ہیں — زندگی شعلہ بجاں ہو تو غزل ہوتی ہے
چاند ڈوبے تو عجب دل میں خیال آتے ہیں — آنکھ سے اشک رواں ہو تو غزل ہوتی ہے
ہم وہ شاعر ہیں کہ محبوب کی دزدیدہ نظر — دل کی جانب نگراں ہو تو غزل ہوتی ہے
یاد آجائے کوئی رات کے سناٹے میں — اور اُداسی کا سماں ہو تو غزل ہوتی ہے
یہ فقط ساغر و مینا ہی کا فیضان نہیں — کوئی پہلو میں جواں ہو تو غزل ہوتی ہے
لب سے فریاد نہ ہو آنکھ سے آنسو نہ بہیں — درد اک جنسِ گراں ہو تو غزل ہوتی ہے
میرا ایمان ہے کہ اس دل کے کسی گوشے میں — حسرتِ گل بدناں ہو تو غزل ہوتی ہے
درد ہو دل میں تو الفاظ بھی ڈھل جاتے ہیں — جب کوئی سوختہ جاں ہو تو غزل ہوتی ہے
یوں تو ہر شخص کو دعویٰ ہے سخن گوئی کا — شاعرِ شعلہ بیاں ہو تو غزل ہوتی ہے

غمِ ہستی کا اگر پردہ دل پہ کوثر
کوئی دھندلا سا نشاں ہو تو غزل ہوتی ہے

ہم قلم کراچی

سعادت نظیر

یاد جب آئی ادائے چشمکِ قاتل مجھے
ایک اک ذرّہ نظر آنے لگا بسمل مجھے

اعتبارِ دردِ اُلفت کب ہوا حاصل مجھے
کیوں نویدِ زندگی دیتا ہے مستقبل مجھے

جذبۂ دل کیوں نہ ہو طوفاں شکن، دریا شگاف
یاد آتی ہے ہوائے دامنِ ساحل مجھے

جب مرا ذوقِ سفر توڑے مسافت کے قیود
پھر نظر آئے نہ کیوں زیرِ قدم منزل مجھے

گریۂ شبنم بھی ہے کیوں خندہ ہائے گُل کے ساتھ
اس میں کیا حکمت ہے؟ کچھ تو ہی بتا اے دل! مجھے

سوزشِ پروانۂ جاں باز میرے دل میں ہے
کیا جلائے گی کسی کی گرمئ محفل مجھے

موت کی سی سختیوں سے کھیلتا رہتا ہوں میں
زندگی کی کوئی مشکل اب نہیں مشکل مجھے

تیری دُھن میں میری مشتِ خاک پہنچی ہے کہاں!
رہنے دے برباد ہی اے کوز گارِ دل! مجھے

میں وہی ہوں، دل وہی، نالہ وہی، شیون وہی
دیکھتی ہے اجنبی نظروں سے کیوں محفل مجھے

اضطرابِ شوق میں دل کیوں نہ ہو بے اختیار؟
کھینچتی ہے اپنی جانب دُور سے منزل مجھے

زورِ بازو کے سہارے آگے بڑھنا ہے نظیر
اور بنانا ہے عمل سے اپنا مستقبل مجھے

فضل تابش

○

اس کے در تک جاتے جاتے حرفِ تمنا بھول گئے
لیکن پھر بھی یاد ہے اتنا کچھ کہنا تھا بھول گئے

پہلے پہلے ہم خوابوں سے سہمے سہمے رہتے تھے
لیکن اب جو وقت پڑا تو اصل سے ڈرنا بھول گئے

راج سنگھاسن پر آتے ہی راج دلارے کہلاتے ہی
کل کے خاک بسر دیوانے ساتھ ہمارا بھول گئے

کوئی کبیرا ہو تو روئے چلتی چکی دیکھ کے یارو!
ہم تو وقت کے ہاتھوں پس کر رونا دھونا بھول گئے

آج بھی بادل آوارہ ہیں آج بھی مارے پھرتے ہیں
یکش[1] نے جو پیغام دیا تھا میں سمجھا تھا بھول گئے

تم ہی نہیں کتنے ہی ساتھی ماضی کو ہم سونپ چکے
اپنا تو دستور یہی ہے جو بھی بھٹکا بھول گئے

---

[1] میگھ دوت کا ہیرو جس نے اپنا پیغام محبت بادلوں کے ذریعہ بھیجا تھا۔

کیف انصاری

○

چلی تھی بادِ خزاں موجۂ بہار نہ تھا
کسی کی دیدہ وری پر یہ آشکار نہ تھا

ہوا نے ظلم کیا ہے تیری گلی میں بہت
کہ ایک نقشِ قدم بھی پسِ غبار نہ تھا

کسی کا ہاتھ یقیناً پسِ تغیر ہے
مری نگاہ کو ورنہ، یہ انتظار نہ تھا

سحر کو دیکھ کے چھپنے لگی تو حیرت کیا
مجھے تو رات پہ پہلے ہی اعتبار نہ تھا

وہ رسمِ سنگ زنی ختم ہو گئی شاید
کہ آج کوئی گریباں بھی لالہ زار نہ تھا

ہر ایک چیز مسخر تھی کیفؔ میرے لئے
اگرچہ اپنے مقدر پہ اختیار نہ تھا

ساحر آفاقی

کب تک تاثراتِ فغاں دیکھتے رہیں
تا کے جگر کی تاب و تواں دیکھتے رہیں
کب تک کریں نہ لوحِ مقدر کو چاک چاک
تا کے کسی کو جلوہ فشاں دیکھتے رہیں!
کب تک کریں نہ جیب و گریباں کو تار تار
اٹھتا ہوا جگر سے دھواں دیکھتے رہیں!
وہ جس طرح سے چاہے کرے دل کو پائمال؟
اور ہم بہارِ سرو رواں دیکھتے رہیں!
ہر صبحِ نو کو تیرگی ڈس جائے اور ہم!
بیٹھے تغیراتِ جہاں دیکھتے رہیں!
طوفان بدلے سینۂ قلزم میں کروٹیں؟
اور ہم خرامِ آبِ رواں دیکھتے رہیں!
کچھ تو ہوں میکدے میں بہر حیلہ شاد کام
کچھ التفاتِ پیرِ مغاں دیکھتے رہیں؟
ہم کام لیں نہ تیشۂ جرأت سے تا بکے؟
راہوں میں اپنی سنگِ گراں دیکھتے رہیں!
ہم رہ نوردِ شوق ہیں ساحرؔ یہ بے خبر
راہِ وفا میں سود و زیاں دیکھتے رہیں

ہم قلم کراچی

سید خورشید افسر بسوانی

O

شہر در شہر پھرتا رہا مدتوں میں محبت بھری اک نظر کے لئے
اب درِ دل پہ کوئی بھی دستک نہ دے اب یہ در بند ہے عمر بھر کے لئے

ظلمتوں میں جو پوشیدہ تھے حادثے روشنی میں بھی اُن سے نہ ہم بچ سکے
ہم کو سورج کی کرنوں سے کیا مل گیا، کیوں دعا ہم نے مانگی سحر کے لئے

جبہ روشن ہوا اک سجدۂ اولیں، قابلِ نازش و فخر ہے وہ جبیں۔
وہ جبیں ناز کرنے کے قابل نہیں، عام ہو جو ہر اک سنگِ در کے لئے

زندگی کو توقف سے کیا کام ہے، زندگی اک رواں چیز کا نام ہے
یہ مسافر بہت ہی سبک گام ہے اس کا ہر ہر نفس ہے سفر کے لئے

یہ جہاں تو بہت ہی دل آزار ہے، اس جگہ پر نفس زیست پہ بار ہے
اب نئی کوئی دنیا بسائیں کہیں، آؤ سوچیں جہانِ دگر کے لئے

موسمِ گل کا عالم نہ کچھ پوچھئے، زندگی بھر مجھے اس نے دھوکے دیئے
پہلے خونِ تمنا کی تھی آرزو، اب ہے بے تاب خونِ جگر کے لئے

چاندنی ہر طرف نور برسا گئی، ذرے ذرے میں اک دلکشی آ گئی
چاند دیکھو پھر جو نبار آ گیا، اب دعائیں نہ کرنا سحر کے لئے

افسر انساں کی منزل بہت دور ہے، اور پھر رہزنوں کا بھی محصور ہے
کعبہ و دیر بھی ہیں اسی راہ میں، اب ارادہ ہے جس رہگذر کے لئے

جمیل ہاشمی

○

خوابوں کو آگ لگ گئی، تعبیر جل گئی
لمحات کے الاؤ میں تصویر جل گئی

بام و درِ امید پہ رقصاں ہے دُودِ غم
اک زندگی کی حسرتِ تعمیر جل گئی

صبرِ وفا و جبرِ حوادث کی آگ میں
دل کی زبان، رُوح کی تحریر جل گئی

کل کا یہ واقعہ ہے فقیہوں کے ہاتھ سے
آیاتِ شوق و جذب کی تفسیر جل گئی

مرجھا گئے ہیں ذہن کی شادابیوں کے پھول
فکر و نظر کی جنتِ کشمیر جل گئی

جبریلِ آرزو کے پر و بال کیا جلے
سدرہ نشینِ شوق کی تقدیر جل گئی

جلنا تھا دشتِ یاس کے گہرے سکوت کو
لیکن چمن کی گرمیِ تقریر جل گئی

اُگلی ہے اب کے آگ وہ ابرِ بہار نے
نغموں کی سلسبیل کی تاثیر جل گئی

حیراں ہوں جمیلؔ، تمنا کے باب میں
کیونکر نہ لوحِ کاتبِ تقدیر جل گئی

فدا خالدی

جذبۂ شوق کارگر تو نہیں
جو اِدھر حال ہے اُدھر تو نہیں

آہ شرمندۂ اثر تو نہیں
میرے حالات کی خبر تو نہیں

جس قدر اعتماد ہے دل کو
اس قدر حسن معتبر تو نہیں

منزلیں خود تلاش کر لیں گی
شوق پابندِ راہبر تو نہیں

عظمتِ دو جہاں کا حاصل ہے
آدمی گردِ رہ گزر تو نہیں

کیوں کشش بڑھ چلی ہے راہوں کی
دیکھنا کوئی ہمسفر تو نہیں

دل میں اک شے کھٹک رہی ہے فدا
ان کی بدلی ہوئی نظر تو نہیں

علاقائی سرگرمیاں

نواب شاہ میں مشاعرہ

پاکستان رائٹرز گلڈ نواب شاہ ریجن کے زیرِ اہتمام
ر رشید احمد کنونیر نواب شاہ سب ریجن کے مکان پر بہ تقریب
عید ایک اردو سندھی مشاعرہ منعقد ہوا۔ جس میں نواب شاہ
ند خوش فکر شعراء نے شرکت کی۔ مشاعرہ کی صدارت
فیض محمد صاحب ایڈوکیٹ نے فرمائی۔

شعرائے بزم کا انتخاب کلام درج ذیل ہے ؎

تو نے بخشا زمانے کو عیش، غم اٹھانے کو ہم رہ گئے
سب سے اظہارِ شفقت کیا، ایک محروم ہم رہ گئے

(اظہار الدین صاحب)

ج پھر آ گیا دل کو تیرے وعدے پہ یقیں
کتنا ناداں ہے دیوانہ ہے سودائی ہے
ج کے بعد میں قطرہ بھی چکھوں تو کافر
ہاں مگر آج طبیعت بڑی گھبرائی ہے

(شاہد جعفری صاحب)

اضطرابِ دیدِ جاناں کی قسم
کھو دیا ہم نے نگاہوں کا بھرم
میرے سجدوں کو تڑپتا دیکھ کر
خود ابھر آئے تیرے نقشِ قدم

(شیدا بریلوی صاحب)

یہ لوگ ہنستے ہوئے ہونٹ دیکھتے ہیں مجید
گذر رہی ہے جو دل پر کسی کو کیا معلوم

(مجید وکیل صاحب)

رنگ ہے ان کا پھیکا پھیکا
ماتھے پہ ظلمت کا ٹیکا!
ہم نے سبق یہ ان سے سیکھا
قتل الموذی قبل الایذا!

(محمد میاں صدیقی صاحب)

بتاؤ خونِ بہاراں نچوڑنے والو
شکستہ شاخوں سے پیتا رہے لہو کب تک

ہم قلم کراچی

قضا بجھا نہ سکی سینۂ کلیم کی آگ
دبائی جائے گی آوازِ آرزو کب تک
رشید شعر کی رنگینیاں تمام ہوئیں
قلم کی نوک اٹھتی رہے گی تو کب تک
(رشید لکھنوی صاحب)

سندھی اشعار
اقامیں پیا الا آھن اچی راحت جي سامان يد
وسائو تنت ھمت کراچی نا جوش جولان يد
(رحیم بخش قمر صاحب)

علاوہ ازیں بشیر رضا، بردہ سندھی، ارشد، نور عباسی، نعیم علی خان آزاد وغیرہ نے بھی اپنے اشعار پڑھے۔

قاتلانہ حملہ کی مذمت

۳۱ جنوری کو پاکستان رائٹرز گلڈ نواب شاہ سب ریجن کا ایک ہنگامی اجلاس، سید رشید احمد صاحب کے مکان پر زیر صدارت محترم نور عباسی صاحب منعقد ہوا۔ حسب ذیل قرارداد بحال کی گئی۔

پاکستان رائٹرز گلڈ نواب شاہ سب ریجن کا یہ ہنگامی اجلاس لاہور میں گلڈ کے ایک ممبر مسٹر عبدالباقی بلوچ اور ایک معزز صحافی مسٹر ضمیر قریشی پر قاتلانہ حملے کو انسانی آزادی اور جمہوریت پر حملہ تصور کر کے سخت مذمت کرتا ہے۔ یہ اجلاس مسٹر ضمیر قریشی کو صحافت کے مقدس پیشے کے فرض کی ادائیگی میں جان دینے پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی کرتا ہے۔

خبرنامہ

مشرقی برلن میں اردو

کارل مارکس یونی ورسٹی لیپزگ میں انڈین ہسٹری کی پروفیسر مسز ڈوبین نے جو انڈین ہسٹری پر تحقیق کے سلسلے میں لکھنؤ آئی ہیں، علما اور ادیبوں کے ایک جلسہ میں اپنی تقریر کے دوران کہا کہ مشرقی جرمنی کی یونی ورسٹی میں اردو کا شعبہ بھی قائم ہے اور وہاں شعر و ادب سے دلچسپی لینے والوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔

خان رشید کو ڈاکٹریٹ

ممتاز ادیب اور سندھ یونی ورسٹی کے لکچرر خان رشید نے اردو میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی تکمیل کر لی ہے۔ ان کی تحقیق کا موضوع تھا شاعری کا تاریخی اور سیاسی پس منظر۔

علامہ سیماب پر ریسرچ

اردو کے عظیم المرتبت شاعر علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم کی نظمیہ شاعری پر زرینہ ثانی، ایم۔ اے ناگپور یونی ورسٹی ریسرچ
ہیں۔

فارسی ادب کی تاریخ

پنجاب یونی ورسٹی، برصغیر ہند و پاک میں فارسی ادب کی تاریخ مرتب کر رہی ہے۔ توقع ہے کہ یہ کام پانچ سال تک مکمل ہو جائے گا۔ یہ

تاریخ تین جلدوں پر مشتمل ہوگی پہلی دو جلدوں میں مغلیہ دور سے فارسی ادب کے متعلق مواد ہوگا۔ مغل تاجدار اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے دور تک کے فارسی ادب کی ترقی کا ذکر ہوگا۔ حالات زندگی لوک کہانیاں، شاعری، افسانے، اور جغرافیائی حالات اور معلومات اور تراجم ا دور کے سرکاری خطوط شامل ہوں گے۔ اس کے علاوہ قرآن اور اس کی تفسیر بھی دی جائے گی۔ اس سلسلے میں وقت کی ترتیب کا خا خیال رکھا جائے گا لیکن مسعود سعد سلمان۔ امیر خسرو۔ فیضی۔ بیدل۔ غالب اور اقبال کا ذکر ایک الگ باب میں ہوگا۔ ہر جلد میں اس کے سیاسی اور سماجی حالات کا مختصر خاکہ پیش کیا جائے گا۔ یونیورسٹی نے فارسی ادب کی ترقی کے لئے دونوں صوبوں کے ادبی شہ پاروں شامل کرنے کا فیصلہ کیا ہے ہر جلد میں ادبی مراکز مثلاً دہلی۔ آگرہ۔ اور لاہور وغیرہ اور فارسی ادب میں ہندوؤں کے حصے کا بھی ذکر کیا جائے گا۔

دیوانِ حافظ کی بنگالی مترجم چل بسیں

مسز پورنا ششی دیوی کا ۸۰ سال کی عمر میں کانپور میں انتقال ہوگیا ——— دیوی جی بنگالی زبان کی مشہور و معروف ادیبہ تھیں۔ واضح ہو کہ ششی دیوی نے دیوان حافظ کا فارسی سے بنگالی میں ترجمہ کیا تھا۔

تھائی لینڈ کی زبان میں قرآن کا ترجمہ

لاہور میں اسلامی ثقافتی ادارے کی طرف سے تھائی لینڈ کے شہزادہ پریم کے اعزاز میں ایک دعوت استقبالیہ دی گئی تھی۔ انھوں نے اس موقع پر کہا کہ قرآن مجید کا ترجمہ تھائی لینڈ میں کرنے کے لئے ماہروں کی ایک جماعت گذشتہ دو برس سے مصروف کار ہے۔

جارجیائی زبان میں "الف لیلیٰ"

جارجیا کے عربی دانوں نے مشہور داستان "الف لیلیٰ" کا جارجیائی زبان میں ترجمہ مکمل کر لیا۔ اب اس کی اشاعت کی تیاریاں ہیں۔ یہ ترجمہ قاہرہ میں طبع شدہ نسخے سے کیا گیا ہے، جس میں کئی ماہرین نے چیف ایڈیٹر جارجی تسیرتیلی کی سربراہی میں اس بڑے کام کو ا اس سے پہلے "الف لیلیٰ" کی صرف ایک کہانی جارجیائی زبان میں پیش کی گئی تھی۔

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ انتقال کر گئے

عظیم شاعر، اہم ڈرامہ نویس اور اعلیٰ نقاد ٹی۔ ایس ایلیٹ ۷۶ سال کی عمر میں ۴ جنوری ۱۹۶۵ء کو انتقال کر گئے۔ مرحوم صحیح معنوں میں عالمی اہمیت کے ادیب تھے۔

بیسویں صدی میں انگریزی ادب پر سب سے گہرا اثر ایلیٹ کا رہا ہے، ان کی شاعری نے جدید انگریزی شاعری کو ایک نئی معنویت سے آشنا کیا۔

ایلیٹ کا سب سے گہرا اثر تنقید پر ہے۔ انھوں نے نہ صرف مغربی تنقید کو متاثر کیا، بلکہ اردو ادب کو بھی۔ جمیل جالبی نے ان کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ عزیز احمد نے ان کی نظم "دی ویسٹ لینڈ" کا ترجمہ کیا تھا۔

ایلیٹ نے تنقید کے منصب کو واضح کیا اور اس کی روایت کی قدر و قیمت کا احساس دلایا۔ انھوں نے منظوم

ڈرامے کی صنف کو بھی ترقی دی۔ قرۃ العین حیدر نے ان کے ڈرامہ "کلیسا میں قتل" کا اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ مرحوم ڈرامائی شاعری کو شاعری کی سب سے اعلیٰ صنف سمجھتے تھے۔

۱۹۴۸ء میں انھیں ادب کا نوبل پرائز بھی ملا تھا ــــــــ ـ ـ ـ ـ

جوش کے اعزاز میں استقبالیہ

۲۸ر دسمبر ۱۹۶۳ء کی شام کو دبستانِ فکر و نظر ڈھاکہ نے حضرت جوش کے اعزاز میں ایک استقبالیہ اسلامی اکاڈمی کے آڈیٹوریم میں [illegible] جس میں مغربی پاکستان سے آئے ہوئے دیگر شعرا بھی مدعو تھے۔

سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے حضرت جوش (سرپرست دبستانِ فکر و نظر ڈھاکہ) نے اردو زبان کے محدود الفاظ کے ذخیرے کا [illegible] دہ کیا کہ میں مجبور رہوں اور میں اپنے خیالات کی عکاسی الفاظ کے ذریعہ نہیں کر سکتا اسی فیصد خیالات میرے دل میں ہی رہ جاتے ہیں جو اردو [illegible] ن کے الفاظ برداشت نہیں کر سکتے اور پھر کہا کہ جب میں اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہوں تو الفاظ کی ہڈیاں کڑکڑانے لگتی ہیں اس لئے میرے [illegible] دل ہی میں رہ جاتے ہیں جن کو میں بیان نہیں کر سکتا۔

ایک شاندار خصوصی مشاعرہ بھی ہوا۔ سامعین سے بھرے ہوئے ہال میں اس موقع پر حضرت جوش کے علاوہ استاد قمر جلالوی، [illegible] علی شاعر، عیش برنی، اور رضی اشرفی نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

کتابوں کی اشاعت کے سابقہ ریکارڈ ٹوٹ گئے

[illegible] دسمبر ۱۹۶۳ء کے سال شائع ہونے والی کتابوں نے سارا پچھلا ریکارڈ توڑ دیا ہے اور توقع کی جا رہی ہے کہ گذشتہ ۱۹۶۳ء کا سال اس [illegible] جائے گا اس کا انکشاف کرتے ہوئے وزیر محنت مسٹر لارڈ [illegible] نے کہا کہ [illegible] جو کتاب لکھی گئی ہے، وہ اس سال کا نمایاں کارنامہ [illegible]

چینی ادیب ـــــ اہلِ کشمیر کے ساتھ

چینی ادیبوں کی یونین نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے نام ایک تار میں امید ظاہر کی ہے کہ تنازعۂ کشمیر کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق [illegible] جیسا کہ پاکستان اور بھارت نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے [illegible] پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایک تار کے جواب میں کہی گئی ہے۔ [illegible] پاکستان رائٹرز گلڈ نے انضمام کشمیر سے متعلق بھارتی اقدامات کے سلسلے [illegible] چینی ادیبوں کا ردعمل جاننے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ چینی [illegible] یونین نے اپنے تار میں مزید کہا ہے کہ [illegible] جو یا نہ [illegible] پرستی کا طرز عمل اختیار کرنا بے سود ہے [illegible] کہا ہے کہ "افریشائی ممالک کے تنازعات منصفانہ اور معقول طور پر پُرامن [illegible] کے پانچ اصولوں اور بنڈونگ کانفرنس کے اصولوں کی بنیاد پر مساویانہ اور دوستانہ مذاکرات کے جذبے کے تحت طے ہو سکتے ہیں اور طے کئے جانے چاہئیں"

پاکستان، ایران اور ترکی کا اتحاد

پروفیسر حکیم نیر واسطی کل پاکستان ٹرکش کلچرل ایسوسی ایشن کے ایک وفد کے ہمراہ ایرانی روزنامہ "اطلاعات" کے چیف ایڈیٹر آقائے عباس مسعودی سے ملے۔

انھوں نے گلبرگ میں ایرانی کلچرل سینٹر میں آقا عباس کو سپاسنامہ پیش کیا جس میں ایران، پاکستان اور ترکی کے درمیان تہذیبی ثقافتی، مذہبی اور جغرافیائی اتحاد کو دائمی اور اٹوٹ قرار دیا۔ انھوں نے کہا کہ پاک ٹرکش ایسوسی ایشن ان تینوں ممالک کے درمیان مزید تعلق استوار کرنے کے لئے کام کر رہی ہے۔

آقائے عباس مسعودی نے سپاسنامہ کے جواب میں کہا کہ ایران کے عوام پاکستانیوں کے لئے اپنے دل میں خیر سگالی اور دوستی جذبہ رکھتے ہیں۔ اب مجھے یقین ہے، یہ دوستی صدر ایوب کی قیادت میں مزید مستحکم ہو جائے گی۔

انہوں نے ایسوسی ایشن کے ارکان کو یقین دلایا کہ ایران کے دانشور بھی اس ایسوسی ایشن کے ساتھ تعاون کریں گے۔

بلبل اکیڈمی کو نیشنل بینک کا عطیہ

نیشنل بینک پاکستان نے بلبل اکیڈمی کے فائن آرٹس ڈھاکہ کو ۲۵ ہزار روپے کا عطیہ دینے کا اعلان کیا ہے اس اکیڈمی میں تقریباً ۵۰۰ طالبعلم موسیقی، ڈرامہ اور آرٹس کے شعبوں میں زیر تربیت ہیں نیشنل بینک اس سے پہلے بھی اس اکیڈمی کو ۲۰ ہزار روپے کا عطیہ دے چکا ہے۔

سکھر میں یوم منٹو منایا گیا

ہندوپاک کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کی برسی کے موقع پر یہاں دو ادبی محفلیں منعقد ہوئیں۔ ایک محفل کا اہتمام جناب عبدالمجید خاں صاحب نے کیفے حنفی سکھر میں کیا تھا جس کی صدارت جناب رئیس بدایونی نے کی دوسری محفل رات کو تقریباً ساڑھے نو بجے دلک ہوٹل سکھر میں منعقد کی گئی جس کا اہتمام سیٹیزن کلچرل سوسائٹی نے کیا تھا اس محفل کی صدارت کے فرائض جناب محبوب الٰہی نے انجام دیئے اس محفل مشاعرہ میں مقامی اور بیرونی شعراء کرام نے شمولیت کی۔

لنگوئسٹک سوسائٹی کا قیام

فورلنگوئنز مشرقی اور مغربی زبانوں کا بذریعہ ڈاک اردو میں درس دینے والا پاکستان میں واحد ادارہ ہے۔ پاکستان میں تقریباً ہر شہر میں اس کے طالب علم موجود ہیں، لسانیات میں اس قدر دلچسپی کو مدنظر رکھتے ہوئے فورلنگوئنز نے لنگوئسٹک سوسائٹی قائم کی ہے یہ سوسائٹی ہر سال ایک سووینئر شائع کرے گی جو اسکے ارکان کی تصانیف پر مشتمل ہوگا ۔۔ سوسائٹی کی رکنیت کے لئے کم از کم دو زبانیں جاننا لازمی ہے۔ ممبری فیس دس نئے پیسے مقرر کی گئی ہے۔

پتہ :۔ فورلنگوئنز ۶۱۶ سی
شیر شاہ کالونی۔ کراچی

حالی کی مستند سوانح

ادارۂ معارف اسلامیہ کے زیرِ اہتمام یوم حالی کے سلسلے میں منعقد ہونے والے جلسہ میں ڈاکٹر عبدالسلام خورشید نے مولانا حالی کی ایک جامع اور مستند سوانح حیات مرتب کرنے پر زور دیا۔ اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ پاکستان میں اب تک اپنے قومی رہنماؤں کی سوانحِ عمری لکھنے کے سلسلہ میں کوئی قابلِ ذکر کام نہیں کیا گیا۔

تقریبِ شادی

ڈاکٹر احراز نقوی کی شادی ۲۹ ردسمبر ۱۹۶۷ء کو ڈاکٹر میمونہ انصاری سے قرار پائی۔ شادی میں پنڈی کے دانشوروں نے زیادہ تعداد میں حصہ لیا۔ خوشی کی بات ہے کہ دونوں ادیب اور دونوں کو لکھنے پڑھنے سے شوق ہے۔ ڈاکٹر میمونہ انصاری نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے رسوا پر اور ڈاکٹر احراز نقوی نے لکھنؤ یونی ورسٹی سے سرشار پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

خلیفہ عبدالحکیم کی برسی

مجلسِ فکر و نظر کے زیرِ اہتمام لاہور میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی برسی منائی گئی جس میں ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے عبدالحکیم کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں نے جو صدرِ جلسہ بھی تھے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صرف ایک بڑے شاعر اور اسکالر ہی نہیں بلکہ عظیم مسلم مبلغ بھی تھے۔

برطانیہ میں اردو

اوگن گیٹس (شراپشائر) میں رہنے والے برِ صغیر کے تارکانِ وطن کے فائدے کیلئے گھروں میں حادثوں کی روک تھام کے سلسلہ میں ہدایات اردو زبان میں شائع کی جارہی ہیں۔ شہر کی کونسل کی جانب سے یہ ترجمے ایک ہندوستانی باشندے نے کئے ہیں۔

مشاورتی بورڈ

ادارۂ مصنفین پاکستان حلقہ کراچی کی جنرل باڈی میں ایک قرارداد کے ذریعہ حکومت مغربی پاکستان سے مطالبہ کیا گیا کہ سندھی شاعر شیخ ایاز کے مجموعہ کلام "بھنور بھری آکاش" پر سے پابندی اٹھائے۔ اور حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ ایک مشاورتی بورڈ قائم کرے جس کا صدر ہائی کورٹ کا جج ہو اور گلڈ کا ایک نمائندہ بھی بورڈ کا ممبر بنایا جائے۔ کسی بھی کتاب پر پابندی لگانے سے پہلے بورڈ سے مشورہ کیا جائے۔

ریڈیو پاکستان اور پابندی

ریڈیو پاکستان نے گلڈ کے بعض ممبروں پر جو پابندی عائد کر رکھی ہے اس پر کراچی ریجن کے اجلاسِ عام میں سخت تشویش کا اظہار کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ ادب کے فروغ کی خاطر ایسی تمام پابندیاں اٹھالی جائیں۔

ہم قلم۔ کراچی۔

اقبال پر تاجکستان کے ادیب کی تصنیف

نوجوان تاجکستانی ادیب عبداللہ غفور روف نے "ڈاکٹر محمد اقبال اور ان کی فارسی شاعری" پر ایک جامع کتاب مرتب کی ہے جسے تاجکستان کی سائنس اکاڈمی شائع کر رہی ہے۔

کتاب میں مرقوم ہے کہ اقبال کا کلام تاجکستان میں بے انتہا مقبول ہے اور اسے بے حد سراہا جاتا ہے۔ شاعری کے تاجک زبان میں ان کی نظموں کے مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔

واضح رہے کہ عبداللہ غفور روف اس سے پہلے مرزا غالب اور میر تقی میر پر کتابیں لکھ چکے ہیں۔

اردو، روسی مصور لغت

اردو اور روسی زبانوں کے ماہروں کی مدد سے اردو، روسی لغت تیار کی گئی ہے۔ جو تقریباً تیس ہزار اردو الفاظ اور ان کے معنی و مطالب پر مشتمل ہے۔ اس لغت میں مطالب کی وضاحت کے لئے متعدد تصاویر بھی شامل ہیں۔

گلڈ کا اظہارِ تشویش

رائٹرز گلڈ کی چھٹی سالگرہ کے موقع پر ایک خصوصی قرارداد کے ذریعہ صوبائی اسمبلی کے رکن اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے ممبر عبدالباقی بلوچ پر قاتلانہ حملہ پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا۔ نیز ان کی جلد صحت یابی کے لئے دعا کی گئی۔ اور حکومت پر زور دیا گیا کہ وہ ملزموں کا کھوج لگانے اور انھیں سزا دینے کی ہر ممکن کوشش کرے۔

اس اجلاس میں مسٹر ضمیر قریشی کے قتل پر بھی رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ اور ان کے خاندان اور صحافی برادری سے گہری ہمدردی ظاہر کی گئی۔

جامی کی شاہکار تخلیق کی دریافت

سودیت یونین کے نوجوان محقق میخائل زاند نے فارسی کے شہرہ آفاق شاعر عبدالرحمٰن جامی کی ایک گمشدہ منظوم تخلیق "محنتی چیونٹی اور چڑیا" دریافت کی ہے۔ یہ ایک حکایت ہے جو "دی آنا اکادمی آف اورنٹیل لینگویجز" کی طرف سے شائع "فارسی نظموں کا مجموعہ" میں شامل تھی۔ مرتب کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ مگر اس نے اس انتخاب میں "بہارستان" کے کئی حصے بھی شامل کئے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ گمنام مرتب نے مذکورہ نظم کا اطالوی زبان میں ترجمہ فارسی اصل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ عبدالرحمٰن جامی کی ۵۵۰ ویں سالگرہ میں شرکت کرنے والے ماہرین و عالم اس دریافت کو اہمیت دیتے ہیں۔

ادیبوں کی کالونی

کراچی ریجن کے جلسۂ عام میں حکومتِ مغربی پاکستان، کمشنر کراچی اور کے۔ ڈی۔ اے کے چیرمین سے درخواست کی گئی کہ کراچی میں ادیبوں کی کالونی تعمیر کرنے کے لئے ایک قطعہ اراضی فوراً الاٹ کیا جائے۔

ترقی اُردو بورڈ کراچی

بچوں کے لئے لکھنے والے مصنفین کے لئے نئے انعامات

انجمن مصنفین پاکستان اور ترقی اُردو بورڈ کراچی کی جانب سے مشترک اعلان سال گذشتہ کی طرح اس مرتبہ بھی بچوں کے ادب پر مبلغ ڈھائی ہزار روپے کے انعامات کا اعلان کیا جاتا ہے۔ یہ انعامات حسب ذیل عنوانات پر موصول ہونے والے بہترین مسودات پر پیش کئے جائیں گے۔

عنوانات

۱۔ پانچ سے سات سال تک کے بچوں کے لئے

(۱) کہانیوں کا مجموعہ — مبلغ ۲۵۰ روپے کا ایک انعام
(۲) نظمیں — مبلغ ۲۵۰ روپے کا ایک انعام
(کل ۵۰۰ روپے)

۲۔ سات سال سے نو سال تک کے بچوں کے لئے

تاریخ، جغرافیہ، فلکیات یا حیوانی زندگی سے تعلق رکھنے والے کسی موضوع پر آسان اور دلچسپ کتابیں۔
مبلغ ۵۰۰ روپے کے دو انعام
(کل ایک ہزار روپے)

۳۔ نو سال سے گیارہ سال تک کے بچوں کے لئے

طبیعیات، نباتیات، میکانیات یا ریاضی سے تعلق رکھنے والے کسی موضوع پر آسان اور دلچسپ کتاب
مبلغ ۵۰۰ روپے کے دو انعام
(کل ایک ہزار روپے)

مسودات ۳۱ مارچ ۱۹۶۵ء تک حسب ذیل پتہ پر وصول ہو جانے چاہئیں۔ مسودات مصنف کی ملکیت رہیں گے۔ اگر گلڈ یا بورڈ نے انکو چھاپنا چاہا اسکے لئے مصنف سے علیحدہ شرائط طے کی جائیں گی۔ انعامات کی رقم صرف پاکستانی سکے میں ادا کی جائیگی۔ مسودات طبع زاد اور پیش کرنیوالے کی ملکیت ہونے چاہئیں۔ انعامات کا فیصلہ ایک کمیٹی کے سپرد ہوگا جس کے ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائیگا۔ اور اس کمیٹی کا فیصلہ حتمی تصور ہوگا۔

شان الحق حقی ۔ معتمد اعزازی
ترقی اُردو بورڈ ۔ اُردو منزل ۔ جمشید روڈ کراچی ۵

ایک بصیرت افروز ناول

آبلہ پا

اس ناول پر ۱۹۶۴ء کا آدم جی ادبی

انعام دیا گیا

از

رضیہ فصیح احمد

قیمت — ۸/-

ملنے کا پتہ

گلڈ انجمن کتاب گھر۔ وکٹوریہ روڈ۔ صدر۔ کراچی۔

اور

حبیب بینک لمیٹڈ



ادارہ مصنفین پاکستان


دورانِ خون کے
حیرت انگیز حقائق!
کیا آپ جانتے ہیں کہ
• ہمارے خون میں ۳۰ ہزار ارب سرخ ذرات ہوتے ہیں ان کی فنا و بقا کا سلسلہ ہر لحظہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ محض ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ ذرات ختم ہو کر ان کی جگہ نئے ذرات پیدا ہو جاتے ہیں۔
• ہمارا خون ایک لاکھ میل لمبی شریانوں اور وریدوں میں ... پائنٹ یومیہ کے حساب سے گردش کرتا ہے حالانکہ ہمارے جسم میں صرف چودہ پائنٹ خون ہوتا ہے۔
• ہمارے خون کی اقسام اس قدر ممیز اور متعدد ہیں کہ انگوٹھے کے نشان کی طرح ان کی الگ الگ شناخت ممکن ہے۔
• ہمارا خون ہر وقت جراثیم سے برسرپیکار رہتا ہے۔ اور اس کے نتیجہ میں جو فاسد مادے پیدا ہوتے ہیں ان کو جسم سے خارج کرتا رہتا ہے۔ اس کارکردگی پر بیماری سے بچاؤ کا انحصار ہے۔
صافی کے مستقل استعمال سے خون کی اس قدرتی کارکردگی کو تقویت پہنچایئے۔ صافی خون کو فاسد مادوں سے پاک کرتی ہے اور اس طرح سرخ ذرات کی پیدائش اور افزائش کے موانع کو دور کر کے صحت کو برقرار رکھتی ہے۔
صافی
خون صاف کرنے کی قدرتی دوا
SAFI
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان

اہم سرکاری مطبوعات

قیمت فی

۱- اسٹیٹ ڈیوٹی مینول ۳-۲۵ ر

۲- مینول آف سیٹلمنٹ لا اینڈ پروسیجر
۱۴-۲۵ ر

۳- کونسٹی ٹیوشنل ڈیکونٹس
جلد IV-B ۳۲-۶۲ ر

۴- کونسٹی ٹیوشنل ڈیکومنٹس
جلد IV-A ۳۰-۶۲ ر

۵- اردو ٹرانسلیشن آف فوڈ اینڈ
ایگریکلچر کمیشن رپورٹ ۵-۷۵ ر

۶- آؤٹ لائن آف تھرڈ فائیو ایر پلان ۲-۰۰ ر

ہم قلم

جلد ———— ۶

شمارہ ———— ۹

اپریل ۱۹۶۷ء

سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت فی پرچہ ۷۵ پیسے

(اراکین ادارۂ مصنفین سے ۵ روپے)

ادارۂ مصنفین پاکستان

پاکستان رائٹرز گلڈ

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن
کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت
کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوقِ انسانی پر
ایمان رکھتے ہیں جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں
کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار
اور ترسیل کی آزادی کیلئے آزادی بنیادی حقوق کے
حامی ہیں جن کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے
ہمیں اپنی عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں پورا فخر
ہے ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد
کرتے ہیں ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی
حبِ وطن کی قدروں کی نشوونما بین الاقوامی اخوت اور
تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے
کما حقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت
طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود برقرار رکھ سکے۔
ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر
ہم ایک ایسے خوشحال اور صحت مند معاشرہ کی
کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری قبول کرتے ہیں جس میں
سب کے لئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں
اور جہاں دولت و اقتدار انسانی قدروں اور
روحانی تصورات کے تابع ہوں اسی لئے ہم علم و
سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوشحالی کے فروغ
کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بتاریخ ۳۱ر جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

فہرست

ہم قلم۔کراچی۔

رسول حمزہ ۔ ایک تعارف

داغستان کے ملک الشعراء جناب رسول حمزہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی دعوت پر فروری کے پہلے ہفتے میں پاکستان کے دس روزہ خیرسگالی کے دورے پر تشریف لائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ روسی پریذیڈیم کا ایک نائب صدر محض ایک ادیب ہونے کی حیثیت سے یہاں آیا۔ جناب رسول حمزہ اپنے قیام کے دوران مغربی اور مشرقی پاکستان کا دورہ کرنے والے تھے لیکن والدہ کی اچانک علالت کی خبر ملتے ہی آپ دوسرے ہی دن واپس ماسکو تشریف لے گئے۔

مسٹر رسول حمزہ کی عمر ۴۷ سال ہے۔ روس کے ادبی حلقوں میں انہیں ایک امتیازی مقام حاصل ہے۔ موصوف سوویت پریذیڈیم کے رکن ہیں اور ان کا عہدہ نائب صدر کے مساوی ہے۔ وہ داغستان کے مشہور و معروف قومی شاعر ہیں ان کی تصانیف کا ترجمہ سوویت یونین کی زبانوں کے علاوہ دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں میں بھی ہو چکا ہے۔ جناب حمزہ کو ۱۹۶۲ء میں ان کی تصنیف "ہائی اسٹار" پر روس کا سب سے اعلیٰ ادبی انعام "لینن پرائز" دیا گیا تھا۔

رسول حمزہ کا نام نہ صرف سوویت یونین کے ادبی حلقوں میں روشن مینارہ کی طرح فروزاں ہے بلکہ عالمی ادبیات میں ان کی تخلیقات ایک اہم اضافہ سمجھی جاتی ہیں۔

ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کلاسیکی زبان میں موجودہ مسائل زندگی اور جدید رجحانات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ رسول حمزہ نے اپنے اردگرد کے ماحول کا گہرا مشاہدہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ وہ الفاظ و خیالات کے بادشاہ ہیں۔ ان کا کلام ماضی کی اہم روایات اور مستقبل کے خوش آئند خیالات کا حسین امتزاج ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں اس والہانہ اعتقاد اور محبت کا بھی اظہار کیا ہے جو انہیں دنیا کی دوسری قوموں سے ہے اسی لئے ان کی شاعری تمام قوموں کے لئے ایک ثقافتی ورثہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

جناب رسول حمزہ دنیا کی بہت سی ادبی مجلسوں میں روس کی نمائندگی کر چکے ہیں انہوں نے دنیا کے بہت سے ملکوں کا سفر کیا ہے۔ جن میں پاکستان، ہندوستان، سیلون، لاطینی امریکہ اور یورپ قابل ذکر ہیں۔

اس دورے میں بیگم فاطمہ حمزہ بھی ان کے ہمراہ تھیں۔ بیگم حمزہ داغستان کے قومی عجائب گھر کی سربراہ ہیں اور فن مصوری میں خاصہ درک رکھتی ہیں۔

گلڈ کے دفتر میں



دائیں سے بائیں۔ محترمہ بیگم رسول حمزہ۔ جناب رسول حمزہ۔
جمیل الدین عالی۔ شوکت صدیقی۔ لیفٹیننٹ کمانڈر انور۔

انجمن ترقیٔ اردو میں



جناب اختر حسین، صدر انجمن ترقی اردو، کتابوں کا ایک سیٹ



جناب رسول حمزہ قائد اعظمؒ کے مزار پر۔
بائیں جانب جمیل الدین عالی، انور اور فیض کھڑے ہیں۔



جناب رسول حمزہ بابائے اردو کے مزار پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔
دائیں سے بائیں۔ انور، شوکت صدیقی۔ جناب اختر حسین، جناب رسول حمزہ،
جمیل الدین عالی۔ بیگم فاطمہ رسول حمزہ۔

رسول حمزہ کا پیغام

میری دعا ہے کہ پاکستانی شعراء کو وہ مسرت حاصل ہو جو ان کی تخلیقات کی بدولت ہم وطنوں اور دنیا کے تمام شاعری کے شیدائیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ آپ کے وطن کے ممتاز شعراء میرے وطن کے رہنے والوں کے دل سے از حد قریب ہیں۔ آپ سے ملاقاتیں میرے لئے بے پایاں مسرتوں کا موجب تھیں۔ اور اب روانگی احساس غم لئے ہوئے ہے۔ میں ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جن سے میں ملا اور جو اس پُر مسرت موقع پر میرے دوست بن گئے۔

خدا کرے گلڈ کے تمام شعبوں میں عظمت، جوش اور عزم کی لہریں موجزن رہیں۔

اے دوستو! میں آپ سے دوبارہ ملنے کی توقع رکھتا ہوں۔

سلسلۂ روز و شب

(گلڈ کی سرگرمیاں)

۱۷ مارچ کی شام کو سبرینا میں پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) نے ممتاز روسی ناول نگار مسٹر ڈینیل گرانن کے اعزاز میں دعوتِ استقبالیہ کا اہتمام کیا۔ سب سے پہلے رائٹرز گلڈ کے قائم مقام سکریٹری جنرل جمیل الدین عالی نے مسٹر ڈینیل کو خوش آمدید کہتے ہوئے امید ظاہر کی کہ صدر ایوب کے مجوزہ دورۂ روس سے دونوں ملکوں کے تعلقات مستحکم ہو جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ ہم روسی ادیبوں کے ساتھ گہرے مراسم قائم کرنے کے خواہشمند ہیں تاکہ ان کے ذریعہ روسی عوام کی قربت حاصل ہو سکے۔

بعد ازاں مسٹر ڈینیل نے پاکستانی ادیبوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ لینن گراڈ رائٹرز یونین، جس کے وہ جنرل سکریٹری ہیں، بعض مفید پاکستانی کتب کا ترجمہ کرنے میں مصروف ہے۔ ان میں سے بعض روسی عوام میں بے حد مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ مسٹر ڈینیل نے کہا کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کو بھی روسی کتب کا اپنی قومی زبان میں ترجمہ کرنا چاہیئے۔ مسٹر ڈینیل نے کہا کہ پاکستان رائٹرز گلڈ پاکستان میں ادیبوں کی سب سے بڑی اور مستحکم جماعت ہے ۔ اور یہ جماعت دونوں ملکوں کے عوام کو قریب تر لانے میں بڑا عظیم کردار ادا کر سکتی ہے ۔ انھوں نے کہا کہ پاکستانی رائٹرز گلڈ اور روسی لینن گراڈ رائٹرز یونین کو پاکستان اور روس کے درمیان گہرے تعلقات قائم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے کیونکہ یہ دونوں جماعتیں اپنے اپنے ملک میں ادیبوں کی نمائندہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے پاکستان میں آکر بیحد خوشی محسوس ہوئی ہے اور مجھے افسوس ہے کہ میں لاہور نہیں جا سکا۔ میں اس وقت آپ لوگوں کو الوداع نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ وقتی طور پر خدا حافظ کہہ رہا ہوں۔

اس موقع پر جمیل الدین عالی نے مسٹر ڈینیل کو گلڈ اشاعت گھر کی مطبوعات کا ایک سیٹ بھی پیش کیا۔
اس استقبالیہ میں کراچی کے ممتاز ادیب و شاعر شریک ہوئے۔

ادارۂ مصنفین پاکستان، شاخ کراچی نے ۲۱ مارچ کی شام کو پیلس ہوٹل میں جناب قدرت اللہ شہاب سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ اور سفیر پاکستان در ہالینڈ کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا
اس تقریب میں کراچی کے مشہور شعراء اور ادباء شریک ہوئے۔

خواجہ تہور حسین

ظفر کی شخصیت و اہمیت

موجودہ دور کا انسان سوال کر سکتا ہے کہ کلامِ ظفر کی اہمیت کیا ہے اور اُردو ادب میں اس کا کیا مقام ہے۔ کیا اس نے غالب کی طرح اردو غزل کو فلسفیانہ نظر عطا کی یا حالی کی طرح اپنے کلام سے قوم کے تنِ مردہ میں ترقی کی روح پھونکی یا اقبال کی طرح انسان کو اس کی عظمت سے آگاہ کیا اور اپنے کلام سے فکر و عمل میں انقلاب بپا کیا؟ ظفر کی شاعری میں اس قسم کا کوئی پیغام نہیں اور نہ ہمیں اس دل گرفتہ شاعر کے کلام میں ان چیزوں کو تلاش کرنا چاہیئے کیونکہ اس دور کی زندگی اور ہمارے زمانہ کی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ زندگی میں تغیر کیساتھ ساتھ ادب اور اس کے مقاصد میں بھی انقلاب ہوا آج کے انسان کو جو آزادی نصیب ہے وہ عہدِ ظفر کے انسان کو نصیب نہ تھی اس عہد کے انسان کی مجبوری کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غالب جو ظفر کو "خسرو شیریں دہن" اور پیر و مرشد کہہ کر خطاب کرتا تھا ظفر کی موت پہ خاموش رہتا ہے۔ اس کے قلم سے کوئی مرثیہ نہیں نکلتا۔ غالب کی یہ مصلحت آمیز خاموشی بڑی بودی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن اس سے اس دور کی زبان بندی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے حالی پہلا شاعر ہے جسنے اردو شاعری سے تعمیرِ حیات کا کام لیا اور ان کے بعد رفتہ رفتہ اُردو شاعری مصلحانہ، ناقدانہ، بے باکانہ اور باغیانہ لہجہ اختیار کرتی گئی۔ اردو غزل کے موضوعات میں جن شعراء نے اضافہ کیا ان کی تعداد کچھ زیادہ نہیں۔ ظفر ایک ایسا ہی شاعر ہے۔ ظفر نے پہلی مرتبہ سیاسی حالات کو غزل کا موضوع بنایا۔ اسکو ظفر کا اضافہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سے قبل اردو غزل میں سیاسی حالات کا اظہار اس کثرت سے نہیں ملتا ظفر بذاتِ خود بساطِ سیاست کا ایسا شاہ تھا جو بتدریج پٹ رہا تھا جس جراءت اور بیباکی کا اظہار ظفر کی غزل سے ہوتا ہے وہ قابلِ توجہ ہے ان اشعار سے ظفر کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔

شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے اس کی شخصیت اس کے اسلوب بیان یا طرزِ ادا کی معمار ہوتی ہے۔ شخصیت کی تعمیر میں کسی فرد کے ذاتی حالات یا خاندانی رعایات

نسلی امتیازات اور اس دور کی تہذیبی و ادبی اقدار کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ فرد کی افتادِ طبع اور ذہنی رجحان کو تعمیرِ شخصیت میں خشتِ بنیاد سمجھنا چاہیئے چنانچہ کلام کے بناؤ اور تیور میں وہی خصوصیت ہوتی ہے جو صاحبِ شعر کی شخصیت میں کلامِ ظفر کے تفصیلی مطالعہ سے ایک درویش سیرت، بیباک و حق گو، منصف مزاج، عادل، انسان دوست و ادب نواز، خوش آواز و خوش رقم، موسیقی نواز و جدّت پسند، رنگین بیان و پرگو لیکن مضمحل و پراگندہ خیال اور بے بس و مظلوم انسان کی شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ ایک ایسے انسان کی شخصیت جو شاعر بھی ہے اور شاہ بھی۔ جو سیاسی قلا بازیوں، ذاتی مصائب اور شخصی ناکامیوں کے باعث رنجور ہے، جس کے سامنے بے شمار مسائل ہیں۔ جس کی رگوں میں تیموری خون موجزن ہے جس کے عہد میں مغلیہ سلطنت نے سسک سسک کر دم توڑا ہے۔ اور اس قوم کے افراد جو کبھی ہندوستان میں تاجر کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے اور جو مغلیہ دربار کے جاہ و جلال سے مرعوب ہو کر سر بسجود ہو جاتے تھے اب اس کے عہد میں تاجداری کے مدّعی تھے اس کے پہلو بہ پہلو کرسی نشینی کو اپنا حق خیال کرتے تھے اس کی نظروں کے سامنے انگریزوں کی سازشیں، مرہٹوں کی یورشیں، روہیلوں کی خونریزیاں و سینہ زوریاں ظہور میں آئیں۔ اس کے دادا شاہ عالم آفتاب کا عبرتناک انجام معمولی انجام نہ تھا۔ ان نامساعد حالات و واقعات نے اپنوں کی بے وفائیوں اور دربار کی ریشہ دوانیوں نے چنگیزی خون کی حرارت کو سرد کر دیا تھا۔ عالی حوصلگی کی جگہ مصلحت آمیز خاموشی، کم ہمتی اور مایوسی نے لے لی تھی یہی سبب ہے کہ ظفر کے جذبات جب کاغذی پیرہن میں ہمارے سامنے آتے ہیں تو ان سے ایک طرح کی فریاد درماندگی اور شکست کا اظہار ہوتا ہے یہ ظفر کے پُرخلوص لیکن المناک تجربۂ حیات کے آئینہ دار، اس کی نفسیاتی کشمکش اور سیاسی ناکامی کے غماز ہیں۔ عظمتِ پارینہ کے شدید احساس نے ظفر پہ حزن و ملال کی کیفیت طاری کر دی تھی اور یہی کیفیت اس کے کلام میں جاری و ساری نظر آتی ہے۔

فنِ شعر و موسیقی سے ظفر طبعی لگاؤ رکھتا تھا اس کی بدولت اس کے کلام میں موسیقیت کی کارفرمائی ہے۔ کلام میں "روحِ عنصر" پوری طرح جلوہ گر ہے۔ دبستانِ لکھنؤ کے معائب اور دلی کے دبستان کی خصوصیات کے لحاظ سے ظفر کا کلام ایک سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس ادبی فضا میں اردو شاعری پروان چڑھی ہے اور جو خصوصیات اس نے ورثہ میں پائیں کلامِ ظفر ان کا بہترین امین ہے۔ ذاتی لحاظ سے ظفر ایک سادہ مزاج انسان تھا۔ اس کی سادگیٔ طبع نے اس کے طرز کو سلیس و دلکش اور موثر بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ غرضکہ ظفر کی بھرپور شخصیت اس کے کلام میں نظر آتی ہے اس کی شخصیت کی خصوصیات اس کے طرز کی خصوصیات بن گئی ہیں۔ ظفر کی شخصیت ایک تہہ دار شخصیت ہے جس میں اس کی محرومیوں نے افسردگی، شخصی تجربات نے حقیقت آفرینی، جانکاہ حادثات نے دل سوزی، شاہانہ حیثیت نے پروقار پرشکوہ لب و لہجہ و محبوبانہ انداز، رنگین مزاجی نے شوخی، صوفی المشربی نے توکل و قناعت اور مشقِ سخن نے روزمرہ و محاورہ کی صفائی کے اوصاف پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جو ظفر کو صاحبِ طرز شاعر بناتے ہیں۔ بالخصوص زبان و بیان کے لحاظ سے کسی اور کا کلام اس سے لگا نہیں کھاتا۔ یہ سند کی حیثیت رکھتا ہے۔

ظفر کے وہ اشعار جن میں شاعرانہ تعلّی پائی جاتی ہے قابلِ غور ہیں۔ ان سے ظفر کے نظریہ شعر اور طرزِ ادا کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے ظفر کے کلام کا سرسری مطالعہ کرنے والا پہلا خیال یہ قائم کرتا ہے کہ ظفر ایک ایسا شاعر ہے جو الفاظ سے کھیلتا ہے اور محاورہ بندی و مشکل قوافی کے شوق میں غزل پر غزل لکھتا چلا جاتا ہے۔ لیکن یہ اس دور کا عام مذاق تھا اور مشقِ سخن کے لئے انتہائی ضروری بھی۔ بظاہر یہ کام آسان معلوم ہوتا ہے لیکن اتنا آسان نہیں جتنا عام طور پر سمجھ لیا گیا ہے

ظفر قلم برداشتہ غزل لکھنے پر فخر کرتا ہے۔

غزل یہ ایک کیا کتنی ہی ایسی پھینک دیں لکھ کر
ظفر ہم سے کے قرطاس و قلم پیچھے نہیں پڑتے

وہ فی البدیہہ غزل گوئی کے لئے دوسروں کو للکارتا ہے۔

اگر سخن کا ہے دعویٰ ظفر کے سامنے تو
قلم کو ہاتھ میں اے نکتہ چیں پکڑ کر بیٹھ

ظفر کے چند اور اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس زمیں میں اور پڑھتا ہے غزل اب یہ ظفر
سامنے اس کے کسی کو تم بلاؤ کون ہے

تماشا ہے نہیں ہیں بات کرنے کے بھی جو قابل
ظفر سے شعر کہنے کو مقابل ہو کے بیٹھے ہیں

خدا نے وہ روانی دی ظفر تیری طبیعت کو
ترا ہر شعر تر ہر بحر میں بحر المعانی ہے

میدان سخن میں وہ اگر تجھ سے ظفر بچتے
بھولے اپنا فصیحی بھی یاں طرز سخن جاوے

سن کر غزل ظفر کو اہل سخن کہیں ہیں
اشعار کے تصدق اس گفتگو کے صدقے

ظفر مشکل پسندی تیری سی اب کس کو آتی ہے
سخن ور دیکھ کر یہ طرز مشکل ہاتھ ملتا ہے

ظفر ہے عاشقانہ طرز میں تیرا سخن ایسا
کہ شاعر لوٹتا ہے سن کے اور تا بل پھر کرتا ہے

یہ تمام اشعار دیوان اول سے لئے ہیں۔ ظفر کو اپنی خوش آوازی اور خوش گلوئی پر بھی ناز ہے۔ چنانچہ کہتا ہے۔

نغمہ سنجی ہی تری ہے وہ خدا ساز ظفر
مطربوں کے ہیں کہاں ایسے خوش الحان گلے

لکھ غزل ایسی ظفر جس کا ہر اک مصرع یہاں
طغرہ ہو سو خوش خطوں کے لب اور ابرو پہ ظفر

مندرجہ ذیل اشعار سے ظفر کا نظریہ شعر معلوم ہوتا ہے

گر سخن میں عشق کی گرمی نہیں
اے ظفر ہرزہ سرائی ہے فقط

پہنچے سخن کو تیرے سخن کس کا ہے ظفر
تیرے کلام میں ہے بلاغت بھری ہوئی

معنی تازہ کی رہتی ہے ہمیں ہر دم تلاش
باندھتے ہیں ہم کوئی مضمون ظفر باندھے ہوئے

ظفر ہو کیونکہ نہ عام پسند تیرا سخن
کہ تیرا فکر رسا، دل صفا، دماغ اعلیٰ

باندھتا جیسے ہے وہ سوز جگر کے
کیا کہوں میں کہ ہے کیا شعر ظفر میں گرمی

تجھ سا تو خوش فکر و خوش گفتار دیکھا ہی نہیں
جو غزل تیری سنی ہم نے ظفر اچھی سنی

تو وہ اب شیر ژیاں بحر سخن میں ہے ظفر
جز ترے کون چڑھے منہ پہ گرسنے پائے

ان اشعار سے نمایاں ہوتا ہے کہ عمدہ شاعری کے لئے ظفرؔ "فکر رسا، دل صفا، دماغ ادنے" کا ہونا ضروری خیال کرتا تھا۔ کلام میں تاثیر کے لئے سلاست، سوز جگر، بلاغت اور معنی تازہ کا ہونا ظفرؔ کے نزدیک نہایت اہم تھا۔ ظفرؔ کے کلام کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ ان اوصاف پر پورا اترتا ہے۔ اس نے جگہ جگہ اپنے اشعار میں خاقانی، عرفی، خسرو اور میرؔ کی شاعری کا اعتراف کیا ہے۔ وہ غلام طوطیٔ ہندوستان ہونے پر فخر کرتا ہے۔ میرؔ کے متعلق ایک تضمین میں کہتا ہے۔

جیسا تھا شاعری میں اچھا میرؔ
پاتا گر قدرداں ویسا میرؔ
اسی طرح اے ظفرؔ نہ کہتا میرؔ
کوئی خواہاں نہیں ہمارا میرؔ
گویا جنسِ ناروا ہیں ہم

ظفرؔ کے پہلے دیوان میں ایک شعر ہے۔

غزل پڑھتی ہے گر بزمِ سخنداں میں ظفرؔ
کیوں نہ تحسین کے لئے پھر ہے سرِ میرؔ ہلے

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ میرؔ کا معتقد بھی ہے اور اس کی تحسین کا متمنی بھی۔

میرؔ کی طرح ظفرؔ کا کلام بھی عوام اور خواص دونوں کو متاثر کرتا ہے۔ اور یہ تاثر خاص خاص حالت میں نہیں عام حالت میں پیدا ہوتا ہے جو بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق کسی شاعر کے کامیاب ہونے کی دلیل ہے ہمارے خیال میں اچھے شاعر کے لئے زبان و بیان پر مکمل قادر ہونا نہایت ضروری ہے۔ یہ وصف ظفرؔ کے کلام میں بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ جذبات نگاری میں ظفرؔ کو قدرت کاملہ ہے۔ وہ جدت کا شائق اور معنی تازہ کا متلاشی ہے۔ اس کی شاعری کی ایک خاص ادا ہے جس میں اس کی شخصیت کا مکمل طور پر نظر آتا ہے اس کے اشعار منہ سے بولتے ہیں کہ ہم ظفرؔ کے ہیں وہ معنی آفرینی سے زیادہ حقیقت نگاری کا قائل ہے۔ جو دیکھتا ہے جس طرح دیکھتا ہے، بیان کر دیتا ہے۔ اس کے کلام میں ہمیں کوئی فلسفیانہ پیغام نہیں ملتا۔ ان چیزوں کی اسے فرصت ہی کہاں تھی ہمیں اس کمی پر معترض بھی نہ ہونا چاہئیے۔ اعتراض تو ہم اس وقت کر سکتے تھے۔ جب ظفرؔ اپنے ماحول اور اپنی ذات سے چشم پوشی کرتا، اپنی ذاتی ناکامیوں اور محرومیوں پر پردہ ڈالتا۔ اس کی شاعری ان حالات کا ردعمل ہے۔ جن سے ظفرؔ اور اس کا عہد دوچار تھا۔ ماحول کا تمام کرب سمٹ کر اس کے اشعار میں سما گیا ہے۔ اس کے کلام میں ایک خاص قسم کی "دل گرفتہ شگفتگی" پائی جاتی ہے اور یہ ایک ایسی ادا ہے جو اس دور کے کسی اور اردو شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتی۔

ظفرؔ کا ایک بڑا کارنامہ تسہیل زبان اردو ہے۔ اس نے تحریک سہل گوئی کی تجدید اس وقت کی جب اس کی اشد ضرورت تھی۔ اردو شاعری اگر نصیرؔ، ذوقؔ اور مومنؔ کے نقشِ پر چلتی یا ظفرؔ مکمل طور پر لکھنویت کے زیرِ اثر رہتا تو اردو شاعری معنی آفرینی میں خواہ آسمان کا تارا بن جاتی لیکن زبان کے اعتبار سے "معمہ چیستان" بن کے رہ جاتی۔ ظفرؔ اور اس کی ادبی شخصیت نے اپنے پورے دور کو متاثر کیا ہے جس نے اردو شاعری پر ایک صحت بخش اثر مرتب کیا۔ اس کے زیرِ سایہ داغؔ جیسے زبان داں شاعر نے پرورش پائی جنکی بدولت اردو غزل کو حیات نو ملی ظفرؔ کی بدولت اردو غزل کے اسلوب بلکہ اس کی ہیئت میں ایک خاموش انقلاب رونما ہوا یہ ایک اہم بات ہے جس کو اب تک نظر انداز کیا جاتا رہا۔ اگر ظفرؔ نہ ہوتا تو اردو ادب غالبؔ کی عام فہم غزلوں اور اس کے اردو خطوط سے محروم رہ جاتا کیونکہ وہ ۱۸۳۷ء یا اس کے کچھ عرصہ بعد سے کر ۱۸۴۷ء تک مرزا کی اصلی ادبی زبان فارسی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا اس زمانے میں کا ہے کا ہے اردو میں اشعار کہتے رہے۔ ۱۸۴۷ء کے بعد بہادر شاہ سے مرزا کے تعلقات خوشگوار ہو گئے تھے اور اب انھوں نے انبساط حضرت کے لئے اردو کو اپنی زبان بنایا" (غالب نامہ ص ۲۲۸ - ۲۲۱، غالب ص ۸۰/۸۴، یادگار غالب ص ۱۸۷) چنانچہ ۱۸۵۰ء میں جب مرزا تاریخ نویسی کی خدمت پر مامور ہوئے

تو انھوں نے اردو مراسلت نگاری شروع کی"۔ غالبؔ کی بہترین غزلیات اکثر و بیشتر اسی دور کی کہی ہوئی ہیں۔ غالبؔ کے کلام پر دربار ظفر کے کلام کو اکثر ناقدین فن نے مانا ہے۔ بہر طور غالبؔ کے خطوط اور ان کے درباری دور کے کلام میں بلاشک و شبہ ظفرؔ کی شخصیت کا عمل دخل ہے۔ اردو شاعری کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ اسے بہادر شاہ ظفر جیسا مربیٔ فن، سخن سنج و سخن فہم و صاحب زبان سرپرست نصیب ہوا جس کی بدولت اردو شاعری نے نہ صرف یہ کہ اپنی خصوصیات کو برقرار رکھا بلکہ زبان و بیان دونوں اعتبار سے نمایاں ترقی کی۔ ظفرؔ ایک درویش صفت شاہ و شاعر تھا اسی لئے اس کے تعلق سے اردو شاعری اپنی تہذیبی اقدار سے بیگانہ نہ ہو سکی۔ ظفرؔ کو اپنی اردو گوئی پر بہت ناز تھا۔

تھا جو ہر سو فارسی گو کوئی مشہور ہے ظفرؔ
ہند وہ اب دیکھ کر ہندی ترا دیوان ہے

اس کی بالواسطہ اور بلاواسطہ کوششوں سے اردو زبان و شاعری نے جو فروغ پایا اس کی مثال پر میرؔ اور سوداؔ کے عہد کے علاوہ نہیں ملتی۔ وہ ایک پرگو قادر الکلام شاعر تھا اگر اس کے دواوین سے ان اشعار کا انتخاب کیا جائے جن کا موضوع حسن و اخلاق اور انسانیت ہو تو ایک نہایت عمدہ مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ ان اشعار سے ظفرؔ کی انسان فہمی کا پہلو ہمارے سامنے آتا ہے۔ اس کی سخن وری و زبان دانی کا ذکر ہر منصف مزاج نقاد اور تذکرہ نگار نے کیا ہے۔ پروفیسر نگار ساں رقمطراز ہے۔

"شیفتہؔ اور کریم نے جو باکمال شاعر تھے اپنے تذکرہ میں ظفرؔ کی جودت طبع اور اوصاف حمیدہ کی بڑی ستائش کی ہے یہ دونوں مصنف ظفرؔ کو اپنے عہد کے شعراء کی صفِ اول میں جگہ دیتے ہیں۔ اور اس میں کلام نہیں کہ ظفرؔ کی شاعری میں خاص جدت پائی جاتی ہے۔ اور ان کا کلام زبان کے اعتبار سے بھی اہمیت رکھتا ہے" (خطبات نگار ساں۔ ص ۲۲۱)

اردو زبان کی ترقی میں ظفرؔ کی مساعی ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ مملکت شعر و ادب میں سکہ رائج الوقت کی حیثیت رکھتا ہے روزمرہ کی صفائی اور سلاست زبان کے لحاظ سے ظفرؔ کا کوئی ہم عصر اس کا ہم رتبہ نہیں۔ ظفرؔ کی اردو معمار جامع مسجد کے قلعہ معلیٰ کی اردوئے معلیٰ ہے۔ وہ درجہ اول کا شاعر ہے۔ اس کی زبان سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کو محسنِ زبان اردو کہنا بے جا نہ ہوگا جس سے ایک زمانہ فیضیاب ہوا۔

ہے نقدِ سخن رائج عالم میں ظفرؔ اپنا
منہ کھول دیئے ہم نے مدت سے خزانوں کے

ہم قلم۔ کراچی

مختار کریمی

موٹر رکشا

اک سیہ ناگن شکنجے میں کئی بل کھا رہی ہے
اور اس کی پشت پر رفتار کا جادو جگائے
اک مشینی روپ دھارے
بھوک یوں آجا رہی ہے
جس طرح سرکس میں اک دوشیزۂ نازک بدن
خود کو سنبھالے
تار کے باریک رستے پر فضا میں دوڑتی ہے

زندگی کا حکم پا کر
ایک منزل کی تمنا
فاصلے کو تا بہ ساعت میں جکڑنا چاہتی ہے
بھوک کے کاندھے پہ یوں بیٹھی ہوئی ہے
جیسے سرکس کی وہ دوشیزہ

توازن کے لئے

چھتری لئے ہو

حدتِ رفتار سے جب تارِ ساعت ٹوٹتا ہے
فاصلہ دستِ تمنّا سے نکل کر
پھر افق تک پھیلتا ہے
بھوک کا وہ پیکرِ آہن مثالِ ظرفِ شیشہ ٹوٹتا ہے
زندگی کچلی ہوئی مردہ تمنّا سے لپٹ کر
چیختی ہے
اور ناگن کی زباں خونِ تمنّا چاٹتی ہے

احمد رئیس

مکالمہ

اے خداوند! تیری درگہ میں
اپنی فریاد لیکر آیا ہے
اک گنہ گار، بندۂ ناچیز
جس کو دنیا رئیس کہتی ہے
جو تہی دست ہے تہی داماں
جو مجسم الم کی ہے تصویر
جس کے ماتھے پہ سلوٹیں غم کی
جس کے چہرے پہ ہیں تھکن کے نقوش
جس کی رگوں میں سوگواری ہے
جسکے ہونٹوں پہ ہیں شرر رقصاں
جس کے دل میں بجلیوں کا قیام
جس کے سینے میں زخم جلتے ہیں
جس کو میخانۂ حیات سے بس
جام زہراب ہی کے ملتے ہیں

اس تیرے خاکدانِ ہستی میں
وہ عجب سرپھرا ہے، پاگل ہے
دوستوں کے خلوص سے نالاں
اور عزیزوں کے پیار سے شاکی
اپنا مخلص ہے نہ کسی کا حبیب
اور زمانے کا غمگسار بھی ہے
اپنی دنیا میں مست رہ کر بھی
ساری دنیا سے پیار کرتا ہے
وہ عجب سرپھرا ہے، پاگل ہے
تو مگر اُس کو کیا سمجھتا ہے
تیری نظروں میں بھی ہے وہ مجرم؟
اے خداوند اے غفور الرحیم؟

○

ہم قلم کراچی۔

سعید رضا سعید

کالی دیوار

یاد کی راکھ جس دم کریدی گئی،
کچھ دبی اس میں چنگاریاں مل گئیں
دل کے اس خشک و برباد صحرا میں بھی
چند اجڑی ہوئی کیاریاں مل گئیں

کتنی ہی گردشیں اس زمیں نے سہیں
جانے کتنے مہ و سال آتے رہے
کتنے خورشید ظلمات میں کھو گئے
ہم دیئے کی طرح ٹمٹماتے رہے

تو نے اجنبی دیس کی راہ لی،
ہم خود اپنے وطن سے بھٹکتے رہے
راہ چلتے کے دامن کو تھاما کئے
اور لوگ اپنے دامن جھٹکتے رہے

زندگی بھر سکون کی رہی جستجو
زندگی بھر سکون کو ترستے رہے
دل سے محرومیوں کے جو بادل اٹھے
آنکھ سے اشک بن کر برستے رہے

آج جب عمرِ رفتہ پہ ڈالی نظر
تیری یادوں کے غنچے مہکنے لگے
پھر فضاؤں میں ایک کیف سا بھر گیا
ذہن چکرایا ، پاؤں بہکنے لگے،

کاش یہ لمحاتِ جاوید ہوں
ساعتیں منجمد ہو کے رہ جائیں سب
وقت کے پہیئے تھم جائیں اس موڑ پہ
جتنے آنسو ہیں اک بار بہہ جائیں سب

چھوڑ کر پھر کسی کو نہ جائے کوئی
ہجر میں پھر کسی کو نہ رونا پڑے
ختم ہو جائے آپس کا ہر فاصلہ
آدمی کو نہ مجبور ہونا پڑے

آکہ مل جل کے ہر جبر سے ہم لڑیں
توڑ دیں بیچ کی کالی دیوار کو،
اپنے گیتوں کو پہنا دیں جوالا مکھی
دھار تلوار کی دیدیں اشعار کو

○

کوثر چاند پوری

شریکِ غم

نو برس کی عمر میں پہلی بار ایک بات اس کے ذہن میں
لائی' ایک کمزور کیڑے کی مانند' پانی کی بھری ہوئی بالٹی لے کر
پر چڑھتے ہوئے وہ چوتھی سیڑھی پر کھڑا ہو کر ہانپنے لگا۔ اور
لمبا سانس لے کر اس نے سوچا، وہ نوکر ہے' پیدائشی نوکر'
پہنچتے ہی اسے ایک عجیب قسم کی تھکن کا احساس ہوا' پھر جسم میں
طرح کی گرمی محسوس ہوئی' اس نے' بالٹی' اس میں بھرے
پانی' اس تنگ زینہ' اور اس سیڑھی کو بھی جس پر وہ کھڑا
شدید نفرت کے ساتھ دیکھا اور سیڑھی پر زور سے جوتا
نے لگا۔ جیسے ان تمام چیزوں کو کچل ڈالنا چاہتا ہے، اور
کے ساتھ اپنی پھوپی زہرہ اور اس کی لڑکی نوابن کو بھی۔

اُسے چوبیس گھنٹے زہرہ پھوپی کے اسی گھر میں رہ کر
ج کرنے کا پابند کیا گیا تھا، یہ پابندی اس کے باپ نے
تی جو دفتر میں چپراسی تھا اور تنخواہ میں پورے کنبہ کا پیٹ
بھر سکتا تھا۔ تنخواہ میں کئی سال بعد معمولی سا اضافہ ہوتا تھا اور
ں ہر سال ایک نمبر ضرور بڑھ جاتا تھا' پچھلے محرم پر اسکے
سات بچے تھے اس محرم پر آٹھ ہو گئے تھے۔ وہ کماتے کماتے
تھکا جا رہا تھا اور بیوی' بچے پیدا کئے جا رہی تھی۔ اس کی کوکھ
میں ابھی بڑی جان تھی، اور ہونی بھی چاہیئے تھی۔ بچپن میں اسکی
ماں ایک ہی دعا دیا کرتی تھی۔

"بیٹی تو پوتوں پھلے اور دودھوں نہائے!"

پوتوں نے اُسے کوندلی کی طرح پھلوں سے لاد دیا تھا۔
دودھ نہانے کو کیا پینے ہی کو کبھی نہ ملا تھا۔ وہ اکثر سوچا کرتی تھی
کہ ماں کی دعا کا ایک ہی حصّہ خدا نے سُنا' اور دودھ نہانے
کے لئے مل بھی جاتا تو اتنے بچوں کی ضروریات کیونکر پوری ہوتیں
اس کے کسی بچہ نے اب تک اوپر کا دودھ چکھا تک نہ تھا۔
سب کی پرورش ماں کے دودھ پر ہوئی تھی اس طرح وہ اپنے
دودھ سے بھی غسل نہ کرسکی۔

اس کے باپ نے ایک دن پلنگ پر بیٹھے بیٹھے بہت
بڑی انگڑائی لی ساتھ ہی ایک جماہی بھی، شاید نیند پوری نہ
ہوئی ہو یا اولاد کے بوجھ سے بدن ٹوٹنے لگا ہو پھر وہ بیوی

سے مخاطب ہو کر بولا

"نورے کو کہیں لگا دینا چاہیئے۔"

"میں اسے اسکول بھیجنے کا سوچ رہی تھی۔"

"اسکول! — ہاں جاتا تو اسے وہیں چاہیئے تھا مگر مجھے نورے کو منشی نہیں بنانا، زہرہ آپا کی لڑکیاں بی۔ اے پاس کر کے نوکری کر رہی ہیں، وہ اسکول میں دوسری لڑکیوں کو پڑھاتی ہیں۔ نورے نے آٹھویں کلاس پاس بھی کر لی تو اسے کون ماسٹری دے دیگا، پھر پڑھنا پڑھانا ہمارے یہاں کی ریت بھی نہیں۔"

"کون رکھے گا اسے اتنی سی عمر میں۔"

"یوں تو میں نے ایک ہوٹل کے مالک سے بھی بات کی تھی وہ اتنے بڑے لڑکوں کو چار روپے کھانے پر رکھ رہا ہے، اُسے ایک نہیں دس بارہ لڑکوں کی ضرورت ہے، مگر کل ہی زہرہ آپا نے کہا کہ نورے کو یہاں بھیج دو وہ دن رات یہیں رہے خوب کھائے پیئے اور کام کرے۔ کام تو کچھ یوں ہی سا ہے، ہم آپ ہی کر لیتے ہیں بس نیچے نل پر سے پانی بھر کر لانا ہوگا۔ ایک چھوٹی بالٹی منگا دینگے پانی کا کچھ ایسا خرچ بھی نہیں۔ دس پانچ بالٹیاں ہی لانی ہونگی، کپڑے بھی بنا دیا کریں گی۔"

"اور تنخواہ!" — نورے کی ماں نے اشتیاق کے ساتھ سوال کیا، جیسے وہ اپنے چپراسی شوہر کے چھوٹے سے لڑکے کو بہت بڑی چیز سمجھ رہی ہو۔

"روٹی کپڑا ہی بہت ہے، ان سے ہماری عزیزداری بھی تو ہے۔"

"ہے تو کیا ہوا، دو روپے تنخواہ بھی دینی ہوگی انہیں۔"

"وہ نہیں مانیں گی، تم نہیں جانتیں، میں جانتا ہوں زہرہ آپا کو، چھٹانک بھر گوشت منگاتی ہیں، اور شام کو انھیں بوٹیوں میں پھر مصالحہ ڈال کر پکا لیتی ہیں۔"

"پھر نورے کو ہوٹل پر لگا دو۔"

"پاؤں ٹوٹ جائیں گے سالے کے دن بھر چائے کے سنگل ڈھوتے ڈھوتے۔"

"پانی کی بالٹیاں ڈھونے کا نتیجہ بھی یہی ہوگا۔"

"تم تو بحث کرتی ہو۔"

"اور تم لڑنے کو تیار ہو، زہرہ تمہاری بہن لگتی ہے، شاید تمھیں یاد نہیں رہا نورجہاں کی پہلی تنخواہ سے اس نے سارے عزیزوں کی دعوت کی تھی ہمیں پوچھا تک نہیں تھا میں تنخواہ کے بغیر زہرہ کے یہاں نورے کو نہیں رکھواؤں گی۔"

"نہیں، ایسا نہ کہو نورے وہیں جائے گا۔"

زہرہ نورے کی دور کے رشتہ سے پھوپی ہوتی تھی اور کرائے کے مکان میں اوپر کی منزل میں رہتی تھی۔ گرمیوں میں پانی وہاں نہیں پہنچتا تھا اور سقہ آٹھ روپے مہینے میں بھی دو مشکیں ڈالنے کی حامی نہ بھر رہا تھا، اتنا اونچا زینہ چڑھنے سے وہ ڈرتا تھا، کہیں دمہ نہ ہو جائے۔ زہرہ آپا کو پانی کی سخت تکلیف تھی۔ کونے میں میلے کپڑوں کا ڈھیر ہو گیا تھا، فیکٹری پر دو آنے کپڑا دے کر اُسے کپڑے دھلوانے کی بالکل ہمت نہ ہوتی تھی، چاہتی تھی لڑکیاں ہی گھر دھولیا کریں کپڑے دھونے کیلئے پانی کی ضرورت تھی اور پانی نل میں آتا ہی نہ تھا، مکان والے سے شکایت کی تو اس نے کہہ دیا۔

"پانی کی بہت تکلیف ہے تو مکان خالی کر دو۔"

مکان چھوڑ کر دوسرے گھر میں جانا ایسی سخت مہم تھی جسے اس زمانہ میں شاید ہی کوئی سر کر سکے پاکستان گئے ہوئے عزیز تو مل سکتے ہیں مگر مکان نہیں مل سکتا، مجبور ہو کر زہرہ نے اپنے چپراسی بھائی سے کہا۔

"قادر بھیا نورے کو ہمارے یہاں رکھوا دو!" — اس نے قادر کو اس کے پہلے کم شکر کی نمک ملی ہوئی چائے بھی پلا دی تھی، وہ مروت میں انکار نہ کر سکا اور کھانے کپڑے پر نورے زہرہ کے یہاں نوکر ہو گیا، زہرہ نے ناشتہ پہلے ہی حذف کر دیا تھا اور صاف کہدیا تھا۔

"صبح کے وقت چائے نہیں ملے گی نورے کو!"

"شام کو تو ملے گی۔"

"وہ ہمارے یہاں شام کو چائے بنتی ہی نہیں۔"

"باسی روٹی تو دے دیا کروگی؟"

"روٹی کبھی بچتی ہے کبھی نہیں۔"

"جس روز بچ جائے اس روز تو دے دینا۔"

"وعدہ نہیں کرتی، تم تو ایسی شرطیں لگا رہے ہو قادر بھیا جیسے میرا گھر نہ ہو کسی غیر کا ہو ___ یا جیسے میری تمہاری رشتہ داری ہی کبھی نہ تھی۔"

"رشتہ داری سے انکار نہیں مگر آیا کھانا تو آدمی اپنے گھر بھی کھاتا ہے کوئی بڑا آدمی ہو تو صبر کرے نورے بچہ ہے ابھی۔"

"میں جانتی ہوں، مگر چائے تو نورے کو گھر پر بھی نہیں ملتی ہوگی۔"

قادر چپ ہو گیا، اسے زہرہ کی سنگدلی پر غصہ آنے لگا تھا، نورے پر رحم بھی آیا، زہرہ اسے خاموش پاکر ڈری کہیں انکار نہ کر دے اس نے جلدی سے کہا۔

"نہیں مانتے تو صبح کو ایک پیالی چائے دے دیا کروں گی میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ چائے بچوں کو نقصان دیتی ہے۔ پھر شکر کی بڑی دقت ہو رہی ہے۔"

اگلے دن وہ نورے کو زہرہ کے یہاں چھوڑ گیا۔ اسکے جاتے ہی زہرہ نے نورے کے ہاتھ میں جست کی بالٹی تھما کر کہا

"پانی بھر لا نورے نل پر سے۔"

"کہاں ہے نل؟"

"نیچے گلی میں۔"

نورے نئی چمکتی ہوئی بالٹی دیکھ کر بہت خوش ہوا جیسے وہ کوئی کھلونا ہو، وہ کنڈا پکڑ کر بالٹی کو اس طرح ہلاتا ہوا زینہ سے اترا کہ وہ بجتی بھی رہی۔ ایسا قیمتی جھنجنا اس نے کبھی ہاتھ میں نہ لیا تھا، نورے نل پر پہنچا تو وہاں بڑی بھیڑ تھی ___ کیو لگا ہوا تھا، پانی بہت باریک اور مری سی دھار سے آ رہا تھا۔ ایک سندھی بدن پر لائف بائے لگائے اپنی باری کا منتظر تھا۔

باری آتے ہی وہ حوض میں بیٹھ کر نہانے لگا، دور دور تک چھینٹیں اڑنے لگیں اس نے حوض کے اندر ہی بہت سا بلغم اگل دیا، وہ اٹھا تو ایک بوڑھی عورت نے نل میں اپنا گگرا اڑا دیا، اس کے بعد ایک اور جوان عورت نے مٹی کا گھڑا بھرنا شروع کر دیا پھر ایک کڑیل جوان ململ کا کرتہ پہنے اور تہمد باندھے بہت بڑا مٹکا لئے آیا اسے دیکھ کر بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی، اس نے نئے مٹکے کو بڑے اطمینان کے ساتھ کھنگالا پھر دھار سے لگا دیا، کئی منٹ کے بعد مٹکا بھرا اور نورے بالٹی سنبھال کر دوڑا مگر ایک اور لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لیا، اور اپنا گھڑا نل کے نیچے رکھ دیا، نورے نے احتجاج کیا تو اس نے ڈانٹ کر کہا۔

"تو محلہ میں نہیں رہتا تجھے یہاں سے پانی بھرنے کا کیا حق ہے۔"

"میں اوپر والے گھر کا نوکر ہوں۔"

ایک عورت یہ سن کر ہنسی۔

"نوکر ہے، ابھی پاجامہ میں سے نکلا نہیں اور نوکر ہو گیا۔"

"کیا ہوا" اور شخص بولا "زمانہ وہ آگیا کہ ہر چیز کچی استعمال ہو رہی ہے، آم، پپیتہ، کیلا بالکل کچا توڑ کر پاؤڈر چھڑک کر پکا لیا جاتا ہے۔ پکتا کیا ہے اوپر سے زرد ہو جاتا ہے، اسے وقت سے پہلے توڑا ہوا پھل سمجھ لو۔ جو پوڈر میں دبا ہوا ہے۔"

نورے کو موقعہ ملا تو اس نے جلدی سے بالٹی کھنگالی پھر اسے بھرنے لگا، سفید بالٹی میں شفاف پانی اور اس پر تیرتے ہوئے سفید بلبلے نورے کو بہت اچھے معلوم ہوئے ایسا لگا جیسے روئی کے گالے بادلوں سے گلے مل رہے ہوں اس نے بالٹی پوری بھر لی اور اسے اٹھا کر زینہ تک آیا پہلی ہی سیڑھی چڑھنے کے بعد پتہ چلا کہ جس بالٹی کو وہ کھلونا سمجھ رہا تھا وہ کھلونا نہیں اچھی خاصی گلے کی پھانسی ہے اس نے تھوڑا سا پانی چھلکا دیا اور دو سیڑھیاں چڑھ کر ایک منٹ ٹھہرا اور پھر ایک اور سیڑھی چڑھ گیا۔

اس کا سانس بُری طرح پھول گیا وہ ہانپنے لگا دیر تک وہیں کھڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا اور ایک بہت بڑا سانس کھینچ کر اُس نے سوچا۔

وہ نوکر ہے
پیدائشی نوکر
بلکہ خاندانی بھی

مالکن پھوپی سہی ! اس کی حیثیت ایک معمولی نوکر ہی کی ہے۔

ذرا دیر کو اسے اپنے آپ سے گھن سی آئی، اس نے ہر چیز کو شدید نفرت کے ساتھ دیکھا اور سیڑھی پر زور سے جوتا رگڑنے لگا، جیسے آس پاس کی سب چیزوں کو روند ڈالنا ہا ہتا ہو۔

بڑی مشکل سے نورے اوپر پہنچا، اب اسے بالٹی کو نکی میں الٹ کر دوسری بالٹی بھرنے پھر نیچے جانا تھا وہ چھوٹے سے اسٹول پر کھڑا ہو کر اور ٹنکی میں جھانک کر ڈر گیا اس میں پندرہ بیس بالٹیوں سے کم کی گنجائش نہ تھی۔ نورے نے بالٹی ٹنکی میں انڈیل دی اور کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا، ایک جگہ تین چار ارپائیاں، دو تولیے اور کئی ایک رنگین تہمد صابن لگے ہوئے پڑے تھے ریب ہی کپڑے دھونے کے صابن کی ٹکیہ رکھی تھی جو آدھی گھس ی تھی، اور زہرہ پھوپی کی بڑی لڑکی نواب جہاں جھاڑو دے رہی تھی، اسکول میں استانی ہونے سے پہلے صرف نوابن تھی اور اب اب جہاں ہو گئی تھی اور پھٹی ہوئی شلواروں کی جگہ عمدہ قسم کی اریاں پہننے لگی تھی خوب بھڑکدار جمپر پہنتی تھی کپڑے اسی کے بھیگے ہوئے تھے اس نے ایک بڑا دیگچہ اندر سے لا کر ٹنکی سے کر رکھ دیا اور نورے سے حاکمانہ انداز میں بولی "ٹنکی رجائے تو اس میں بھی دو چار بالٹی ڈال دینا میں کپڑے دھو ہی ہوں، نورے نے غور سے نوابن کو دیکھا اور اس کی پیشانی بولتی ہوئی لٹ پر نگاہیں جما دیں وہ سوچنے لگا میں بڑا ہو کر اس ے بیاہ کروں گا مجھ سے بڑی ہے تو کیا ہوا میں ضرور اس سے ہ کروں گا۔ نوابن ڈانٹ کر بولی

"یہاں کھڑا کیا دیکھ رہا ہے، دس بجے پائپ بند ہو جائے گا مجھے کپڑے دھونا ہیں کل اسکول کھل رہا ہے۔"

اس وقت نورے کو ایسا لگا جیسے نوابن اس بیوی بننے سے انکار کر رہی ہے وہ اکڑتا ہوا زینہ کی طر بڑھ گیا جیسے اس کا باپ ماں کے ڈانٹنے پر سر جھکائے سو لینے چلا جاتا ہے۔ ہر بیوی اپنے شوہر کو اسی طرح حکم دیا کر ہے، یہ کوئی اور بات نہیں ہے۔

اس مرتبہ وہ نل پر پہنچا تو بھیڑ پہلے سے زیادہ مگر نہانے والا کوئی نہ تھا۔ ایک بڑھیا گھر کے سر جھو ٹرے کو لے آئی تھی اور حوض میں کھڑی ان کے برتن بھر ر تھی، جب تک دوسرے اور تیسرے کا بھرتی پہلا دوبار برتن خالی کر کے آجاتا، نورے کھڑے کھڑے تماشہ دیکھ رہا۔ جب یہ سلسلہ بند نہ ہوا تو اس نے آگے بڑھ کر ا بالٹی نل کے نیچے رکھنا چاہی بڑھیا کو غصہ آگیا جھڑک کر ب

"ہٹ پرے، حرامی!"

نورے کو بھی طیش آگیا اس نے بھی گالی دے ڈالی! بڑھیا نے اس کا کان پکڑ کر زور سے منہ پر طمانچہ رسید کیا نورے کا سر گھوم گیا گال پر پانچوں انگلیوں کے نشان ابھر آئے۔ وہ چپ چاپ ایک طرف کھڑا ہو گیا، نل بند ہونے کا وقت قریب آتا جا رہا تھا اور آدمی زیادہ ہوتے جا رہے تھے، خوب کشتم پچھاڑ اور گالم گلوچ ہو رہی تھی، عورتیں کو سنے جیسے بھ ہی گئی تھیں وہ بھی گالیوں پر اُتر آئی تھیں، ایک عورت کے سارے برتن بھر چکے تھے ایک تاملوٹ ہی رہ گیا تھا وہ اسی کو بھرنے کی کوشش کر رہی تھی، بار بار تاملوٹ بڑھا کر کہہ رہی تھی۔

"ارے دو چلو پانی مجھے لینے دو بچے پیاسے تڑپ رہے ہیں۔"

"دس گھڑے تو میرے سامنے بھر کے جا چکی ہو۔" ایک لڑکی نے جھلا کر کہا۔

"ارے تاملوٹ اور بھرنے دو!"

صرف اسی کی نہیں سب کی یہی کوشش تھی کہ زیادہ
سے زیادہ پانی کا اسٹاک کرے شام کو نہ جانے بھرنے کا موقعہ
ملے نہ ملے، یوں بھی چیونٹیوں کی طرح اسٹاک کرنا ان عورتوں
کی عادت ہے، بڑی دیر بعد نورے کو بالٹی بھرنے کا موقعہ ملا،
دوسرے اُمیدوار اُسے گالیاں بکتے رہے وہ سر جھکائے سنتا رہا،
اور نل کی دھار کا ساز بجتا رہا، جیسے گالیاں نہ بکی جا رہی ہوں بھیرویں
گائی جا رہی ہو۔ نورے نے بالٹی اُٹھائی اور اسی طرح سیڑھیوں
پر ٹھہرتا سانس ٹھیک کرتا آخری سیڑھی پر جا کھڑا ہوا، اور اس
طرح نیچے دیکھا۔ جیسے ٹین سن ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر
پہنچ کر حقارت سے ان چٹانوں کو دیکھ رہا ہو جنہیں وہ دور پہاڑ
کی جڑ میں چھوڑ آیا تھا اور جس وقت وہ اسٹول پر چڑھا
تو پتہ چلا کہ پہلی بالٹی نوابن پوری خرچ کر چکی ہے، اس نے
دل میں سوچا، ایسی فضول خرچ بیوی ایک دم مجھے پسند نہیں
اتنی سی دیر میں اتنا پانی بہا دیا، اسی طرح میری کمائی لٹائے گی
میں کبھی اس سے شادی نہیں کروں گا، نوابن ٹین کا لوٹا لئے
باتھ روم سے نکلی اور ٹنکی کی ٹونٹی کھول کر ہاتھ دھوتے ہوئے بولی
"اتنی دیر کہاں لگائی"۔

نورے کو اس کی یہ بات بہت اچھی لگی، اسی طرح اسکی
اماں ابا سے پوچھا کرتی تھی، وہ رات گئے گھر آتا تو بالکل یہی
سوال کرتی، نورے نے فوراً اپنی پہلی رائے بدل دی، ایسا لگا
جیسے نوابن زبردستی اس کی بیوی بن گئی ہو۔

"نل پر اور کہاں!" — نورے تنک کر بولا۔ وہ
اس طرح بیوی کی ڈانٹیں ہرگز نہیں کھائے گا۔

"ارے تو بولتا کیسے ہے؟" نوابن جل کر بولی۔

"اور تم کیسے بولتی ہو؟"

"اماں یہ لڑکا نہیں چلے گا"۔ نوابن نے ماں کو مخاطب
کیا اسی وقت نور جہاں اندر سے نکل آئی اس نے ہونٹوں پر
انگلی رکھ کر نوابن کو بولنے سے روکا۔ نورے نے اسے انگلی رکھتے
دیکھا اسے نور جہاں کی یہ ادا بہت بھائی۔ اور نوابن کو طلاق
دے کر اس نے نور جہاں کو بیوی بنانے کا پختہ ارادہ کر لیا وہ عمر
میں بھی نوابن سے چھوٹی تھی ہنس مکھ بھی تھی، نورے سے
بڑی نرمی سے بولتی تھی۔

"سب چل جائے گا"، زہرہ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے
کہا "سب اسی طرح باتیں کیا کرتے ہیں، پھر ٹھیک ہو جاتے
ہیں، پہلا دن ہے، دھیرے دھیرے رسی کے سارے بل نکل
جائیں گے"۔

"کون نکالے گا میرے بل!"۔

"ہم!" زہرہ بولی اور جلدی سے چپل میں پاؤں ڈال کر
اُٹھی۔ آتے ہی نورے کی کمر پر ایک دھپ رسید کیا۔
نورے کا جی چاہا کہ وہ بھی جواب دے لیکن نہ جانے کیوں وہ
ایسا نہ کر سکا، شاید اس لئے کہ زہرہ نور جہاں کی ماں تھی اگر
وہ صرف نوابن کی ماں ہوتی تو وہ ضرور مار بیٹھتا۔

پہلے ہی دن نوابن نے دھیرے سے زہرہ کے کان
میں کہا۔

"آٹھ روٹیاں کھائیں اس بھک مرے نے"۔

"اتنی روٹیاں دینے کی کیا ضرورت تھی؟" زہرہ نے
اکاؤنٹنٹ جنرل کے اختیارات استعمال کرتے ہوئے جواب
طلب کیا، "شام سے تین چپاتی سے زیادہ مت دینا خبردار
سن لیا!"

شام کو تین چپاتیاں کھا کر نورے بھوکا ہی رہا۔ ایک طرف
تھکن سے بدن ٹوٹتا رہا دوسری طرف پیٹ میں چوہے دوڑتے
رہے، بڑی مشکل سے صبح ہوئی، دوپہر کو پانی بھر چکنے کے بعد
نورے کو وہی تین چپاتیاں ملیں، گنتی میں پوری تھیں وزن میں
رات سے کم تھیں، وہ دن بھر بھوکا رہا رات کو پھر وہی تین
چپاتیاں سامنے آئیں، نورے جل گیا، اس نے روٹیوں کی ڈبیا
کی طرف دیکھا جو قریب ہی رکھی تھی اس میں بہت سی روٹیاں
کپڑے میں لپٹی رکھی تھیں نوابن نماز پڑھ رہی تھی، زہرہ لیٹی تھی
اور نور جہاں اسٹول پر بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی، نورے نے چپکے سے

کپڑا ہٹا کر ڈلیہ میں سے دو روٹیاں نکال لیں، اور جب تک نوابن سلام پھیرے وہ انہیں چٹ کر گیا، دوبارہ اس نے پھر تین روٹیاں کھینچ لیں، نورجہاں نے اس مرتبہ روٹیاں نکالتے دیکھ لیا، وہ مسکرائی اور منہ پھیر لیا، نورے کی یہ پہلی چوری تھی، اس کے ضمیر نے ذرا ملامت نہیں کی بلکہ پیٹ بھر جانے پر اسے ایک طرح کی چستی کا احساس ہوا شاید ضمیر میں پیٹ بھر جانے سے طاقت آگئی تھی۔ نوابن نے چوکی پر بیٹھے بیٹھے بڑی لمبی دعا مانگی۔ غالباً وہ دو ہی چیزیں خدا سے مانگ رہی تھی ایک شوہر دوسرے رزق۔ وہ خدا کو سب کا پالن ہار سمجھتی تھی، وہی روٹی دینے والا تھا۔ لیکن خود نوابن کا پیشہ دوسروں کا پیٹ کاٹنا تھا، وہ رزق مانگ کر نورے کو بھوکا رکھنا چاہتی تھی۔

پانچویں دن بارہ بجے دوپہر کو زہرہ نے اسے ایک روپیہ اور تھیلا دیتے ہوئے کہا

"نورے سبزی لے آ ــــ سیر بھر آلو، آدھ سیر گھیاں اور ایک ڈبیہ ماچس کی، سمجھ گیا بھول جائے گا تو نہیں؟"۔

"نہیں"

"کیا لائے گا؟"

"دو سیر آلو، سوا سیر گھیاں، آدھ سیر بیگن اور ایک موم بتی" نورے نے شرارت سے کہا۔

"تیرا پھوٹے نصیبہ، یہیں کھڑے کھڑے بھول گیا ــــ ارے سیر بھر آلو، آدھ سیر گھیاں اور ایک ڈبیہ ماچس کی، ــــ موم بتی نہیں"۔

"خوب سمجھ گیا، تم بولو نہیں میں سب ٹھیک لے آؤں گا"

"شاباش! کھیل میں مت لگ جانا"

وہ چلا گیا اور سودا خریدتے وقت اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک لڑکے کو مونگ پھلی کھاتے دیکھا، سوندھی سوندھی خوشبو ناک میں آئی منہ میں پانی بھر آیا، وہ بھوکا تھا اسے دو روٹیاں ہی ملی تھیں، ڈلیہ الگ رکھ دی گئی تھی نورے کے دماغ میں ایک خیال آیا اور بجلی کے کرنٹ کی طرح پورے جسم کو جھٹکا دے کر گذر گیا اس نے آلو ترازو میں رکھنے کے بعد کنجڑن سے کہا

"سیر بھر نہیں، تین پاؤ، اور گھیاں بھی اتنی ہی تولنا!"

اس طرح کچھ پیسے بچا کر اس نے مونگ پھلیاں خریدیں اور ان سے پیٹ کا خلاء پُر کیا، ضمیر کچھ کلبلایا، نورے نے رشوت سے اس کا منہ بند کر دیا۔ پیٹ کی اینٹھن بند ہوتے ہی ضمیر کو آرام مل گیا جیسے پانی ڈالنے سے آگ بجھ جاتی ہے وہ گھر پہنچا تو بہت مطمئن تھا سودا سب ٹھیک تھا، آلو، گھیاں اور ماچس کی ڈبیہ، زہرہ نے پہلے آلو گنے پھر گھیاں شمار کیں، اور ناک بھوں چڑھا کر بولی۔

"دونوں چیزیں کم ہیں، کتنے پیسے بچائے؟"

نورے نے بائیں ہاتھ کی مٹھی کھول دی، پیسے فرش پر گر پڑے وہ تنک کر بولا۔

"گن لو کتنے بچائے"

زہرہ شرما گئی، نوابن اس دن گھر پر ہی تھی زہرہ نے اسی سے پوچھا۔

"سیر میں کتنے آلو چڑھتے ہیں نوابن؟"

"میں گنا نہیں کرتی"

"میں ہمیشہ گنتی ہوں، نورے ضرور آج کم لایا ہے"

"کنجڑے نے لڑکا سمجھ کر اسے کم دیدیئے ہوں گے"

"پھوپی تم مجھے لڑکا سمجھ کر چیز کو کم کر رہی ہو لاؤ میں پھر لے آؤں"

"نہیں اب کہاں جائے گا"

نورے آہستہ آہستہ ہوشیار ہوتا گیا اور اپنا پیٹ آپ بھرتا رہا، کچھ دن تک کام یوں ہی چلتا رہا زہرہ کے دل میں شبہ بیٹھ چکا تھا اس نے ترازو منگالی اور ہر چیز تولنے لگی، نورے ترازو آتے ہی چونک گیا اب اس نے نرخ بڑھانے کا گر سیکھ لیا تھا اور ہر چیز کا بھاؤ دو آنہ فی سیر چڑھا دیا، اس کے علاوہ بھی اس نے کچھ اور ترکیبیں سیکھ لیں مثلاً گھر سے روپیہ یا اٹھنی لے کر جاتا اور کسی سے دو چار آنے ٹھہرا کر لے

پے سے بدل کر لوٹا لاتا۔

"پھوپی روپیہ کھوٹا ہے دو سرا دو!"

زہرہ لڑکیوں پر بگڑنے لگتی "آنکھیں پھوٹ گئی ہیں
ہ کر کیوں نہیں لیا کرتیں"

ایک روز زہرہ کو شک ہوا کہ نورے باہر سے کوئی چیز
اکر آیا ہے اس نے نورے سے کہا۔

"ادھر آمیں تیرا منہ سونگھونگی، سچ بتا مونگ پھلی کہاں
ملی"

"کیسی مونگ پھلی؟"

"تو نے کھائی نہیں ابھی، منہ سے سگند آرہی ہے"

"میں سنے دکاندار سے مانگ لی تھی"

اس دن سے نورے نے مونگ پھلی کھانی چھوڑ دی،
ہ کیلے کھانے لگا۔

رات کو نورے نے سوچا یوں کب تک کام چلے گا اب تو
ں دھندے کو آگے بڑھانا چاہیئے۔ اگلے روز اس نے
ابن کے پرس سے دس روپے کا نوٹ نکال لیا۔ شام کو
ابن نے نوٹ گنے اور دیر تک حساب میں الجھی رہی اور
رے اسے دیکھ کر خوش ہوتا رہا۔

اسی ہفتہ میں نورجہاں اور نوابن کی تنخواہ ملی وہ
ت سے روپے لے کر آئیں اور زہرہ کے حوالے کر دیے
ں نے بکس میں رکھ دیئے۔ نورے نے موقع پاکر سو روپے
ل لئے اور غائب ہو گیا۔ زہرہ اتنا بڑا زخم برداشت نہ
کی اس نے آسمان سر پر اٹھا لیا قادر کو بلا کر ڈانٹا پولیس
رپورٹ کرنے کی دھمکی دی۔ وہ بولا۔

"میرا لڑکا چور نہیں تھا، یہ کام اسے تم نے سکھایا
نے پیسے سے تنگ رکھا اسی کا یہ انجام ہوا تمہارے
پے گئے میرا لڑکا گیا، جو چاہو کرو میں کچھ نہیں جانتا"

نورے کئی سال تک گھر نہ آیا اور نہ کسی کو اس کا پتہ
چلا۔ ایک دن قادر کو بمبئی سے آیا ہوا ایک سو دس روپے کا
منی آرڈر ملا یہ نورے نے بھیجا تھا، کوپن پر لکھا تھا کہ "یہ پیسے
زہرہ پھوپی کو دے دیئے جائیں، میں نے چرائے ضرور تھے
لیکن نیت قرض کی تھی اب ان کا قرض ادا کر رہا ہوں" پھر
اس کے خط سے معلوم ہوا کہ وہ ایک مل میں نوکر ہے اور
خراب عادتوں سے توبہ کر چکا ہے، مزدور یونین کا سکریٹری
بھی ہو گیا ہے، اس نے باپ سے درخواست کی تھی کہ
میری بہنوں کی شادی کر دی جائے مصارف میں برداشت
کروں گا۔ اس کے بعد وہ کبھی منی آرڈر سے اور کبھی بیمہ
سے قادر کو روپیہ بھیجتا رہا۔ اور ایک روز نورے کے
ایک دوست کا خط ملا اس نے لکھا تھا کہ نورے نے
جلوس نکالا تھا، وہ جھنڈا لئے سب کے آگے تھا، جلوس
پر فائرنگ ہو گئی گولی نورے کے بھی لگی ہے اور وہ ہسپتال
میں پڑا ہے۔ اس اطلاع سے نورے کے یہاں کہرام
مچ گیا، ماں باپ بھائی بہن سب رونے لگے، اس رنج
میں ایک اور ہستی بھی شریک تھی، یعنی نورجہاں، وہ قادر کے
یہاں آئی اور زار و قطار روئی جیسے گولی نورے کے نہ لگی
ہو خود اس کے لگی ہو ——— نہ جانے اسے کیوں اتنی تکلیف
تھی؟ ——

شمیم گنوری

ماں

دو گھنٹے کی مسلسل جد و جہد کے بعد آخر کار کوٹھری کی گھٹی گھٹی فضا کو معصوم چیخوں نے توڑ کر رکھ دیا۔ ساتھ ہی فردوسی کی کراہ میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری۔ اور پھر خالہ نورن اور فردوسی کی ماں سکو کی کھسر پھسر کے ساتھ ہی گالیاں فضا میں اچھلنے لگیں۔

"حرامزادہ" سکو نے ایک ہاتھ نوزائدہ بچے پر دھر دیا۔ اور دوسرے سے فردوسی کی خبر لی۔ فردوسی کی آنکھیں کرب سے بند ہو چکی تھیں۔ اس نے زور سے ہونٹ بھینچ لئے، جیسے کسی بات کا جواب نہ دینا چاہتی ہو۔ جیسے دے ہی نہ سکتی ہو۔ صرف کانوں میں کبھی ماں کی گالیاں کبھی بچہ کی چیخیں اور کبھی خالہ نورن کا کوئی زہر میں بجھا جملہ سنائی پڑتا اور بس۔

جاڑوں کی رات تھی۔ چاروں طرف ہُو کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جس کوٹھری میں فردوسی نے بچے کو جنم دیا تھا اس کے چاروں طرف کچے پکے مکانوں کی دیواروں تلے کھڑے ہوئے کتے بھونک رہے تھے۔ ان کے سوکھے بدن اکڑے ہوئے تھے۔ بار بار دُم پٹک کر گویا سسکتی ہوئی رات کے عجیب سناٹے میں سوئے ہوئے سماج کو جگانے کی کوشش کر رہے ہوں کوئی کتا زیادہ جوش میں آکر اپنے جسم کی بچی کھچی طاقت یکجا کر کے زور سے بھونک اٹھتا ——— اور لگتا کہ ——— سماج کو جگا کر ہی دم لے گا ——— لیکن تھوڑی دیر تک اس کی کھدری آواز سے مرتعش رہتی ——— اور پھر ——— ٹھنڈے سکوت کے نیچے منہ چھپا کر خاموشی سے آنکھیں بند کر لیتی۔ کتا جھنجلا کر ایک طرف کو بھاگ جاتا ——— اور کچھ ——— مایوس سے کسی کونے میں منہ رکھ کر زور سے رو پڑتے جیسے ان میں احتجاج کرنے کی سکت باقی نہ رہ گئی ہو ——— فردوسی کا پورا بدن پھوڑے کی طرح دکھنے لگا تھا۔ بچہ کی معصوم چیخوں نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے اپنی آنکھیں کھول کر گورے گورے موٹے سے بچہ کو دیکھا۔ اور اس کی نظریں ٹِک سی گئیں۔ پر فوراً ہی ماں کے طمانچے نے اس کا منہ دوسری طرف پھیر دیا۔ فردوسی کے منہ سے بڑے زو

سے آہ نکلی اور وہ بلبلا اُٹھی۔

"بے حیا ــــ بے شرم ــــ حرامزادی" ــــ سکو کے ہاتھوں کے ساتھ ہی زبان بھی بے قابو ہو رہی تھی۔ ننھے سے وجود سے اس کے دل کا نفرت کا طوفان پھٹ پڑا۔

"حرامی ــــ ناس پیٹے" ــــ اس نے معصوم کو زور سے پٹک دیا۔ بچّہ رو اٹھا۔ اور فردوسی نے آنکھیں بند کر لیں "حرامزادی" سکو نے ایک دو تھپڑ فردوسی پر دھر دی۔ فردوسی دوسری طرف کپڑوں کے ڈھیر پر الٹ گئی۔

جب سے فردوسی کو درد شروع ہوا تھا اسی وقت سے اس پر گالیوں، کوسنوں اور ہاتھوں کی مار پڑ رہی تھی۔ کراہ کے ساتھ ہی ماں کا ہاتھ اس کے منہ پر ضرور پڑتا۔ اور ساتھ ہی حرامزادی، رنڈی، کے الفاظ فضا میں بکھر جاتے ــ فردوسی آنکھیں کھول کر کبھی کوٹھری کے چاروں طرف گھورتی اور کبھی اپنے پیٹ کی طرف دیکھنے لگتی۔ اس کے دل سے بھی نفرت کا طوفان اُٹھ رہا تھا۔ اسکا بس چلتا تو وقت سے پہلے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتی تاکہ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائے اور پھر کبھی اسکا وجود حرامی نہ کہلائے۔ لیکن وہ یہ بھی نہ کر سکی۔ وہ نڈھال ہوتی چلی گئی۔ صرف ماں اور خالہ کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتی ہوئی کوٹھری میں بکھر رہی تھیں اور ساتھ ہی معصوم چیخیں۔

نورن خالہ شاید یہ چاہتی تھی کہ اس کو مارا نہ جائے۔ بلکہ کپڑوں میں لپیٹ کر کلیا کے نیچے رکھ دیا جائے۔ ماں کپڑوں میں لپیٹنے کو بھی تیار نہ تھی۔ اس نے بچّہ کو زمین پر پٹک دیا معصوم بلبلا کر چیخ اُٹھا۔ فردوسی کو جیسے کسی مقناطیسی کشش نے اٹھا کر بٹھا دیا۔ اس کے بازو اوپر اُٹھتے چلے گئے۔ سینے میں جیسے کسی نے ہتھوڑا کھینچ مارا ہو۔ شاید وہ آگے جھکی تھی۔ پر ماں کی لات نے اُسے دوبارہ زمین پر گرا دیا ــ دنیا سے بے خبر ــــ اسکی آنکھیں بند ہو گئیں اور کان بہرے۔

جب اس کے حواس درست ہوئے تو رات کے دو بج چکے تھے۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر کوٹھری کے چاروں طرف دیکھا۔ ماں اور خالہ دونوں ہی غائب تھیں۔ اس کی نگاہیں خود بخود ہی اس جگہ پر رک گئیں جہاں پر اس نے ایک نئی ہستی کو جنم دیا تھا۔ اور جہاں اب اس کا وجود نہ تھا۔ صرف نشانات باقی تھے۔ وہ سمجھ گئی ــ خالہ اور اماں اس کو لے گئی ہیں۔ اسکا دماغ کوٹھری سے باہر نکل کر گلیوں سے گذرتا ہوا پرانی پلیا تک پہنچ گیا۔ کوٹھری کے اندھیرے سکوت میں اس کا خاموش وجود بے جان لاش کی طرح زمین پر رکھا ہوا تھا کسی کتے کے رونے کی آواز سے یکایک وہ چونک اٹھی۔ نہ معلوم کیسی تکلیف تھی ــــ کیسا درد تھا ــــ جو اس کے سینے میں ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ گرم گرم آنسو مچل مچل کر اس کے چہرے پر پھیل گئے۔ نہ معلوم کب تک وہ اسی طرح بے چینی سے روتی رہی۔ اس کی سمجھ میں خود بھی نہ آ رہا تھا کہ وہ کیوں رو رہی ہے' شاید چوٹیں دُکھ رہی تھیں ــــ یا شاید کسی کی منتظر تھی ــ متلاشی تھی ــ کس کی ــــ اس کے دل میں صرف ایک ہی خواہش اُبھری۔ اسکا دل بُری طرح تڑپ گیا۔

"کاش میں نے ایک مرتبہ اس کو گود میں لے لیا ہوتا" اس کے بازو ننھے کو بے تاب ہو گئے۔ لیکن فوراً ہی کانپ کر رہ گئے ــ جیسے کسی رستے زخم میں زور سے ٹیس اٹھی ہو ــــ اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ پکڑ لیا ہونٹ خود بخود ہی بھنچ گئے۔ آنکھیں خلاء میں کچھ تلاش کرنے لگیں۔ اندھیرے میں ننھے نقوش اُبھرتے۔ اور گڈمڈ ہو کر ڈوب جاتے۔ اور پھر اُبھر آتے۔

سنسان گلیوں کو اندھیرے نے پوری طرح اپنے سکوت میں لپیٹ رکھا تھا۔ ٹوٹے مکان کے کونے میں ابھری ہوئی کوٹھری کسی سنسان قبرستان میں کھڑے ہوئے پرانے مقبرے کے کھنڈر کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ مظلوم کتے سردی سے بچنے کے لئے ٹوٹے مکان کے ملبے تلے دبکنے کی ناکام کوشش کرتے۔ دو چار کامیاب ہو جاتے اور باقی

زور زور سے بھونکنے لگتے۔ کوٹھری کی دیوار کے نیچے ٹوٹے چھپر کی گلی سڑی پھونس میں آٹھ دن پہلے ہی ایک کتیا نے بچے دیئے تھے۔ دو کتے بچاؤ تلاش کرتے ہوئے پھونس کے ڈھیر پر پڑ گئے معصوم بچے کوں کوں چیں چیں کر کے چیخ اٹھے ــــ اور ماں بچوں کی حفاظت کے لئے دونوں کتوں پر بڑی زور سے بھونکی۔ فردوسی کتیا کی آواز سے چونک کر کھڑی ہو گئی۔ کوں کوں اور چیاؤں چیاؤں کی آواز نے اس کے پیروں کو متحرک کر دیا۔ اس کے ہاتھوں نے خود بخود ہی اپنے گرد چادر لپیٹ لی۔ اور وہ خود کوٹھری کے دروازے تک پہنچ گئی۔ پیچھے مڑ کر ایک نظر دیکھا، اور دوسرے ہی لمحے وہ کوٹھری سے باہر تھی۔

پوری گلی ٹھنڈے سکوت کے نیچے دبی ہوئی سسک رہی تھی، کتے جا چکے تھے۔ صرف بچوں والی کتیا اپنے بچوں کو چمٹائے ہوئے بچاٶ میں دھنسی ہوئی تھی اور بچے کوں کوں کر کے اس کے سینے سے لگے ہوئے تھے۔ فردوسی کے سینے سے جیسے لاوا ابل پڑا ہو۔ اس کے قدم بے اختیار پرانی پلیا کی طرف اٹھ گئے۔ اور دماغ ــــــ

نو مہینے کے پہلے کے دنوں میں کھینچ کر لے گیا۔ اب وہ کسی کے سامنے سکڑی ہوئی کھڑی تھی "ـــ ریاض تم کب آؤ گے ــــ میں تمہارا انتظار کرونگی"

"دیکھو کام نہ ہوتا تو میں جاتا ہی کیوں، جلد ہی آجاؤنگا اور پھر تجھ کو بھی لے جاؤں گا"

ریاض کے ہاتھوں کے لمس کے باوجود اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے اور ریاض چلا گیا۔ وہ انتظار کرتی رہی ــ کرتی رہی۔ یہاں تک کہ تین مہینے گزر گئے اور وہ خوف سے کانپ کر رہ گئی۔

سویرے ہی جب وہ برتن مانجھ رہی تھی تو اسے بڑی زور سے ابکائی آئی۔ ماں روٹی چھوڑ کر بھاگی۔

"کیا ہوا فردوسی؟"

"کچھ نا ماں جی متلا گیا۔ پیٹ میں درد تھا"

اور پھر پیٹ کا درد بڑھتا ہی گیا۔ کبھی بند نہ ہو سکا۔ نہ کالے نمک سے اور نہ کسی دوا سے۔ فردوسی کا بڑھتا ہوا پیٹ اور بدلتی ہوئی حالت ماں کی آنکھوں سے نہ چھپ سکی۔ نورن خالہ کی طنزیہ نگاہیں اس سے برداشت نہ ہو سکیں۔ جو کبھی ہاتھ لگا وہ ہی لے کر فردوسی کو دھننے لگی۔

"حرامزادی۔ بتا کون تھا حرامی۔ ناس پیٹا۔ کون تھا تیرا خصم رنڈی"

لیکن فردوسی کچھ بھی نہ بتا سکی بس کوٹھری میں پڑی ہوئی سسکتی رہتی۔ ماں کی لاتیں باپ کے ڈنڈے اور نورن خالہ کے زہریلے جملوں نے اسے بے جان کر دیا۔ ماں جب تھک گئی تو اس نے اپنے آپ کو پیٹ لیا۔ بال نوچ لئے۔ وہ پاگل ہو اٹھی۔ کبھی نورن خالہ کے ہاتھ جوڑتی اور کبھی فردوسی پر دو تھپڑ لے کر دوڑتی۔ ایک ہنگامہ مچ گیا۔ ایک طوفان آگیا۔ باپ کی ٹوپی کھسک کر پیروں پر گر پڑی۔ آس پاس کے گھروں میں کھچڑی پکنے لگی۔ ماں کے ہاتھ ڈھیلے پڑ گئے، اور جوتا چھوٹ گیا۔ ماں اور باپ دونوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ فردوسی کی بات پکی ہو چکی تھی۔ اب کیا ہو گا؟ ماں اور باپ دونوں ہی سے برداشت نہ ہو رہا تھا۔ اور بس فردوسی کا جسم نیلا پڑ گیا۔

نورن خالہ کی مدد سے قصبہ کی جمیلی دائی سے چپکے چپکے بہت سی ترکیبیں کرائی گئیں لیکن سب بے کار۔ فردوسی کی جان پر بن گئی۔ خاموشی سے سب کچھ سہتی رہی۔ لیکن بچہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اور آخر کار دائی بھی تھک ہار کر بیٹھ رہی۔ روپے سے اس کا منہ بند کر دیا گیا۔ اور پھر فردوسی کا باپ نوکری کے بہانے قصبہ کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا۔

پچھلے چھ مہینے قصبہ سے آکر کس طرح کٹے یہ فردوسی کا دل ہی جانتا تھا۔ چوٹیں سہہ سہہ کر اسکا خوبصورت بلی کے بالوں جیسا نرم و گداز بدن سوکھ کر لکڑی ہو گیا۔ جگہ جگہ نشانات نے اور بھی مکروہ روپ بخش دیا۔ اور اس پر بھوک کی مار

وہ بُرے درد سے اپنے دُکھتے جسم پر ہاتھ پھیرتی اور رو پڑتی۔ اسے کبھی اپنے بڑھتے ہوئے پیٹ سے نفرت ہوگئی تھی۔ اس کا دل کتنی ہی مرتبہ چاہا کہ کوئیں میں چھلانگ لگا دے، لیکن وہ ہمت نہ کر سکی۔ کبھی کبھی خاموشی سے جب وہ دروازے کو تکتی تو ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی کی منتظر ہو۔ شاید کسی اجنبی کی۔ نہیں ریاض کی ۔۔۔ کون ہے وہ ۔۔۔ جس کو وہ جانتی ہی نہیں ۔۔۔ کہاں ہے ۔۔۔ معلوم نہیں ۔۔۔ آئے گا ۔۔۔ شاید ۔۔۔ اسکا ہاتھ اپنے جسم کے مختلف حصّوں پر پھسلنے لگتا۔ اور گرم گرم آنسو کسی برساتی نالے کی طرح بہنے لگتے ۔۔۔ اور ۔۔۔ پھر وہ اُٹھ کر اندر کوٹھری میں چلی جاتی جہاں اس کی سسکیاں چپکے چپکے اُبھر کر دم توڑ دیتیں۔

تیز چلتی ہوئی ہواؤں کے درمیان وہ تیزی سے چلی جا رہی تھی کہ ٹھوکر نے اسے اپنے وجود کا احساس دلا دیا ۔۔۔ سامنے ہی دو سائے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے چلے آرہے تھے۔ وہ گھبرا گئی۔ اماں اور خالہ بچّے کو پھینک کر واپس ہو رہی تھیں۔ وہ پیڑ کی آڑ میں چھپ گئی۔ اس کا سارا بدن لرز رہا تھا۔ سانس پھول چکی تھی۔ جیسے سارا خون اس کے سینے میں اکٹّھا ہوگیا تھا۔ ماں اور خالہ قریب سے ہی بڑبڑاتی ہوئی گذریں۔

"دوپہر تک تو شاید کسی جانور کی بھی نظر نہ پڑے" ۔۔۔ نورن خالہ کا سانس بھی پھولا ہوا تھا۔

"کتنا موٹا تھا حرامی"۔ اماں کے دانت بج رہے تھے۔

"سویرے کی گاڑی سے ہی چلے چلیں گے"۔ نورن خالہ اپنے کو بھی مجرم سمجھ رہی تھیں۔

"ناس پیٹا"۔ ماں نے دونوں ہاتھ جھٹک دیئے۔ جیسے بچّہ اب بھی اس کے ہاتھ میں ہو "حرامزادی کو سنبھالنا ہے ابھی تو"۔ ماں کی ممتا کی کوئی نازک سی کرن چمک اُٹھی اور پھر فوراً ہی نفرت انگیز حالات نے اس کو بھیانک اندھیرا بخش دیا۔

"مر جائے کمبخت ۔۔۔ اللہ اُسے بھی اٹھالے"۔ سب کچھ بھول کر اس نے اللہ کا سہارا مانگا۔ "اگر محلے والوں کو معلوم ہوگیا تب" ۔۔۔ اس کی آنکھوں کے سامنے بھیانک نقشہ گھوم گیا۔ دانت اور تیزی سے بجنے لگے ۔۔۔ قدم آگے بڑھتے چلے گئے۔

فردوسی چپکے سے پیڑ کے پیچھے سے نکلی اور تیزی سے دوڑنے لگی۔

"جانور کی نظر"۔ اس کے قدم اور تیز ہوگئے ۔۔۔ پرانی پلیا ابھی کافی دور تھی۔ کمزوری کی وجہ سے باوجود دوڑنے کے وہ گھسٹتی ہوئی چل رہی تھی۔ اکثر اس کے منہ سے آہ نکلتی پر قدم رُکتے نہ دماغ۔

وہ اس دن کو کبھی نہ بھول سکی تھی جب اس نے ریاض کو دیکھا تھا۔ شام ہوچکی تھی اس نے تمام گھر کو عید کی خوشی میں لیپ پوت کر دلہن بنا دیا تھا۔ ماں سارا دن کام کرتی ہوئی فردوسی کو دیکھ کر دھیمے دھیمے مسکراتی رہی تھی۔ جب وہ مٹکے میں پانی لیکر نہانے چلی تو ماں پیار سے چیخ پڑی۔

"ٹھنڈ اتر کر جائے گی نگوڑی ماری۔ اس وقت نہ نہا"۔ لیکن وہ نہ مانی اور جلدی جلدی نہا کر اپنے لمبے بالوں کو جھٹکتی ہوئی دھوپ کی تلاش میں کوٹھے پر چڑھ گئی ۔۔۔ سورج اپنی آخری منزل طے کر رہا تھا۔ سنہری سنہری دھوپ کی کرنوں سے فردوسی کے جسم کا سنہری پن اور بھی چمک اُٹھا۔ وہ تھکی ہوئی سی لمبی لمبی سانس لینے لگی۔

کل عید تھی ۔۔۔ سب کی طرح وہ بھی خوشی کے مارے کھِل جا رہی تھی۔ اور دھیان صبح کو پہننے والے کپڑوں میں اٹکا ہوا تھا۔ کہ یکایک اس کی نظر ساتھ والی منشی جی کے پکّے مکان کی چھت پر پڑی جو بالکل ان کی منڈیر سے ملی ہوئی تھی۔ وہ جھجک کر ایک دم سُرخ ہوگئی، ریاض کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اس کے انگ انگ میں بجلی کوند گئی۔ جیسے سورج کی کرنیں اُسکے بدن میں گھستی چلی گئی ہوں۔

ریاض منشی جی کا کرایہ دار تھا۔ اس کا کمرہ فردوسی کی چھت کی منڈیر کے اوپر تھا۔ کتنی ہی مرتبہ فردوسی نے اس کو کھڑے

ہوئے پایا تھا۔ نہ معلوم کیوں ریاض کی شخصیت سے اس کی معصوم ہستی مرعوب ہو جاتی۔ دو چار بار ریاض اس کو اشارہ بھی کر چکا تھا۔ اور جب بھی موقع ملتا کچھ نہ کچھ کہے بغیر نہ رہتا۔ فردوسی ہمیشہ ہی عجیب سی ہو کر ٹھٹھک جاتی۔ کچھ جواب نہ دے پاتی۔ ہونٹ نہ معلوم کیوں تھرکنے لگتے۔ اس وقت بھی اس نے چاہا کسی طرح جلدی سے نیچے اتر جائے لیکن اس کے پاؤں جم سے گئے۔ اور دوسرے ہی لمحے ریاض منڈیر کود کر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ فردوسی نے جلدی سے نیچے دیکھا جس پلنگ کو کھڑا کر کے وہ کوٹھے پر چڑھی تھی وہ کسی نے بچھا دیا تھا۔ گیلا آنگن سونا پڑا تھا۔ ماں چولھے پر بیٹھی ہوئی کام میں مصروف تھی۔ ریاض کا ہاتھ بے اختیار اس کے بالوں پر چلا گیا —— لمبے لمبے ریشمی بھیگے ہوئے بال۔ فردوسی کو جھرجھری آگئی۔ اور ریاض کی بانہوں میں جھول کر رہ گئی۔

انوکھا لمس تھا —— نرالی مسکان تھی۔ انجانی لذت تھی۔ وہ تھرتھرا کر جھوم اٹھی۔

ریاض جلد ہی واپس چلا گیا۔ لیکن فردوسی سے وعدہ لے کر، کہ عید کے کپڑے پہن کر وہ اس سے ضرور ملے گی —— معصومیت ہزاروں من بوجھ تلے دب گئی۔

اور پھر صبح کو عید کی خوشی کے ساتھ ہی ایک انجانے جذبے نے فردوسی کے انگ انگ میں رنگ بھر دیئے اس کے چہرے کی تابانی اور بھی زیادہ بڑھ گئی۔ وہ سارا دن ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی اور مورنی کی طرح ناچتی رہی —— بے خودسی —— چلتی تو اسے ایسا معلوم ہوتا جیسے ہوا پر چل رہی ہو مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر بکھری پڑ رہی تھی —— ریاض نے صبح ہی اس کو دیکھ لیا تھا۔ چونکہ چھت پر سے جب اس نے فوراً خالہ کو سیوئیوں کی پلیٹ دی اور واپس مڑی تو ریاض کھڑا تھا۔ وہ بھی مسکرا دی۔ ریاض نے گردن کے اشارے سے اس کو سمجھایا کہ جب تک وہ رات کو نہ آئے گی وہ نہ دیکھے گا۔ وہ ہنستی ہوئی نیچے اتر آئی۔

اور رات کو جب سب لوگ تھک کر سو گئے۔ تو فردوسی مجبور ہو اٹھی۔ ریاض نے سارا دن ہی اشاروں سے وعدے لئے تھے۔ اس کے قدم کسی مقناطیسی کشش سے چھت کی طرف اٹھ گئے۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ ریاض کی بانہوں میں تھی۔ کیا سرور تھا وہ بے خود ہو کر گر سی پڑی —— اور پھر —— ریاض کے ہزاروں تعریفی الفاظ اور سینکڑوں وعدوں نے اس کے اپنے وجود کو بھلا دیا —— اس کے لئے ہر چیز نئی تھی —— ہر لذت سے نا آشنا تھی۔

جب وہ واپس کوٹھے سے اتر رہی تھی تو اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ اور پورا بدن ہلکے ہلکے کانپ رہا تھا اس نے بڑی مشکل سے سانس پر قابو پایا اور دھیرے سے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

دو مہینے بعد ریاض کا تبادلہ ہو گیا۔ وہ جانے پر مجبور ہو گیا —— فردوسی بلک کر رو دی۔ ریاض اس کے لئے کیا تھا وہ خود بھی نہ جانتی تھی۔ البتہ بس یہ ہی چاہتی تھی کہ ریاض اس کو چھوڑ کر کہیں نہ جائے۔ لیکن ریاض مجبور تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ جلد ہی آجائے گا لیکن —— پھر کبھی وہ لوٹ کر نہ آیا۔

تین مہینے تک تو وہ صبح شام چھت کو تکتی رہی اور آخر کار جب اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جسکی اس کو کچھ خبر بھی نہ تھی تو وہ اپنے گھر کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئی۔ قصبہ چھوٹا —— گھر چھوٹا —— وہ چھت بھی چھوٹ گئی جس پر اس کی زندگی کی مسرت کے نشان تھے سب کچھ چھوٹ گیا۔ صرف شہر کے کسی محلہ کی کوئیں والی کوٹھری رہ گئی۔ اور اماں کی گالیاں تھپڑ، گھونسے اور جوتے، حرامی اور حرامزادی کے الفاظ۔

صبح صادق کے آثار نظر آنے لگے تھے، دور آسمان میں چاندی سی سویرے کی روشنی پھوٹ پڑنے کو تیار

تی ۔ فردوسی کے قدم اور تیز ہو گئے اس کے کانوں میں دور سے تی ہوئی معصوم چیخیں گونجنے لگیں ۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر چاروں رف دیکھا ۔ نہ جانے کیا چاہتی تھی ۔ زور کی ٹھوکر سے بے اختیار پڑی اس کا پورا بدن زور زور سے کانپنے لگا ۔ بڑی مشکل سے اُٹھ کر بیٹھ گئی ۔ سامنے ہی پرانی پلیا جیسے اس کی منتظر تھی ۔ ں کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ۔ اس کے قدم اور تیز گئے ۔ سارا بدن پسینے میں بھیگ چکا تھا ۔ چھاتی جیسے پھٹنے کو رہی تھی ۔ ٹھنڈی ہوا سنسناتی ہوئی کلیجہ کو چیرتی ہوئی گذر رہی تھی ٹھنڈا ریت اس کے پاؤں روک رہا تھا ۔ لیکن سینہ میں ابلتا ہوا وا اس کے پورے جسم کو آگے بڑھنے پر مجبور کر رہا تھا ۔ اسکے ماغ نے اب تک پورے راستے اپنی زندگی کے کتنے ہی ہم دن دہرا دیئے تھے ۔ قدم کبھی دھیمے پڑتے کبھی تیز ۔ اور بھی ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی اسے آواز دے رہا ہے ۔

کون ہے ـــ ریاض ہے ـــ تم ہو ریاض ـــ نہیں تمہاری آواز نہیں ہے ۔ یہ تو کسی دوسرے کی آواز ہے ۔ کسی معصوم کی ـــ کسی مظلوم کی ـــ کون ہے ـــ کہاں ہے ـــ ہے ـــ وہاں ـــ پلیا کے نیچے ـــ میرا لال ـــ میرا بچہ ـــ میرا کلیجہ ـــ میرا لال ـــ میرا ـــ وہ پلیا کے پاس ہو کر بے اختیار نیچے کھڈ میں کود گئی ۔ اور دوسرے ہی لمحے اس سفید کپڑوں کے ڈھیر پر تھی جس میں سے معصوم چیخیں ابھر کر فضا کو رُلا رہی تھیں ۔

وہ انھیں کو تو سن رہی تھی ۔ یہ ہی تھیں مظلوم چیخیں معصوم آواز ـــ اس نے بے اختیار گود پھیلا کر اس کو اٹھا لیا ۔ کے سینے کے اُٹھتے ہوئے طوفان کو جیسے کنارہ مل گیا ہو ۔ گود میں چھپا کر وہ ایک کونے میں سکڑ کر بیٹھ گئی ۔ جیسے دنیا تمام مصائب سے وہ اپنے بچہ کو چھپانا چاہتی ہو ـــ جیسے کو کبھی نہ دکھائے گی ۔

کہیں نظر نہ لگ جائے میرے لال کو ۔ اس نے جھک کر پیار کر لیا ۔ آنکھوں سے پانی بہہ کر گویا اس کے کلیجہ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا ۔ لیکن وہ مطمئن تھی ـــ جیسے اُسنے کائنات کو پالیا ہو ـــ جیسے ریاض مل گیا ہو ـــ جیسے ریاض نے اپنا وعدہ پورا کر دیا ہو ـــ جیسے اسے دکھی دنیا سے نکال کر اپنی بہاروں بھری دنیا میں لے گیا ہو ـــ جیسے اس نے ساری کائنات پر فتح پالی ہو ـــ اب اسے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی ۔ کوئی خواہش نہ تھی ۔ کوئی تمنا باقی نہ تھی ۔ سب کچھ تو اسکی گود میں تھا ۔ ساری دنیا کی طاقت کائنات کا پیار ۔ وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرا دی ۔ نگاہ اٹھا کر دور سے آنے والے راستے کی طرف دیکھا اور کسی انجانے خوف سے لرز کر جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ چادر کو بڑی احتیاط سے بچے پر لپیٹ کر زور سے اپنے سینے سے بھینچ لیا اور تیزی سے پیچھے مڑ کر بھاگنے لگی ـــ کہیں اماں آگئیں تو میرے لال کو مار ڈالیں گی ـــ چھین لیں گی ـــ آہ ـــ وہ بھاگتی ہی چلی گئی ـــ یہاں تک کہ پرانی پلیا بہت پیچھے رہ گئی ـــ بہت پیچھے ـــ

اس نے نئی راہوں پر قدم رکھ دیئے تھے ـــ نئی پگڈنڈی کو پالیا تھا ۔ انجانے راستے نے اسے بڑے پیار سے پکارا ۔ اور وہ بھاگتی ہی چلی گئی ۔ کائنات کو گود میں سمیٹے اس کا سانس پھول چکا تھا ۔ ایک جگہ وہ سانس لینے کیلئے رُکی یہ شاید کسی کھیت کی منڈیر تھی ۔ شاید کوئی گاؤں قریب تھا ۔ وہ ۔ بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی نئے راستوں کی رہبری کر رہی تھی ۔ وہ وہیں بیٹھ گئی ۔

"میں سب کچھ سہہ لوں گی ـــ جیون بتا دوں گی اپنے لال کے لئے " اس کا چہرہ نئے عزم سے چمک اٹھا ۔ صبح کی روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی کائنات کی ہر چیز دھلی ہوئی نظر آ رہی تھی ۔ منڈیر کے پاس ہی ننھے سے معصوم پودے پر ایک پھول مسکرا رہا تھا ۔ اس نے جھک کر اپنے بچہ کو پیار کر لیا ۔ بچہ اپنی معصوم چیخوں سے ماں کو اس کا سب سے بڑا فرض یاد دلانے لگا ۔ وہ دھیرے سے مسکرا دی پیڑ پر بیٹھی ہوئی چھوٹی چھوٹی چڑیاں سویرے کا راگ الاپ رہی تھیں ۔ پیڑ کی ڈال پر بنے ہوئے گھونسلے میں بیٹھے

بقیہ ۔ صفحہ ۵۶ پر

رفعت نسیم اختر

پشیمانی

جاڑوں کی سرد رات تھی۔ ہر طرف تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ باہر موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی رہ رہ کر چمک اٹھتی تھی۔ غرض ماحول بڑا پُراسرار ہو رہا تھا۔

رخشی اپنے کمرے میں پلنگ پر تکیہ کے سہارے نیم دراز تھی۔ اس کے سڈول بدن پر لحاف پڑا ہوا تھا۔ وہ بظاہر کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ مگر ذہن کہیں اور تھا۔ خمار آلود آنکھوں میں بے چینی اور پریشانی کے آثار تھے۔ سامنے دیوار کے کلاک نے گیارہ کے گھنٹے بجائے۔ وہ بے چین ہو کر بستر پر سے اُٹھ کھڑی ہوئی، اس نے آہستہ سے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ اور باہر تاریکی میں نظریں دوڑانے لگی۔ بارش تھم چکی تھی مگر سرد ہوا کی سائیں سائیں ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ کھڑکی کے پٹ کھلتے ہی ایک سرد ہوا کی لہر آئی اور اس کے سارے رگ و ریشے سرایت کر گئی۔ اس نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی۔ اور میز کے پاس رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سامنے میز پر اس کے شوہر کی تصویر رکھی تھی۔ اسلم جو خرم کی ذرا سی تکلیف پر بے چین ہو جاتا تھا۔ جو اس کا ذکر کرتے نہ تھکتا تھا جس نے شادی کی پہلی رات کا زیادہ حصہ خرم کی باتیں کرنے میں گذار دیا تھا۔ اب وہی اسلم خرم کو چھوڑ کر اپنی شادی کے چھ ماہ بعد ہی نوکری کے سلسلے میں ڈو سال کے لئے اپنے شہر سے دور چلا گیا تھا۔ اور جاتے وقت رخشی سے کہہ گیا تھا "رخشی خرم کا خیال رکھنا، اسے کوئی تکلیف نہ ہو۔" آج وہی خرم اتنی رات بیت جانے پر بھی گھر واپس نہیں لوٹا تھا۔ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو وہ اسلم کو کیا جواب دے گی جیسے حواسوں پر خرم اس بری طرح چھایا ہوا تھا۔ یہ سوچ کر رخشی کانپ اٹھی۔ شادی کی پہلی صبح اسے یاد آگئی ــــ جب وہ اپنے کمرے میں شرمائی لجائی دلہن بنی بیٹھی تھی کہ اچانک اسلم کسی نوجوان کو لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ پیروں کی آہٹ سے کچھ اور جھک گئی۔

"رخشی ڈیئر ان سے ملو یہ ہیں میرے چھوٹے بھائی خرم، اور خرم یہ ہیں تمہاری بھابی"۔ اسلم کی جانی پہچانی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اور پھر ایک اجنبی آواز آئی۔

"بھابی تسلیم" — اور اس نے جھکے ہی جھکے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کا جواب دے دیا۔

"بھابی! خرم کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "میں تو آپ کا چھوٹا دیور ہوں، آپ مجھے اس طرح کیوں سلام کر رہی ہیں میں تو آپ سے دعائیں لینے آیا تھا۔"

اسلم نے اس کی تھوڑی پکڑ کر اوپر اٹھائی اور اس کی آنکھیں خود بخود ہی بند ہو گئیں۔

"بھئی رخشی شرمانے کی سند نہیں ہے" اسلم مسکرایا "آنکھیں کھولو۔"

اسلم اور خرم کے بار بار اصرار پر اس نے آنکھیں کھول دیں اس کے سامنے اسلم سے ملتا جلتا چہرہ تھا۔ اونچا پورا قد، گورا رنگ، گھونگر والے بال، چمکتی ہوئی شریر آنکھیں اور مسکراتے ہونٹ۔

"رخشی کچھ باتیں کرو"۔ اسلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بھابی آپ کا نام بہت خوبصورت ہے بالکل آپ کی طرح"۔ خرم نے شرارت سے کہا اور رخشی نے شرما کر نگاہیں جھکا لیں۔

"بھابی میں کل آپ کو منہ دکھائی میں کچھ بھی نہ دے سکا میری طرف سے یہ حقیر تحفہ قبول فرمائیے" یہ کہتے ہوئے خرم نے اپنی جیب سے ایک خوبصورت سی رسٹ واچ نکال کر رخشی کی طرف بڑھا دی۔

"تم اپنے ہاتھ سے پہنا دو خرم"۔ اسلم نے بڑے پیار سے کہا

"کیوں بھابی اجازت ہے" خرم نے رخشی کی طرف دیکھا اور رخشی نے بغیر کچھ کہے اپنی نازک گوری کلائی خرم کی طرف بڑھا دی۔

خرم نے مسکراتے ہوئے گھڑی اس کی کلائی پر باندھ دی اور پھر اسلم کی طرف دیکھ کر بولا "

"بھائی جان ہمیں تو ایسا لگتا ہے ہماری بھابی گونگی ہیں"۔

رخشی کے حسین چہرے پر ایک دلآویز مسکراہٹ پھیل گئی اور اسلم ہنستے ہوئے بولا۔

"رخشی! ان کی غلط فہمی دور کر دو، تم ایم اے ہو کر بھی اتنا شرماتی ہو"۔ اور رخشی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا بولے۔

"بھابی! آخر خرم ہی بولا "آپ نے ایم۔ اے کس مضمون میں کیا ہے"

"انگلش میں"۔ رخشی کو بولنے کا بہانہ مل گیا۔

"بھائی جان مبارک ہو"۔ خرم نے خوشی سے تالی بجاتے ہوئے کہا "ورنہ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ اب ہم دونوں کی ساری زندگی بھابی سے اشاروں میں ہی باتیں کرتے گذرے گی۔

اسلم کا زوردار قہقہہ کمرے میں گونج اٹھا اور رخشی کی بھی بے اختیار ہنسی نکل گئی۔ اس نے اس طرح خرم کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو — تم بہت شریر ہو —

"رخشی دیکھا تم نے" اسلم نے کہا "یہ کتنا شریر ہے پہلے ہی دن تمہیں گونگا بنا دیا — رخشی ہم لوگ چھوٹے ہی تھے تب ہی ہمارے ماں باپ کا سایہ ہمارے سر سے اٹھ گیا۔ جب ابا کا انتقال ہوا ہے میں انٹر کا امتحان دے رہا تھا۔ اور خرم ابھی صرف ساتویں کلاس میں تھا۔ اور امی تو ہمیں دو سال پہلے ہی چھوڑ کر جا چکی تھیں، ابا کے بعد مجھے اپنے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ مگر میں نے اپنے اس بھائی کے سہارے زندگی کے اتنے کٹھن دن گذار دیئے۔ تمہیں کیا بتاؤں ہم نے کس طرح تعلیم حاصل کی۔ میں جب بھی حالات سے مایوس ہوتا خرم میری ہمت بڑھاتا۔ مایوس ہونا تو اس نے جیسے سیکھا ہی نہیں ہے۔ آج جو تم مجھے اتنے اونچے مقام پر دیکھ رہی ہو یہ سب میرے اس معصوم بھائی ہی کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ میری ہمت نہ بڑھاتا تو آج شاید میں کسی دفتر کا کلرک ہوتا۔ رخشی میرا یہ بھائی ہی میری زندگی ہے۔ اگر تم اسے اپنا بھائی سمجھو گی تو میں سمجھوں گا کہ تم میری اپنی ہو اور یہی میری زندگی کا ماحصل ہوگا"۔ اسلم بہت جذباتی ہو گیا تھا۔ اسکی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

رخشی بے چین ہو گئی، اس نے اسلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ اطمینان رکھیے میں خرم کو ہمیشہ اپنا چھوٹا بھائی سمجھوں گی"۔

"مگر میں تو آپ کا بھائی نہیں بننا چاہتا" خرم جو بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا بول پڑا۔

"کیوں؟" رخشی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"اس لئے کہ بہنیں تو میں نے بہت بنائی ہیں۔ ہر لڑکی میری بہن بن جاتی ہے، مگر بھابی تو صرف آپ ہی بنی ہیں"

"ہاں رخشی! ان حضرت کو ایک بھابی کی بڑی تمنا تھی، جہاں کسی خوبصورت لڑکی کو دیکھتے، بس مجھ سے ضد کرنے لگتے کہ بھائی جان اس کو تو میری بھابی بنا دیجئے"

"ایک دفعہ ہم لوگ نمائش دیکھنے گئے۔ ایک دکان پہ ایک خوبصورت سی لڑکی کھڑی تھی۔ آپ اس کو دیکھ کر بولے، بھائی جان میں تو اس کو بھابی بناؤں گا" اس نے سن لیا، غریب بری طرح جھینپ گئی۔ مگر دوسری لڑکی جو اس کے ساتھ تھی پٹ سے بولی۔

"جناب یہ تو پہلے ہی ریزرو ہیں، ان کو آپ بھابی کیسے بنا سکتے ہیں"۔ میں تو جھینپ کر رہ گیا۔ مگر یہ کہیں چوکنے والے تھے۔

رخشی جو بڑی دلچسپی سے یہ قصہ سن رہی تھی بولی "ہاں انھوں نے کیا کہا"

"میں نے کہا "تو پھر آپ ہی میری بھابی بن جائیں" خرم جلدی سے بول پڑا۔

"کیا واقعی انھوں نے یہی کہا تھا" رخشی نے حیرت سے سلم سے پوچھا۔

"ہاں یہی کہا تھا" اسلم نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

رخشی زور سے ہنس پڑی۔ پھر وہ خرم بہت جلدی بے تکلف ہو گئی۔ کافی دیر تک وہ تینوں دلچسپ باتوں میں کھوئے رہے۔

اتنی بڑی کوٹھی میں اسلم، خرم اور خانساماں کے علاوہ ئی چوتھا آدمی نہیں تھا۔ رخشی کا وقت بڑا اچھا گذرتا۔ ساس مدول کا تو کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ اسلم اس کو جذبات کی انتھاہ گہرائیوں سے پیار کرتا۔ باہر تو اس کا دل ہی نہ لگتا۔ آفس کا وقت بھی نہ معلوم کیسے گذرتا۔ اور خرم اس کو تو جیسے دنیا کی ساری خوشیاں مل گئی تھیں۔ وہ ہر وقت بھابی کا ورد کیا کرتا۔ رخشی بھی خرم کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اور اب جب سے اسلم چلا گیا تھا۔ رخشی پورے وقت خرم ہی کی ناز برداری کرتی۔ دونوں دن بھر گھر میں اودھم مچائے رکھتے۔ کھیلتے۔ شرارتیں کرتے باتیں کرتے، کھاتے پیتے اور شام کو ایک ساتھ تفریح کرنے نکل جاتے۔ دن بڑی سہاونی فضاؤں میں گزر رہے تھے۔ انھیں صرف اسلم کا انتظار تھا۔ دونوں شدت سے اسلم کی کمی محسوس کر رہے تھے۔

ساڑھے گیارہ کا آدھا بجا اور اس کے خیالات کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ اسی وقت گھنٹی بجی اور رخشی کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی اس نے کرسی کے ہتھے پر پڑی ہوئی کالی شال کو اٹھا کر اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لیا اور دروازے کی چٹخنی کھول کر باہر نکل گئی۔ جب وہ برآمدہ عبور کر کے ڈرائنگ روم پر پہنچی تو گھنٹی دوبارہ بجی۔ رخشی نے دروازہ کھول دیا اور خرم کمرے میں آگیا۔ رخشی نے دیکھا اس کا گرم سوٹ پانی میں بھیگ رہا تھا۔ سردی سے اس کے دانت بج رہے تھے۔

"بھابی آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں" خرم نے بڑی محبت سے رخشی کو دیکھا۔

"جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر کپڑے بدل ڈالو" رخشی نے گھبرائے ہوئے لہجہ میں کہا "سردی لگ جائے گی، میں ابھی کھانا لے کر آ رہی ہوں"

"بھابی!" خرم نے اسے روکتے ہوئے کہا "میں کھانا خود گرم کر لوں گا، آپ جا کر آرام کیجئے"

"اچھا بحث مت" رخشی نے ذرا سختی سے کہا "کپڑے بدلو جا کر"

خرم مسکراتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا اور رخشی نے ڈائننگ روم میں جا کر اسٹوو جلایا اور جلدی جلدی کھانا گرم کیا

اور ٹرے میں رکھ کر اٹھا ہی رہی تھی کہ خرم گاؤن پہنے ہوئے کمرے میں داخل ہوا۔

"ارے تم یہاں کیوں آ گئے"۔ رخشی نے کہا "میں وہیں لا رہی تھی"۔

"نہیں بھابی آپ تکلیف نہ کریں، میں یہیں کھا لونگا" کہتے ہوئے خرم کرسی کھسکا کر وہیں بیٹھ گیا۔

رخشی نے kettle میں چائے کا پانی ڈال کر سوئچ کھول دیا اور خود بھی خرم کے برابر والی کرسی پر آ بیٹھی۔ اس نے غور سے خرم کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے انہماک سے کھا رہا تھا، جیسے بہت بھوکا ہو۔ اس کی آنکھوں اور ناک سے پانی بہہ رہا تھا جسے وہ بار بار رومال سے پونچھتا جا رہا تھا۔

"دیکھا نزلہ ہو گیا نا"۔ رخشی نے فکرمندی سے کہا، "اتنی اتنی رات تک باہر رہو گے تو یہی حشر ہوگا، کہیں بخار نہ آ جائے"۔

"بھابی میں بہت سخت جان ہوں" خرم نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے کچھ نہیں ہوگا"۔

"اچھا تم گئے کہاں تھے"۔ رخشی نے بناوٹی غصہ سے کہا "اتنی دیر کیوں لگائی؟"

"میری بھابی ناراض نہ ہوں" خرم نے معصومیت سے کہا "آج شام دلیپ کے یہاں چلا گیا تھا، تھوڑی دیر بعد چند لڑکے وہاں آ گئے، وہ سب زبردستی مجھے دوسرے شو میں لے گئے"۔

"اچھا تو جناب پکچر دیکھ کر آ رہے ہیں اور میں یہاں پریشان ہو رہی ہوں"۔ رخشی نے کہا۔

"بھابی مجھے خود آپکی پریشانی کا خیال تھا، میں تو انٹرول ہی میں واپس آ رہا تھا، مگر لڑکوں نے نہیں آنے دیا، کہنے لگے کون سی تمہاری بیوی انتظار کر رہی ہوگی جو بے چین ہوئے جا رہے ہو"۔

"ہاں بھئی بیوی انتظار کر رہی ہوتی، تو تم آتے بھی میں بھلا کون ہوتی ہوں"۔ رخشی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھابی ایسا نہ کہیئے، آپ جتنا مجھے چاہتی ہیں اور جیسا میرا خیال کرتی ہیں، میری ماں زندہ ہوتی تو وہ بھی اتنا خیال نہیں رکھ سکتی تھی، بھابی میں آپ سے سچ کہہ رہا ہوں جب سے آپ آئیں ہیں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے دنیا کی ساری خوشیاں سمٹ کر میرے دامن میں جمع ہو گئی ہیں"۔

"باتیں بہت بنانا آ گئی ہیں"۔ رخشی نے پیار سے اس کے رخسار کو چھوا اور پھر کھڑی ہو کر الماری سے پیالیاں نکالنے لگی۔

"ارے بھابی آپ نے چائے بھی بنا ڈالی"۔ خرم نے تعجب سے کہا "کتنی اچھی ہیں آپ"۔ یہ کہتے ہوئے خرم نے اپنی باہیں رخشی کے گلے کے گرد حمائل کر دیں اور وہ کھولتا ہوا پانی پیالیوں میں ڈالتی رہی۔

چائے پینے کے بعد خرم نے اپنے گاؤن کی جیب سے سگریٹ کیس نکالا۔ اور سگریٹ نکال کر ہونٹوں سے لگالی اور لائٹر رخشی کو دے دیا۔ رخشی نے لائٹر جلا کر اس کی سگریٹ سلگادی اور پھر کھڑے ہو کر اس کی پیشانی پر پیار کیا اور بولی "جاؤ سو جاؤ جا کے"۔ اور خود میز کی چیزیں سمیٹنے لگی۔

وقت گذرتا گیا اور اسلم کے آنے کے دن قریب آتے گئے، اور ساتھ ہی دونوں کی مسرتیں بڑھتی گئیں ــــ ایکدفعہ خرم کو ٹائفائیڈ ہو گیا۔ خرم کیا بیمار ہوا رخشی پر دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو گئی۔ ہر وقت اس کی پٹی سے لگی بیٹھی رہتی۔ وقت سے دوا پلاتی، دودھ، چائے اور پرہیزی کھانا کھلاتی، سر دباتی کپڑے بدلواتی، اپنے ہی ہاتھ سے اس کے لئے پرہیزی کھانا بناتی ــــ مگر خرم نے اس بیماری کی حالت میں عجیب عجیب حرکتیں شروع کر دی تھیں، وہ ایک منٹ کو بھی رخشی کو اپنے پاس سے نہیں ہٹنے دیتا تھا۔ وہ جب تک اپنے ہاتھ سے دوا نہ پلاتی، منہ نہیں لگاتا تھا، پرہیزی کھانا کھانے میں ہزار نخرے کرتا، بالکل ننھے بچے کی طرح ضدیں کرتا پانی تک رخشی کو اپنے ہاتھ سے پلانا پڑتا۔ اکثر بڑے والہانہ

انداز میں رخشی کے ہاتھ پکڑ لیتا اور ان پر بوسوں کی بارش کر دیتا۔ کبھی کبھی اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیتا اور عجیب بے چین نگاہوں سے رخشی کو دیکھتا۔ رخشی اسے اس کیفیت میں دیکھ کر پریشان ہو جاتی۔ ایسے موقعوں پر اُسے خرم کی آنکھوں میں ایک عجیب سی خواہش ناچتی ہوئی نظر آتی۔ پھر وہ اپنے اس خیال پر خود کو نفریں کرتی اور یہ سوچ کر کہ خرم بخار کی مدہوشی میں ایسی حرکتیں کرتا ہے مطمئن ہو جاتی اور پھر اُسی تندہی سے خرم کی تیمارداری کرنے لگتی۔

ایک دن دوپہر کو خرم خاموش اپنے پلنگ پر آنکھیں بند کئے لیٹا تھا۔ اب اس کی طبیعت پہلے سے بہتر تھی، بخار کا زور بھی کم ہو چکا تھا، ٹمپریچر نورمل تھا۔

"خرم اب کیسی طبیعت ہے" رخشی کی پیار بھری آواز سے اس نے آنکھیں کھول دیں، رخشی اسکے اوپر جھکی ہوئی تھی، غالباً وہ ابھی نہا کر آئی تھی۔ لمبے لمبے گھنے خوبصورت بال اس کے شانوں پر پڑے تھے، وہ اس وقت سرخ ساڑی باندھے تھی چہرہ کسی تازہ کھلے ہوئے پھول کی مانند شگفتہ نظر آ رہا تھا۔ خرم جواب دینے کے بجائے بڑی عجیب سی نگاہوں سے اسکی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا دیکھ رہے ہو" رخشی اس کی آنکھوں کی گرمی سے گھبرا کر بولی۔

"یہی کہ آپ اس وقت کتنی خوبصورت نظر آ رہی ہیں، بھابی! بھائی جان کتنے خوش نصیب ہیں کہ ان کو آپ جیسی حسین بیوی ملی، کاش"۔۔۔ جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ خاموش ہو گیا۔

"کہو کیا کہنے جا رہے تھے تم کاش کیا۔۔۔" رخشی کسی اچانک حملے کے لئے تیار ہو کر بولی، اس کی خوبصورت پیشانی پر ناگواری کی شکنیں پڑ گئی تھیں۔

"کچھ نہیں" خرم نے اُٹھ کر اپنی باہیں رخشی کی گردن کے گرد حمائل کر دیئے، پیشتر اس کے کہ رخشی اس کو اپنے سے الگ کرتی۔ خرم نے اچانک کسی جذبے کے تحت اپنے پیاسے ہونٹ رخشی کے بے لوث ہونٹوں سے مَس کر دیئے۔

مارے غصے کے رخشی کا سارا بدن تھرتھرا اُٹھا۔ اس نے تیزی سے خرم کے ہاتھ جھٹک دیئے اور پھر اُسی لمحہ ایک زناٹے دار تھپڑ خرم کے گرم گال پر پڑا۔

"خرم! تمہیں شرم نہیں آتی، تم نے اس طرح اپنے بھائی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی، اس بھائی کو جو اپنی بیوی کو تمہاری ذمہ داری پر چھوڑ گیا ہے" رخشی نے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "اور میں، جس نے تمہیں ایک بیٹے کی طرح سمجھا اور ایک ماں کی طرح تمہاری خدمت کی، اس کے ساتھ تم نے ایسی ذلیل حرکت کی، میں ابھی تمہارے بھائی کو خط لکھ رہی ہوں۔ خبردار آئندہ مجھ سے بات کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تم جیسے بے حیا، بے شرم انسان کی طرف دیکھنا بھی گناہ سمجھتی ہوں" یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے کمرے سے باہر جانے لگی۔

"بھابی!" خرم جو اپنی ناشائستہ حرکت پر خود ہی پشیمان بیٹھا تھا، زور سے چیخ پڑا "مجھے معاف کر دیجئے بھابی" وہ پلنگ سے اُٹھ کر رخشی کے پیچھے بھاگا۔ مگر دروازے کے قریب رکھی ہوئی میز سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔ میز پر رکھا ہوا شیشے کا گلاس ایک چھناکے سے ٹوٹا اور اس کے ذرّوں نے اس کی پیشانی کو زخمی کر دیا اور خون کی ایک لکیر دور تک پھیلتی چلی گئی۔

گرنے کی آواز سے رخشی واپس کمرے میں آ گئی۔ اس نے دیکھا خرم کا سر پھٹ گیا تھا اور خون نکل نکل کر کمرے کے فرش اور اس کے بیمار اور کمزور چہرے کو بھگو رہا تھا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا، اور وہ خود بے دم سا اوندھا زمین پر پڑا تھا۔

خرم کو اس بے چارگی کے عالم میں دیکھ کر رخشی کا

فہمیدہ اختر

آسماں دیکھتا رہا

اس روز نگینہ کو یوں لگا جیسے بیس سال کے تفکرات کا آج خاتمہ ہو گیا ہے اس کی تمام بے چینیاں اور بے قراریاں مٹ گئی ہیں جن کی لپیٹ میں وہ بیس سال سے تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اب اُسے حیات کی ہر خوشی اور تمام آسائش مل گئی ہے۔ زندگی میں پہلی بار ہی تو اُسے یوں لگا جیسے وہ دنیا میں ہر قدم پر کامیاب رہی ہے اور ساری کائنات اس کی ہے اس نے اپنے سفید میلے سے دوپٹے کے پلّو سے دو دو روپے کے نوٹ کھولے اور جہانگیر کے دوست آدم خیں کے ملازم کو دیتے ہوئے خوشی میں تھرتھراتی آواز میں کہا "یہ تمہارا انعام ہے مٹھائی کھانا ___" جب ملازم نے روپے لے لئے تو بولی ___ "جہانگیر سے کہنا ذرا جلدی آئے ___" جب وہ اچھا کہہ کر چلا گیا تو اس نے گلی میں کھلنے والی بوسیدہ کھڑکی کا ایک پٹ کھول دیا۔ مٹی اڑ کر اس کے چہرے اور ہاتھوں پر پڑی اس نے یوں اس مٹی سے بے نیازی اختیار کی جیسے پھول برس پڑے ہوں ___ وہ گلی میں جھانکنے لگی اس روز اسے وہ تنگ و تاریک اور غلیظ گلی بڑی حسین لگی اور اسے یوں لگنے لگا جیسے بیس سال تک جس عمارت کی تعمیر وہ اپنے خونِ جگر سے کرتی رہی ہے جس کی تیاری میں اس نے اپنا گوشت پوست جلایا ہے اپنے رنگین خوابوں کو مٹایا ہے اپنی دولت صرف کی ہے اپنی زندگی کے آرام اور سکون کی بازی لگائی ہے وہ عمارت اب تیار ہو گئی ہے اور اس کی تمام قربانیوں کا صلہ اسے مل گیا ہے۔

اس وقت اس اندھیری، گندی اور تنگ گلی پر جھکنے والے نیلے آسمان کے اس ٹکڑے پہ ابر چھا گیا تھا گردشِ دوراں تھم تھم سی گئی تھی اور تھم کر پیچھے کی طرف لوٹ سی گئی تھی۔

اس نیلے آسمان نے کبھی اسے جوان بھی دیکھا تھا صحت مند اور رعنا صورت بھی ___ جب اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیلتی تھی تو آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو جاتی تھی کہ چمکیلے تارے بھی شرما جاتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہی مسکراہٹ تھی جس نے شماس کے دل کو سنہری نغموں سے ہم آہنگ کر دیا تھا آہستہ آہستہ

ان لفظوں نے نگینہ کے پاکیزہ دل کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جب شماس نے ان لفظوں کا ما ئی الضمیر جاننا چاہا تو اس کے اس فیصلے کو دونوں کے گھرانوں کو رضا اور خوشی کے ساتھ سُنا تھا اور جب یہ نغمے شماس کے دل اور نگینہ کی روح سے نکل کر فضاؤں میں تحلیل ہونے والے تھے اور اس سلسلے میں فریدہ کو نگینہ کے ہاں آئے ہوئے تیسرا دن تھا کہ فریدہ بیمار پڑ گئی خوشی کی راہ پر دونوں گھرانوں کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔

فریدہ کے تین سال کے بچے کی دیکھ بھال نگینہ ہی کرنے لگی تھی وہ اسے وقت پہ دودھ پلاتی اس کے منہ ہاتھ دھلاتی اسے نہلاتی صاف کپڑے پہناتی اس کے بال سنوارتی اور جب وہ اسے گود میں لئے بہن کے پاس لے جاتی تو اس کی بیمار آنکھوں میں تھوڑی دیر کے لئے چمک پیدا ہو جاتی چند دنوں میں اس کی بیماری خطرناک صورت اختیار کر گئی لیکن اس کے دل سے اپنی جسمانی تکلیف کا احساس جاتا رہا۔ وہ بچے کی فکر میں کھو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا میاں قابلِ اعتماد انسان نہیں ہے اس کی جان بلڈ پریشر کا شکار ہے اور باپ دل کی بیماری کا مریض ہے ان باتوں پر غور کر کے وہ سوچا کرتی تھی کہ اگر وہ اس بیماری سے بچ نہ سکی تو اس بچے کا کیا بنے گا؟ جب اسے یہ خیال آتا تو اس کا دل ایسی تپش پیدا کرتا کہ اس کی سانسوں میں چنگاریاں بھر جاتیں —— ایک دن اس نے دیکھا کہ نگینہ انتہائی خلوص کے ساتھ اس کے بچے کی پیشانی پر بوسہ دے رہی ہے بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا —— "یہ تمہارے حوالے" —— اور پھر اسے یوں لگا تھا جیسے اس کے دل کی تپش ہمیشہ کے لئے سرد ہو گئی ہے اور اس کے لبوں پر پھیلی ہوئی چنگاریاں ہمیشہ کے لئے بجھ گئی ہیں۔ اسے روحانی طور پر آسودگی مل گئی تھی۔

چند دنوں کے اندر ہی اندر اس کے بچنے کی کوئی امید نہ رہی اور پھر ایک دن ایسا بھی آیا کہ اس کا ننھا

جسم ہمیشہ کے لئے بے جان ہو گیا نگینہ نے بلکتے ہوئے دل اور روتی ہوئی آنکھوں سے جب پہلی بار بے حس بہن کے چہرے کو دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے وہ بے حد مطمئن ہے اور اسے جہانگیر کا کوئی غم نہیں اس کے درد بھرے احساسات میں مدوجزر پیدا ہونے لگے وہ کمرے سے صحن کی طرف بھاگ گئی اور سوتے ہوئے جہانگیر کو گود میں اٹھا لیا اور بے تحاشا اس کے بوسے لینے لگی ——

وقت برق رفتاری سے گزرنے لگا۔

تین ماہ کے بعد نیلے آسمان نے یہ بھی محسوس کیا کہ نگینہ کے بیمار ماں باپ کے لئے جوان بیٹی کی موت کا صدمہ برداشت کرنا ناممکن ہے ان کی بیماری میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے اور ان کے رنجور دلوں سے یہ خواہش جھانکنے لگی ہے کہ جلد از جلد نگینہ کی شادی کر دی جائے

جس سہ پہر کو نیلے آسمان نے جہانگیر کے باپ کی دوسری شادی کا سماں دیکھا اس رات کو یہ منظر بھی دیکھا کہ نگینہ رات بھر جہانگیر پہ ہاتھ رکھے رہی۔ اس کی ننھی سی پیشانی کے بوسے لیتی رہی اس کی آنکھیں برابر اشکبار رہیں اسے یوں لگتا رہا۔ جیسے اس کے والدین اس سے کسی امانت میں خیانت کرانے کے متعلق سوچ رہے ہوں اور روحوں کی پاکیزہ دنیا میں اداسی پھیل رہی ہو ——

صبح ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد جب وہ چنبیلی کے پودوں کے قریب بچھے تخت پہ جہانگیر کی قمیص سینے بیٹھی تو ان کے ہاں مہمان آئی ہوئی اس کے ماموں کی لڑکی شہناز بھی آکر بیٹھ گئی اس نے پوچھا —— "تمہاری آنکھیں سوجی سوجی سی ہیں؟"

دریا کا بند گویا ٹوٹ گیا۔ وہ بے قابو ہو کر رونے لگی شہناز متعجب ہو گئی —— "خدا کے لئے بتاؤ کیا بات ہے؟"

اس کے غمگین لہجے میں بڑا درد تھا —— "بے بے اللہ واسطے کہہ دو کہ میں نے اپنی زندگی جہانگیر کے لئے وقف کر دی

کردی ہے۔"

شمشاد سناٹے میں آگئی ــــــ "کیا مطلب ہے؟"

اس نے دوپٹہ سے آنسو پونچھے ــــــ "مطلب یہی ہے کہ میری نسبت سے ان دونوں جو خیال ان کا ہے وہ ترک کر دیا جائے۔"

شمشاد ہراساں ہو گئی ــــــ "یعنی "

نگینہ کی آواز میں دکھ کے ساتھ ساتھ سختی بھی پیدا ہو گئی ــــــ "یعنی میں تمام عمر جہانگیر کے ساتھ اس گھر میں گزار دوں گی۔"

شمشاد کا چہرہ سرخ ہو گیا ــــــ "منگنی وعدہ بے غیرت مند پٹھان جان پر کھیل جاتا ہے لیکن وعدے سے نہیں پھرتا ہے ــــــ"

نگینہ رنجیدہ آواز میں الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولی ــــــ "یہ بھی یاد رکھو کہ پٹھان جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ لیکن امانت میں خیانت نہیں کر سکتا ــــــ"

شمشاد کا انداز ناصحانہ ہو گیا ــــــ "شمناس بھائی غیر نہیں رشتے میں جہانگیر کے ماموں لگے اس گھر میں بھی تم اسے اپنے پاس رکھ سکتی ہو ــــــ"

نگینہ تلخی سے مسکرائی ــــــ "یہ بھی پختو کے خلاف ہے۔ میں جہیز میں بہن کے بچے کو نہیں لے جا سکتی گو عم زاد کا کیوں نہ ہو ــــــ"

نگینہ کے فیصلے سے بوڑھے والدین پر سکتہ طاری ہو گیا شمناس بھی بت بن گیا خاندان کے بزرگوں نے اسے نرمی اور سختی کے ساتھ سمجھایا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی شمناس نے بوڑھے اور بیمار چچا کے پاس کئی جرگے بھیجے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکل سکا۔

گاؤں بھر میں نگینہ کو ملامت کیا جانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے والدین کو بھی ــــــ خان جعفر نے اپنے حجرے میں یہاں تک کہہ دیا "کہ وہ ــــــ بے غیرت انسان ہے ورنہ بیٹی کی اتنی ناجائز اور پختو کے خلاف بات سنتا؟"

ملک نے ندی کنارے مشک میں پانی بھرتے ہوتے دوسرے بہشتیوں سے کہا ــــــ "اس دنیا میں اتنا شریف کوئی نہیں ہو سکتا کہ کسی کے لئے اپنی زندگی برباد کر دے یہ بہانہ ہے بہانہ نگاہ میں کوئی اور ہوگا ــــــ"

خاندان ترک تعلق کی دھمکیاں دینے لگا

نگینہ نے یہ سب کچھ سنا اور مطمئن رہی ــــــ بوڑھے والدین نے یہ سب کچھ جانا اور ہر وار مجروح دل پر سہہ گئے اگر ایک وقت انہیں اپنی عزت کا خیال آتا بھی تو دوسرے وقت بیٹی کے نیک جذبات اور بچے کی محبت کے سامنے بے بس ہو کے رہ جاتے۔

نیلے آسمان نے ایک اور سماں بھی دیکھا۔

ایک شام جبکہ چاند ماہ خوش تارنگی کے مقابل مغرب میں تیزی سے چمک رہا تھا اور کرنے کی شگفتہ کلیوں کی مہک فضا میں پھیل رہی تھی۔ نگینہ نے پیڑ کے قریب ایک سایہ دیکھا۔ اس کے لہجے میں جرأت تھی ــــــ "کون؟"

دھیمی سی افسردہ آواز آئی ــــــ "میں"

نگینہ کے استفسار میں حیرت تھی ــــــ "شمناس"

"ہاں"

نگینہ کی آنکھیں بھیگ گئیں لیکن وہ مصلحت پہ اتر آئی ــــــ "بھائی"

شمناس کی روح تڑپ گئی ــــــ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو اپنی مسکراہٹوں کے چراغوں کو بجھانا چاہتی ہو؟ ــــــ"

ایک لمحے کے لئے نگینہ کشمکش غم میں پڑ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بڑے استقلال سے بولی ــــــ "میں تو ان چراغوں کی لو بڑھا رہی ہوں بھائی"

شمناس چیخ اٹھا ــــــ "نگینہ"

وہ اطمینان سے بولی ــــــ "کیا ہے بھائی"

بھائی ــــــ بھائی ــــــ ہتھوڑے شمناس کے نفس پر

حل پیپڑ نے لگے وہ دروازے کی طرف مڑگیا۔

نگینہ پیڑ کے تنے سے لگ کر کھڑی ہوگئی دل کی دنیا میں آتے ہوئے انقلاب پہ کرب کا رنگ اور گہرا ہوگیا۔ تارے رنجیدہ ہو گئے چاند مضمحل ہوگیا آسمان کی نیلاہٹوں میں تھرتھری پیدا ہوگئی۔

گاؤں کی جوان چنچل لڑکیاں مٹی کے گھڑے سروں پہ رکھے اور بغلوں میں دابے ندی کی طرف جارہی تھیں نرم آواز میں ایک ٹپہ گونج اٹھا۔

دَ میلتیا نه قلعه جوړیږي

دَ خپلې لاسه ورله ځښتي چلوولا

(جدائی کا قلعہ تیار ہو رہا ہے میں خود اس کے لئے اینٹیں اکھٹی کر رہی ہوں)

نگینہ نے نارنگی کے پیڑ کی ایک شاخ پر سر رکھ دیا اس کے آنسو گرنے کی معصوم کلیوں پہ پڑنے لگے کلیوں کے ننھے ننھے دل دھڑک اٹھے۔

چند دنوں کے بعد نگینہ کی ماں کا انتقال ہوگیا اور اس کے دو ماہ بعد ہی باپ کا بھی اس کے ساتھ ہی زمین کے وارث اٹھ کھڑے ہوئے زمین تقسیم ہوگئی نگینہ کے حصے میں چند جریب زمین اور رہائشی مکان!

آسمان کی نیلاہٹیں اس سہ پہر کو کیسے فراموش کر سکتی ہیں جبکہ شماس کی برات کے شادیانے اس مختصر سے گاؤں میں زندگی پھیلا رہے تھے

شماس کا جوان دل رو رہا تھا اور نگینہ کے بے جان لبوں پہ یہ ٹپہ کانپ رہا تھا۔

قسم په خدائی خیر دَ نه کړم

که دَ آسمان تر ستورو ډېر تیری کړونه

(خدا کی قسم تجھے کبھی بھی فراموش نہیں کروں گی اگر آسمان پہ موجود ستاروں کے برابر بھی سال گزر جائیں)

جب جہانگیر نے میٹرک پاس کر لیا اور پشاور کے اسلامیہ کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا تو نگینہ کسی سوچ میں پڑ گئی۔ جہانگیر کا گاؤں سے تنہا شہر جانا اور تنہا شہر سے گاؤں لوٹنا نگینہ کے لئے یہ امر کشمکش کا سبب بن گیا وہ دشمنوں سے خائف رہنے لگی اور پھر اسے یہ احساس بھی تھا کہ جہانگیر کو آنے جانے میں بے حد تھکاوٹ ہو سکتی ہے۔ آخر کار اس نے پشاور میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک تنگ اور اندھیری گلی میں ایک مختصر سا کم کرایہ کا مکان لیا اور جہانگیر کو لے کر شہر آگئی۔ مکان کا کرایہ ـــــ شہر اور کالج کے اخراجات ـــــ وہ مالی مشکلات میں پڑ گئی ہر ماہ اسے اپنا کوئی نہ کوئی زیور بیچنا پڑتا ـــــ نیز وہ مجبور ہوگئی کہ مشین پہ سلائی کا کام کرے وہ رات گئے تک مشین پہ محلے کے لوگوں کے کپڑے سیتی رہتی۔

نگینہ گاؤں کے یک منزلہ کھلے مکان میں رہنے کی عادی تھی جہاں سورج کے طلوع ہوتے ہی روشنیاں پھیل جاتیں اور سورج کے غروب ہونے تک روشنیاں بکھری رہتیں شہر کے تنگ اور تاریک مکان میں اس کا دم گھٹ گھٹ جاتا۔ گاؤں میں ان کے مکان کے اردگرد شاداب کھیت تھے۔ اور گھر میں نارنگیوں کے کئی پیڑ ـــــ بہار کے آغاز میں انہیں کرنے کی سفید سفید اور موٹی موٹی کلیاں مسکرانے لگتیں اور چاروں طرف روح کو وجد میں لانے والی مہک پھیل جاتی اور سردیوں میں سرخ سرخ نارنگیاں ڈھلی ڈھلی فضاؤں میں اپنا حسن پھیلاتی رہتیں۔ اور شہر میں ان کے مکان کے اردگرد غلیظ گلیاں تھیں اور اندھیرا تھا بعض اوقات اس کے لئے سانس لینا دشوار ہو جاتا تھا۔ لیکن جب نگینہ کی نگاہ جہانگیر پہ پڑتی تو وہ زندگی کے تمام مصائب بھول جاتی تمام کلفتوں کو فراموش کر دیتی اس کی روح نامعلوم مسرتوں میں کھو جاتی اور اس کا ذہن زندگی کی تمام آسودگی محسوس کرنے لگتا اور اسے یوں لگنے لگتا جیسے تمام کائنات اس کی ہے اس نے کبھی بھی جہانگیر کے سامنے احتیاجات کا کوئی ذکر نہ کیا شاید

اسی لئے جہانگیر میں کبھی احساس ہی پیدا نہ ہو سکا کہ ہر ماہ کتنا روپیہ خرچ ہو رہا ہے اور وہ کہاں سے آتا ہے۔ اس کی کوئی خواہش کبھی رد بھی تو نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پاس اچھے سے اچھے سوٹ تھے۔ بوٹوں کے کئی جوڑے ــــ کبھی کوئی کتاب وغیرہ خریدنے میں اسے کوئی دقت نہ ہوئی تھی پڑوس والوں نے کئی بار نگینہ سے کہا بھی کہ بچے کی فیس معاف کرانے کی کوشش کرو۔ لیکن وہ سوچتی کہ اس طرح سے جہانگیر میں احساس کمتری نہ پیدا ہو جائے۔ بہن کی وفات کے بعد کسی نے اس کے جسم پہ اچھا کپڑا نہیں دیکھا تھا اس نے کبھی اچھا کھانا نہیں کھایا تھا جہانگیر سے بچا کچا کھانا ہی اس کے نصیب میں ہوتا تھا۔

اخراجات برابر بڑھتے چلے گئے۔ جب زیور بک گیا تو وہ اپنے جہیز کے کپڑے بھی بیچنے لگی یہاں تک کہ زمین کے بکنے کی بھی نوبت آ پہنچی ــــ اسے بڑے مخلصانہ انداز میں مشورے دیئے گئے کہ زمین نہ بیچو مگر جب اس کی نگاہ جہانگیر پر پڑتی تو اس کے کانوں میں صدا آنے لگتی ــــ "ڈاکٹر ــــ" یکدم حال کے اندھیرے مٹ جاتے اور مستقبل کے اجالے پھیل جاتے اور وہ زمین کو حقیر چیز سمجھنے لگتی۔

جب جہانگیر میڈیکل کے آخری سال میں تھا تو نگینہ کے زیور کپڑے اور تقریباً تمام زمین بک چکی تھی اس کا صحت مند جسم کمزور اور نحیف ہو گیا تھا اس کے بال بالکل سفید ہو گئے تھے اور نظر بے حد کمزور ہو گئی تھی۔

اور جب ایک دن جہانگیر کے دوست آدم خیل کے ملازم نے اسے خبر دی کہ جہانگیر ڈاکٹری کے آخری امتحان میں کامیاب ہو گیا ہے تو اسے یوں لگا تھا جیسے راستہ کا تمام گرد و غبار پیچھے رہ گیا ہے اور وہ منزل تک پہنچ گئی ہے اور منزل کے ارد گرد اجالے پھیل رہے ہیں پھر نیلے آسمان نے دیکھا وہ بوسیدہ کوٹھڑی کا ایک پٹ کھول کر بیتابی سے جہانگیر کا انتظار کرنے لگی ہے اور جب جہانگیر کا موڑ مڑا اور اسے نظر آنے لگا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اس کی سانس تیزی سے آنے جانے لگی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ کمرے سے نکلی اس کے کمزور وجود میں اتنی طاقت پیدا ہو گئی کہ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئیں۔ جب جہانگیر نے دروازے میں قدم رکھا تو اس نے اسے سینہ سے لگا لیا اور دیوانہ وار اس کی صحت مند چھاتی کے بوسے لینے لگی۔

اوپر چھت پر جا کر جہانگیر چارپائی پر بیٹھ گیا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ نظریں جھکا کر زمین کی طرف دیکھنے لگا نگینہ حیرت زدہ ہو گئی جہانگیر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے نگینہ کو یقین ہو گیا کہ جو خبر آدم خیل کے ملازم نے اسے سنائی ہے وہ غلط ہے جہانگیر پاس نہیں ہوا اس خیال سے کہ جہانگیر کو دکھ نہ ہو اس نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار نہ کیا، اس کے پاس بیٹھ کر اور اس کے صحت مند شانے پہ بوسہ دے کر بولی "کیوں بیٹا اداس ہونے کی کونسی بات ہے"۔؟

جہانگیر کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے وہ غمگین آواز میں بولا ــــ "خالہ اگر آج میری ماں زندہ ہوتی تو میری کامیابی پر کتنی خوش ہوتی ــــ"

"خالہ؟" نگینہ نے تھرتھراتے لبوں سے دہرایا اسے یوں لگا جیسے جہانگیر نے اپنے تنومند ہاتھوں سے اس کے لاغر اور بیمار چہرے کو نوچ نوچ لیا ہے ــــ کیا وہ آج بھی خالہ ہے محض خالہ؟؟ ــــ کیا لو کو تیز کرنے میں زندگی کے چراغ بجھ گئے؟؟ اس کے مجروح دل نے ہولے سے پکارا "شمس" مگر تاریکیاں گہری ہو گئیں ــــ وہ بیمار وجود کمزور نظر سفید بالوں اور خالی ہاتھوں کے ساتھ تنہا ان اندھیروں میں کھو گئی ــــ بالکل تنہا!!

اور آسمان دیکھتا رہا!!

منظر صدیقی اکبرآبادی

○

یہ پتہ خود مری تقدیر کے چکر سے چلا
میں کہیں کا نہ رہا جب سے ترے در سے چلا

جھومتا جھامتا بالکل نئے تیور سے چلا
دیکھنا جام بہ کف کون یہ کوثر سے چلا؟

"دل" میں "اور" "پھول" میں ہوتا ہی نہیں فرق کوئی
وقتِ گل گشت پتہ اس کا گلِ تر سے چلا

ہم تو جلووں سے ترے حسن کے سرشار رہے
کام اپنا نہ کبھی بادہ و ساغر سے چلا

اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ شبِ غم اے دوست
کام مہتاب کا تیرے رُخِ انور سے چلا

کسے معلوم کہ یہ سلسلۂ کارِ جنوں !
عشق والوں سے چلا، یا بتِ کافر سے چلا

نام اس "آگ" کا کہتے ہیں "محبت" جس کو
کبھی خود عشق، کبھی حسن کے پیکر سے چلا

کوئی دیوانگیٔ عشق کو سمجھا ہی نہیں
سلسلہ اس کا کبھی دل سے کبھی سر سے چلا

سب تھے آمادہ میری راہ نمائی کے لئے
میں ہی بچتا ہوا خود رہزن و رہبر سے چلا

دل کو ٹھکرا نہ حقارت سے، وہ پتھر ہی سہی
حسن کا نام چلا تو اسی پتھر سے چلا

ہے بجا حضرتِ سیماب کا دعویٰ منظر
"سلسلہ شعرِ مہذب کا مرے گھر سے چلا"

اختر انصاری اکبرآبادی

○

کلیاں چٹکیں، پھول کھلے تو جشن چمن میں خاک ہوئے
کتنے چاک سلے ہیں یارو کتنے گریباں چاک ہوئے
دیوانے تھے بات نہ سمجھے، حدِ ادب میں کچھ نہ ملا
اس نے انہیں کی سمت نظر کی عشق میں جو بے باک ہوئے
شعبدے ہیں سب طرزِ کرم کے کس کی سزا اور کیسی جزا
موجِ تبسم جب لہرائی، تر دامن بھی پاک ہوئے
رُخ دیکھا جس سمت ہوا کا اُس جانب رُخ کر کے چلے
رفتہ رفتہ دشتِ جنوں میں دیوانے چالاک ہوئے
خاک نشیمن جب اڑتی ہے دل سے دھواں سا اٹھتا ہے
حادثے اس گلزار میں ورنہ اور بہت غمناک ہوئے
دیکھتے دیکھتے دنیا بدلی گلشن کب ویرانہ کیا
کیسے کیسے نقش حسیں تھے ملتے مٹتے خاک ہوئے
جانِ چمن جو گل تھے اختر کھو بیٹھے وہ رنگ اپنا!
ہوتے ہوتے زیبِ گلستاں سارے خس و خاشاک ہوئے

○

سعادت نظیر

بنامِ امن یہ سب شور و شر تو کچھ بھی نہیں
اسی کا نام ہے دنیا اگر تو کچھ بھی نہیں

نہ ہو جو درد میں کیف و اثر تو کچھ بھی نہیں
نہ ہو بہار پہ زخمِ جگر تو کچھ بھی نہیں

زمیں کا چاند کہاں، آسماں کا چاند کہاں
ہوس کے بندوں کا ذوقِ نظر تو کچھ بھی نہیں

یہ اضطراب، یہ درد و الم، یہ آہ و فغاں!
نہیں جو اس شبِ غم کی سحر تو کچھ بھی نہیں

بتائیں کیا تجھے قیمت ہم اپنے اشکوں کی
تری نگاہ میں لعل و گہر تو کچھ بھی نہیں

سوائے حسرتِ پرواز اور کیا ہے یہاں
درِ قفس ہے کھلا۔ بال و پر تو کچھ بھی نہیں

وہ داغ، سینے میں جس کو چھپا کے رکھا ہے
نہیں چراغِ سرِ رہ گزر تو کچھ بھی نہیں

یہ سب کرم ہے کسی کی نظر کا ورنہ، نظیر
فروغِ شعر میں اپنا ہنر تو کچھ بھی نہیں

حیدر شکیب

کس خوف سے ماتھے پہ نشاں تیرے پڑے ہیں
ہم لوگ ابھی دور فصیلوں سے کھڑے ہیں

وہ درد میں لذت ہے نہ ملنے کی تمنّا
دن رات ہمارے بھی تو اب کتنے کڑے ہیں

اے گردشِ ایام کہیں اور چلی جا
اس شہر میں پہلے ہی کئی لوگ بڑے ہیں

ہم نے تو بیاں کی تھی غمِ دل کی حکایت
یہ جھوٹے فسانے ہیں جو لوگوں نے گھڑے ہیں

اس تہمتِ بے جا پہ بھی مایوس نہیں ہیں
ہم تیرے لئے سارے زمانے سے لڑے ہیں

دشنام طرازی یہ تیرا طرزِ تکلم
لب کھولے ہیں تونے تو کئی پھول جھڑے ہیں

اب رات کے چہرے پہ بھی عکس ان کا پڑیگا
جو زخم ستاروں کی طرح دل میں جڑے ہیں

ہر چند شکیب ان کو دل و جان سے چاہا
جو لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم لوگ بڑے ہیں

ہم قلم، کراچی۔

خمار انصاری

یہ اور بات کہ وہ بے رخی سے ملتا ہے — مگر قرارِ دل وجاں اسی سے ملتا ہے

ملے وہ آج مگر اتنی بے نیازی سے — کہ جیسے کوئی کسی اجنبی سے ملتا ہے

مرے جنوں کا ذرا احترام کر اے دوست — تیرا پتہ تری دیوانگی سے ملتا ہے

بہاریں تری رعنائیوں کی ہے تصویر — خزاں کا رنگ تری زندگی سے ملتا ہے

وہ غم کہ جس کو غمِ عشق لوگ کہتے ہیں — دل و نگاہ کی شائستگی سے ملتا ہے

وہ میرے پیار کا ساتھی وہ میرے غم کا رفیق — اب اس کے بعد کہیں دل کسی سے ملتا ہے

ترے کرم کا نشاں تری رحمتوں کا سراغ — مری حیات کی تردامنی سے ملتا ہے

یہ تیرہ بخت ستارے نہیں سحر کی دلیل — ثبوتِ صبح تو خورشید ہی سے ملتا ہے

جو سوچیئے تو غمِ دل کا سلسلہ بھی خمار
کہیں ضرور غمِ زندگی سے ملتا ہے

سجاد مرزا

○

آپ کو زخم جگر دکھلا کے ہم چپ چاپ ہیں
آپکی آنکھوں میں آنسو لا کے ہم چپ چاپ ہیں

آج دنیا کی نگاہیں آسمان پر ہیں لگی
دونوں عالم پر ابھی تک چھا کے ہم چپ چاپ ہیں

آپ نے تو اک جہاں میں ہم کو رسوا کر دیا
آپکی محفل میں لیکن آ کے ہم چپ چاپ ہیں

لوگ جلتے ہی رہے دل میں لئے بغض و عناد
شاعرانہ عظمتیں دکھلا کے ہم چپ چاپ ہیں

شکوۂ جورِ بتاں سجاد ہم نہ کر سکے!
ہر قدم پر کتنے دھوکے کھا کے ہم چپ چاپ ہیں

کوی جسیم الدین

ترجمہ: انور شعور

دھان کے کھیت میں

اُٹھو اوزار اُٹھاؤ ساتھی
دھان کے کھیت میں آؤ ساتھی
دھان کے کھیت کہ پکے کاٹیں

جس قدر فصل کٹے گی، ساری
ہم اٹھائیں گے سروں پر اپنے
لوٹ آئیں گے گھروں پر اپنے
جھومتے، ناچتے، ہنستے، گاتے
ملکِ محنت کا علم لہراتے
یہ ہوا جھومتی چھم چھم کرتی
دھان کے کھیت میں جیسے گھنگرو
چھَن چھنَن ناچ رہے ہوں ہر سُو
تم بھی آواز ملاؤ ساتھی
دھان کے کھیت میں آؤ ساتھی

اُف یہ نغمات کی لہریں جیسے
ہم میں سیلاب اُمنڈتا آئے
دل بے تاب امنڈتا آئے،
اک ذرا دیر تو ٹھہرو، دیکھو
عالم جلوۂ عالم آرا،
دل فریب اور حسین نظارہ

اور ادھر آؤ۔ اسے تو دیکھو
یہ دُلہن سی نئی ساڑھی پہنے
جھم جھماتے ہوئے جھُومر گہنے
زعفران زار قبا میں ملبوس
شرم میں دبند حیا میں ملبوس
دھان کے کھیت پہ چھائی جائے
اس کا گھونگٹ تو اٹھاؤ ساتھی
دھان کے کھیت میں آؤ ساتھی

اس جہاں میں یہ زمین کی جنت
کون لایا ہے یہ ہم جانتے ہیں۔
ہمیں معلوم ہے ہم جانتے ہیں
پائے ہیں وہ خزینے ہم نے
وہ جواہر وہ نگینے ہم نے
تھے جو پوشیدہ زمیں کی تہہ میں
غنچہ و گل کے نگیں کی تہہ میں
ہمیں معلوم ہے ہم جانتے ہیں
یہ بھرا کھیت ، یہ سونے کا جہاں
ہم کسانوں نے کیا ہے تعمیر
ہم کسانوں ہی سے ہے اس کا فروغ
گن کسانوں ہی کے گاؤ ساتھی
دھان کے کھیت میں آؤ ساتھی

○

علاقائی سرگرمیاں

جناب قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایک شام

پاکستان رائٹرز گلڈ، راولپنڈی سب ریجن نے ۷ مارچ ۱۹۶۷ء کو پاکستان ہال میں جناب قدرت اللہ شہاب، سکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ و (سفیر پاکستان در ہالینڈ) کے ساتھ ایک شام منائی۔ اس موقع پر شہاب صاحب نے ہالینڈ میں جدید ادبی اور تعلیمی رجحانات کے موضوع پر تقریر کی۔

تقریر کے دوران جناب قدرت شہاب نے کہا کہ ہالینڈ کا جدید ادب نہ صرف بنیادی طور پر مغربی یورپ کے تمام ممالک سے مختلف ہے بلکہ بعد از جنگ پیدا ہونے والی، مایوسی [illegible]ی اور بغاوت کے مضر رجحانات سے بھی بالکل پاک ہے۔ جناب قدرت اللہ شہاب نے ہالینڈ کے جدید ادب میں صحتمند عناصر کو تصوف کے ذریعہ اسلام کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ ڈچ قوم کے کردار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ روزمرّہ کی زندگی میں روحانی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ جناب قدرت اللہ شہاب نے کہا کہ ہالینڈ کی یونی ورسٹیوں میں روحانیت کے باقاعدہ شعبے کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں مزید بتایا کہ ایک معنف شرائے۔سی بینسن اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے سے قبل فوت ہو گئے لہٰذا اب انکی تحقیق کو مکمل کر کے دنیا کے سامنے پیش کرنے کی خاطر آٹھ محقق مسٹر بینسن کی روح سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ جناب شہاب نے بتایا کہ ہالینڈ کے محقق شاہ ولی اللہ اور انکی تصنیفات میں گہری دلچسپی لیتے ہیں لہٰذا ہالینڈ کی تمام یونی ورسٹیوں میں شاہ ولی اللہ اور ان کی تصنیفات باقاعدہ مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہیں مسٹر شہاب نے انکشاف کیا کہ ہالینڈ کے خانہ بدوش جو زبان بولتے ہیں اس میں بہت سے پنجابی الفاظ موجود ہیں۔ ہالینڈ میں تصوف کے رواج کے بارے میں جناب شہاب نے بتایا کہ صوفی عنایت اللہ کے ذریعہ تصوف برصغیر ہند و پاک سے ہالینڈ پہنچا، جو ایک نواب کے ہمراہ امریکہ سے ہالینڈ گئے تھے اور ۱۹۲۶ء میں دہلی واپس چلے آئے تھے۔

لیکن اب صوفی عنایت اللہ کی تحریک نے ان کے بھائی صوفی مشرف خاں کی بدولت ایک باقاعدہ فرقے کی شکل اختیار کرلی ہے مسٹر شہاب نے بتایا کہ حالانکہ ہالینڈ میں اسلامی طرزِ تصوف کے لاکھوں پیروکار ہیں لیکن وہ سب مسلمان نہیں ہیں بلکہ وہ دنیا کے تمام مذاہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ مسٹر شہاب نے مزید بتایا کہ ہالینڈ کے صوفی اسلامی نشانات اور قرآنی آیات استعمال کرتے ہیں اور اپنے اجتماعات میں " درود " بھی پڑھتے ہیں جناب قدرت اللہ شہاب جو وطن واپس آنے کے بعد پہلے سے بہت دبلے نظر آرہے تھے اپنی تقریر میں کہا کہ " مادرِ وطن پاکستان " سے اچھا دودھ کسی ملک میں بھی نہیں ہو سکتا " وہ ہالینڈ میں دودھ کے افراط کا ذکر کر رہے تھے۔ کہ جناب حفیظ جالندھری نے سوال کیا کہ " کیا آپ کو وہاں دودھ نہیں ملتا آپ کافی دبلے نظر آرہے ہیں " اس پر مسٹر شہاب نے کہا کہ غیر ملک کا دودھ مجھے موافق نہیں اس لئے کہ اس میں نہ تو خوشبو ہوتی ہے اور نہ ہی وہ تمام خوبیاں موجود ہیں ، بہرحال انہوں نے بتایا کہ وہ دبلے اس لئے نظر آرہے ہیں کہ انہوں نے " کھانا کم کرکے اپنا وزن ۲۸ پونڈ گھٹا لیا ہے۔

بقیہ :۔ ماں

وئے ننھے چیں چیں کر رہے تھے۔ ماں انھیں چوگا دے رہی تھی ۔۔۔ اس نے بڑی احتیاط سے بچّہ کو لپیٹ کر اپنی گود میں بٹھالا اور چھاتی کھول کر دھیرے سے بچہ کے منہ میں دے دی۔ ہ چمٹ گیا۔ اور اپنے ننھے ننھے گلابی ہونٹوں سے دودھ کو یز چیر کرنے لگا۔ فردوسی کے انگ انگ سے ایک مدھم نغمہ پھوٹا۔ ر فضا میں بکھر گیا ۔۔۔ اس کے چہرے پر نور چھا گیا ۔۔۔ قریب ہی دل ہوا کے خوشگوار جھونکوں سے مست ہو کر جھومنے لگا ۔۔۔ ں ہلکی سورج کی سنہری کرنیں اپنے نور سے کائنات کو جگمگانے لگیں۔ فردوسی تمام دنیا سے بے نیاز بیٹھی ہوئی بچہ کو تک رہی تھی۔ اس کے مقدس چہرے پر نور بکھرا ہوا تھا ۔۔۔ جیسے جنت سے حور زمین پر اتر آئی ہو ۔۔۔ معصوم حور ۔۔۔ مقدس ماں ۔

بقیہ :۔ پشیمانی

معصوم دل تڑپ اٹھا۔ اور غصہ آنِ واحد میں کافور ہو گیا۔

" خرم یہ تم نے کیا کر لیا " وہ بے چین ہو اٹھی ۔

" بھابی میں اندھا ہو گیا تھا " زخشی کی آواز سن کر خرم نے آنکھیں کھول دیں " مجھے معاف کر دیجئے بھابی ، ورنہ میں جان دے دوں گا " خرم نے اپنا سر زمین پر پٹکنا چاہا۔

زخشی نے جلدی سے اس کو اپنے بازوؤں پر لے لیا اور اپنی ساڑی کے پلّو سے اس کی خون آلودہ پیشانی کو صاف کرتی ہوئی بولی ۔

" خرم میرے بھیّا تم بھی مجھے معاف کر دو ، میری وجہ سے تمہیں اتنی تکلیف ہوئی ، اب نہ معلوم تمہارا یہ زخم کب تک بھرے گا " اور زخشی نے اپنے ہونٹ اس کی خون آلودہ پیشانی پر رکھ دیئے ۔

" بھابی میرا زخم تو بھر بھی گیا " خرم نے کہا اور مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیں ۔

خبرنامہ

حیاتِ طیبہ پر شہاب کی کتاب

ہالینڈ میں پاکستان کے سفیر جناب قدرت اللہ شہاب، آنحضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں یہ بات انہوں نے راولپنڈی میں مقامی پریس کلب کے ایک استقبالیہ میں بتائی انہوں نے کہا کہ بعض یورپی ادیبوں نے آنحضرت کی ذاتِ اقدس پر نازیبا اعتراضات کئے ہیں میں ان کا جواب دینے کی کوشش کروں گا انہوں نے بتایا کہ اس مقصد کے لئے مختلف یورپی ممالک سے ضروری مواد اکٹھا کر لیا گیا ہے اور میں اس کا بہ نظر غائر مطالعہ کر رہا ہوں۔ جناب شہاب نے بتایا کہ میری کتاب معترضین کا مسکت جواب ہی نہیں ہوگی بلکہ آنحضرت کی ذات مبارک اور اسلام کی بابت حقیقت پسندانہ جائزہ بھی ہوگا انہوں نے کہا کہ کتاب لکھتے وقت مغرب نشینی، تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم مسلم طلباء کا مستقبل بھی میرے پیشِ نظر رہے گا، کیونکہ آگے چل کر یہ مسلمان تو رہتے ہیں لیکن ایسے تعلیمی اداروں کے سبب ان کے اسلامی عقائد متزلزل ہو جاتے ہیں۔

بنگلہ زبان میں تار

مشرقی پاکستان میں بنگلہ میں تار بھیجنے کا نیا تاریخی نظام رائج ہوگا ڈھاکہ ایسٹرن ٹیلی کمیونیکیشن ریجن کے جنرل منیجر مسٹر نعمان حسین نے اپنے بیان میں بتایا ہے کہ بنگلہ زبان میں تار اور مضمون بھیجے جانے کی منظوری دیدی جائے گی۔ انہوں نے بتایا کہ جس طرح انگریزی میں تار بھیجے جاتے ہیں اسی طرح بنگلہ میں تار بھیجے جائیں گے اور ان پر زیادہ پیسے نہیں لگیں گے۔

بچوں کے ادب پر انعام

پاکستان رائٹرز گلڈ اور ترقی اردو بورڈ کراچی نے مشترکہ طور پر اعلان کیا ہے کہ سال گذشتہ کی طرح اس سال بھی بچوں کے ادب پر ڈھائی ہزار روپے کے انعامات تقسیم کئے جائیں گے۔ مسودات پیش کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ مارچ کی بجائے ۳۰ جون مقرر کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ مسودات طبع زاد ہونے کے علاوہ پیش کرنے والے

کی ملکیت ہونے چاہئیں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ مسودوں پر مصنفوں ہی کا حقِ ملکیت ہوگا۔ اگر گلڈ یا بورڈ نے انہیں شایع بھی کیا تو اس سے پہلے مصنفوں سے ضروری شرائط طے کرلی جائیں گی۔ انعامات کا فیصلہ ایک کمیٹی کرے گی جس کے ناموں کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

انعامات حسب ذیل عنوانات پر موصول ہونے والے بہترین مسودات پر پیش کئے جائیں گے۔ عنوانات درج ذیل ہیں۔

پانچ سے سات سال تک کے بچوں کے لئے۔ کہانیوں کا مجموعہ مبلغ ۲۵۰ روپے کا ایک انعام۔ (۲) نظمیں۔ مبلغ ۲۵۰ روپے کا ایک انعام۔ (کل ۵۰۰ روپے) ——(۲)، سات سے نو سال تک کے بچوں کیلئے تاریخ جغرافیہ، فلکیات، یا حیوانی زندگی سے تعلق رکھنے والے کسی موضوع پر آسان اور دلچسپ کتابیں۔ مبلغ ۵۰۰ روپے کے دو انعام (کل ایک ہزار روپے) ——(۳)، نو سال سے گیارہ سال تک کے بچوں کے لئے:۔ طبیعات، نباتیات، میکانیات یا ریاضی سے تعلق رکھنے والے کسی موضوع پر آسان اور دلچسپ کتاب۔ مبلغ ۵۰۰ روپے کے دو انعام (کل ایک ہزار روپے)

عبدالعزیز خالد کی کتابوں کی فروخت

۱۶ مارچ کو شام ۵ بجے مشہور اردو شاعر عبدالعزیز خالد نے گلڈ انجمن کتاب گھر میں اپنی دستخط شدہ تصانیف فروخت کیں۔ ان کتابوں میں ان کی تازہ ترین تصنیف "فارقلیط" بھی شامل ہے جس پر انہیں آدم جی ادبی انعام ملا ہے۔ یہ کتاب گھر اب تک تیاز فتح پوری، فیض، پروفیسر احمد علی اور ہاجرہ مسرور کی کتابیں فروخت کرچکا ہے۔

اظہارِ خیال کے بہتر ذرائع

مرکزی وزارتِ اطلاعات و نشریات کے سکریٹری مسٹر الطاف گوہر نے زور دیا ہے کہ ملک میں اظہارِ خیال کے ایسے ذرائع وضع کئے جائیں جن کی مدد سے مختلف علاقے کے لوگ ایک دوسرے کو سمجھ سکیں موصوف کل پاکستان انجمن ادبی رسائل کی پانچویں سالانہ کانفرنس میں صدارتی تقریر کر رہے تھے انھوں نے ملک کے ادیبوں سے کہا کہ اپنا وقت زبانوں کی ترقی پر صرف کریں تاکہ اظہارِ خیال کے ذرائع ہر فرد کے لئے قابلِ استعمال ہو جائیں۔ مسٹر الطاف گوہر نے کہا کہ جب تک ہم اپنی ملکی زبانوں کو ترقی نہیں دیں گے تب تک مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے کو غلط سمجھتے رہیں گے۔ قومی زبان سیکھنا ہر شخص کا قومی فرض ہے اور اس کی بنیاد محض علمی ہو سکتی ہے انھوں نے تعلیمی اور جذباتی وجوہات کی بناء پر ملک کیلئے ایک مشترک زبان کی تجویز کو ممکن قرار دیا۔ مسٹر گوہر نے کانفرنس کے شرکاء کو زبانوں کے بنیادی مسائل حل کرنے کی تلقین کی اور تجویز پیش کی کہ تمام رسائل جو کسی ایک قومی زبان میں شائع ہو۔ تو ہو، انہیں چاہیئے کہ دوسری زبان میں اسکا ترجمہ بھی شائع کریں اور دونوں کی ایک ساتھ جلد بندھوا کر فروخت کریں۔ اس طرح نہ صرف رسائل کی اشاعت میں اضافہ ہوگا بلکہ قومی یکجہتی کا مشکل کام آسان ہوگا۔ سکریٹری وزارت اطلاعات نے شرکاء کانفرنس کو یقین دلایا کہ حکومت زبانوں کی ترقی میں گہری دلچسپی رکھتی ہے اور اگر کانفرنس نے اچھی تجاویز پیش کیں تو ان پر ضرور غور کیا جائے گا انہوں نے انکشاف کیا کہ مجھے چین میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کیونکہ اول تو اردو میں ترجمہ موجود تھے اور دوسرے اردو جاننے والے بھی موجود تھے ہمارے ہاں زبانوں میں کچھ آپس کے اختلافات ہیں جن کی وجہ سے انگریزی پھول پھل رہی ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مادری زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان میں اعلیٰ درجہ کا تخلیقی کام کبھی نہیں ہو سکتا۔

انجمن ادبی رسائل کے صدر مولانا رزاق الخیری نے اپنی تقریر میں حکومت سے کہا کہ ادبی رسائل سے تعاون کرے تاکہ وہ زبانوں کی ترقی کا کام جاری رکھ سکیں۔

انھوں نے بتایا کہ اکثر ادبی رسائل کو مالی مشکلات کا سامنا ہے جنکی وجہ سے اکثر اوقات وہ زیادہ عرصہ نہیں چل پاتے مولانا نے تجویز پیش کی کہ سرکاری اشتہارات کا دس فیصدی حصہ ادبی رسائل کے لئے مخصوص کر دیا جانا چاہیئے۔

شاہ نیپال کے کلام کا اردو ترجمہ

شاہ نیپال مہاراج مہندر ویر بکرم شاہ دیو کا نیپالی کلام اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے اور اسے ملکۂ نیپال کے نام سے معنون کرنے کی اجازت بھی حاصل کر لی گئی ہے۔

شاہ نیپال نیپالی زبان کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں۔ ان کی تقریباً ساڑھے تین درجن نیپالی نظموں کا مجموعہ "اسی کالاگی" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ جو نیپالی یونی ورسٹی کے ایم۔ اے کے نصاب میں بھی داخل ہے۔

ان نیپالی نظموں کا منظوم ہندی ترجمہ "اسی کے لئے" کے نام سے اس سے قبل شائع ہو چکا ہے اور منظوم انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

میر اکاڈمی کے صدر مسٹر مقبول احمد لاری نے شاہ نیپال سے ان کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ شائع کرنے کی اجازت حاصل کر لی ہے۔

ادبی اجتماع

۱۴ اپریل ۱۹۷۵ء کو دن کے دس بجے دہلی پبلک لائبریری دہلی میں ایک ادبی و صحافی حضرات کا اجتماع جناب گوپی ناتھ امن لکھنوی کی زیر صدارت ہوا جس میں دہلی و بیرون دہلی کے ادیبوں اور صحافی حضرات نے شرکت کی۔ قابل ذکر نام یہ ہیں :۔ جناب قاضی عبدالودود صاحب، جناب امیر حسین صاحب عابدی دہلی یونی ورسٹی۔ جناب مالک رام صاحب ایم۔ اے۔ جناب فوق کریمی صاحب ایڈیٹر ترجمان علی گڈھ۔ جناب اظہر ودود صاحب دہلی کالج۔ جناب تنویر علوی صاحب دہلی کالج۔ جناب شوکت فہمی صاحب ایڈیٹر دین دنیا دہلی۔ جناب علی اکبر صاحب ترمذی نیشنل آرکائیوز نیو دہلی — جناب حافظ علی بہادر خاں صاحب ایڈیٹر دور جدید دہلی۔ جناب منور لکھنوی صاحب۔ جناب ڈاکٹر شیدھ ویر سنگھ۔ جناب رام منوہر لوہیا ممبر پارلیمنٹ۔ جناب للا رام صاحب ایڈیٹر سوراجیہ الہ آباد ۱۹۰۷ء۔ انور دہلوی صاحب مینیجر شمع بکڈپو۔ جناب فتح چند صاحب نسیم دہلوی۔ جناب سید بدرالدجیٰ صاحب ممبر پارلیمنٹ۔ پنڈت ہر سروپ شرما ایڈیٹر متحدہ محاذ دہلی۔ جناب دھرم پال گپتا وفا دہلوی ایڈیٹر روزنامہ تیج دہلی۔ جناب جگن ناتھ آزاد صاحب۔ جناب عبدالرحمٰن صاحب سابق ممبر پارلیمنٹ کشمیر۔ جناب شمبھو ناتھ چوپڑا ایڈیٹر سوراج دہلی۔ جناب مولانا امداد صابری صاحب۔ جناب ا[illegible] آر نائر صاحب پریس انفارمیشن آفیسر نیو دہلی۔ جناب آل احمد سرور جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند۔ جناب آغا محمد باقر صاحب نبیرہ مولانا محمد حسین آزاد۔ جناب ظفر قریشی صاحب ایڈیٹر ماہ نو کراچی۔ جناب شمیم جاوید صاحب ایڈیٹر نکر و دنیا کراچی۔ جناب دیوان سنگھ صاحب مفتون ایڈیٹر ریاست دہرہ دون۔ جناب ملا واحدی صاحب ایڈیٹر نظام المشائخ کراچی۔ جناب ابرار الدین صاحب صدیقی ایڈیٹر [illegible] حیدرآباد دکن۔ جناب اعجاز صدیقی صاحب ایڈیٹر شاعر بمبئی۔ جناب شاہ مقبول [illegible] پروفیسر مولانا آزاد کالج کلکتہ کے پیغامات سنائے۔

جناب مالک رام صاحب نے افتتاحی تقریر میں فرمایا اس جلاس کے دوگونہ مقصد ہیں ایک تو یہ کہ اہل علم حضرات اخبارات کی اہمیت کا اندازہ لگائیں ان میں بے پناہ علمی خزانہ ہے۔ ان سے ہر موضوع پر مستند تاریخی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اس پر توجہ دینا انتہائی ضروری ہے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مولانا امداد صابری صاحب نے اب تک تاریخ صحافت اردو کی تین جلدیں ۱۸۰۰ء کے اخبارات

ابھی ان کو سنہ ۱۹۰۱ سے ۱۸۷۵ء تک اخبارات کی تین جلدیں اور مرتب کرنی ہیں ۔ اہلِ قلم اور صحافی حضرات کو چاہیئے کہ وہ صابری صاحب کا اس سلسلہ میں ہاتھ بٹائیں اور معلومات فراہم کریں ۔

جناب آمن لکھنوی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ قدیم وجدید اخبارات میں ادبی، تاریخی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور اصلاحی معلومات بے حد ہیں ۔ صابری صاحب نے اس پر توجہ دلاکر بہت بڑا احسان کیا ہے انہوں نے جو قدیم اخبارات کی نمائش کی ہے اور تاریخ صحافت اردو کی تین جلدیں مرتب کی ہیں اس سے ان کی محنت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے کتنی جانفشانی کی ہوگی ۔ امن صاحب نے یقین دلایا کہ میں تاریخ صحافت اردو کے مرتب کرنے میں ہر ممکن مدد دوں گا ۔

جناب تنویر علوی صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس میں آپ نے خبر رسانی اور اس کی اہمیت اور صابری صاحب کی تاریخ صحافت اردو پر روشنی ڈالی ۔

اس کے بعد مولانا امداد صابری صاحب نے ۱۸۵۷ء تک جنگ آزادی تک کے چند حریت پسند اخبارات کے زیر عنوان ایک تحقیقی مقالہ پڑھا ۔ جلسہ گاہ کے باہر اردو کے ۱۲۵ سوا سو کے قریب قدیم اخبار ۱۸۲۵ء سے لیکر سنہ ۱۹۰۰ء تک کی نمائش ہوئی جسکا اہتمام مولانا امداد صابری صاحب نے کیا تھا جن کے پاس یہ بیش بہا خزانہ ہے ۔

عربی زبان کی قدیم ترین لغت

برطانوی عجائب خانے کی طبع شدہ مشرقی کتابوں کے محکمہ نے عربی زبان کی ایک قدیم لغت خریدی ہے ۔ جسے اسمعیل بن عناد نے مرتب کیا تھا اس کا نام "الصاحب" ہے اور یہ اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے اس کا مصنف ۹۵۵ء میں فوت ہوا تھا ۔ وہ شاعر، مدبر اور ماہر لسانیات تھا اس لغت کی نقل تبریز کے محمد ابن محمد نے ۱۳۵۹ء میں کی تھی اس لغت کے سرورق اور دوسرے ابواب کے صفحات کو رنگوں سے مزین کیا گیا ہے ۔ عجائب خانے کے ایک ترجمان نے کہا کہ یہ لغت بڑی اچھی حالت میں ہے ترجمان نے یہ نہیں بتایا کہ عجائب خانے نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے ۔ لیکن یہ معلوم ہوا ہے کہ اب تک یہ کتاب ایران میں تھی ۔

ناول کی تاریخ وتنقید

"ناول کی تاریخ وتنقید" کا ایک ترمیم شدہ و اضافہ شدہ ایڈیشن شائع ہو رہا ہے چونکہ یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی تھی اس لئے اس نئے ایڈیشن میں گذشتہ بیس برس کے اردو ناولوں اور ان کے لکھنے والوں کا جائزہ لینا ضروری ہے ۔ ناشرین اور مصنفین سے استدعا کی گئی ہے کہ وہ اس مدت میں شائع شدہ اپنے نئے ناولوں کی ایک ایک جلد یا کم از کم اپنے مطبوعہ ناولوں کی ایک مکمل فہرست حسب ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں گے تاکہ ان کا اس باب میں ذکر کیا جا سکے ۔

علی عباس حسینی
۱۰۵ ۔ غوث گنج ، وزیر گنج ، لکھنؤ

پیکنگ ریڈیو سے اُردو پروگرام

"ہمیں فخر ہے کہ ہم پاک چین ثقافتی تعلقات بڑھانے کے لئے کوششیں کرتے ہیں" یہ بات پیکنگ یونی ورسٹی کے اردو زبان کے گریجویٹوں نے کہی جو پیکنگ میں اردو زبان کے پریس کے لئے کام کر رہے ہیں ۔ انھوں نے اردو کی ادبی سیاسی اور دوسری کتابوں کا چینی زبان میں اور چینی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے ان گریجویٹوں میں جو پیکنگ ریڈیو سے متعلق ہیں وہ پیکنگ ریڈیو سے پاکستان کے سننے والوں

کے لئے ایک اردو پروگرام شروع کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اردو زبان کے طلباء کے دو گروپ پیکنگ یونی ورسٹی سے اردو زبان کا پانچ سالہ کورس مکمل کر چکے ہیں اور تیسرا گروپ اب دوسرے سال میں ہے ۔ یونی ورسٹی کا مشرقی زبانوں کا شعبہ ایک درجن مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتا ہے اس شعبہ نے ۱۹۵۴ء میں اردو زبان کی تعلیم شروع کی تھی۔ پہلے سال کے دوران تلفظ گرامر اور گانے ، نظمیں اور کہانیاں پڑھائی جاتی ہیں ۔ دوسرے سال کے دوران جدید ادبی رسائل پڑھائے جاتے ہیں ۔ اور بقیہ تین برسوں کے دوران ترجمہ سکھایا جاتا ہے اور اعلیٰ ادبی تعلیم دی جاتی ہے ۔

یوم غالب

بزم اردو ایبٹ آباد کے زیر اہتمام یوم غالب نہایت تزک و احتشام سے منایا گیا ۔ اس ادبی محفل کی صدارت جناب نفیس الدین صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد نے کی ۔ کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا ۔ بعد ازاں جناب پروفیسر صادق زاہد صاحب ناظم اعلیٰ بزم اردو نے ایک مختصر سے تعارف میں مرزا غالب کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا ” کہ آج کی دنیا میں غالب ایک شاعر کے روپ میں ایک ” مفکر حیات ، ایک مصور جذبات ، ایک نقادِ ادب ، ایک نباضِ فطرت ، ایک ماہر نفسیات ، اور ایک حکیم مستقبل کی حیثیت سے شہرت عام و بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں ۔ اور اسی حقیقت میں غالب کی بلند عظمتی کا راز مضمر ہے ۔

اس کے بعد جناب پروفیسر رشید مرزا صاحب نے اپنا مقالہ بعنوان ” دعوئ غالب “ پیش کرتے ہوئے مرزا غالب کے اس دعویٰ کو تسلیم کیا کہ ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

انہوں نے غالب کے اس دعویٰ کی صداقت میں اس دور کے حالات اور غالب کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ” یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر مرزا غالب اردو غزل کو زلف یار میں الجھنے سے نہ بچاتے تو غزل آج تخیل اور انسانی جذبات و احساسات کی صداقت سے محروم رہ جاتی انہوں نے آگے چل کر یہ فرمایا اور ثابت کیا کہ میر روتے ہیں ۔ انیس رلاتے ہیں ، سودا قہقہہ لگاتے ہیں اور غالب مسکراتے ہیں ۔

اس مقالے کے بعد جناب شبیر نیازی نے مرزا غالب کے حضور منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا ۔ پھر صلاح الدین صاحب نے غالب کی غزل وجد آفریں انداز میں سامعین کے سامنے پیش کی ۔ جس کا مطلع ہے ؎

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے
حورانِ خلد میں تیری صورت مگر ملے

بعد ازاں پروفیسر سید حسین شاہ صاحب فدا صدر بزم اردو نے غالب کے حضور ایک منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا ۔

” آئین اکبری “ کا نیا نسخہ

مغربی جرمنی کی لائبریریوں میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کافی قلمی نسخے ہیں ۔ ان میں قابل ذکر ابو الفضل کی ” آئین اکبری “ ہے اس پر اکبر و جہانگیر کی تصویریں بھی ہیں ۔ ایک تصویر بیربل کی بھی ہے ۔

سودا پر تحقیق

ایک پاکستانی اسکالر لندن یونی ورسٹی میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رہنمائی میں رفیع الدین سودا کی کلیات پر کام کر رہے ہیں ۔ اس کام میں انہیں مزید تین سال لگیں گے ۔

ملکہ نور جہاں کی جائے پیدائش

صوبائی حکومت نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں ایک

ابھی ان کو سنہ ۱۹۰۱ء سے سنہ ۱۹۷۵ء تک اخبارات کی تین جلدیں اور مرتب کرنی ہیں ۔ اہل قلم اور صحافی حضرات کو چاہیئے کہ وہ صابری صاحب کا اس سلسلہ میں ہاتھ بٹائیں اور معلومات فراہم کریں ۔

جناب آمن لکھنوی نے صدارتی تقریر میں کہا کہ قدیم وجدید اخبارات میں ادبی، تاریخی، سیاسی، سماجی، تعلیمی اور اصلاحی معلومات بے حد ہیں ۔ صابری صاحب نے اس پر توجہ دلاکر بہت بڑا احسان کیا ہے انہوں نے جو قدیم اخبارات کی نمائش کی ہے اور تاریخ صحافت اردو کی تین جلدیں مرتب کی ہیں اس سے ان کی محنت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کتنی جانفشانی کی ہوگی ۔ امن صاحب نے یقین دلایا کہ میں تاریخ صحافت اردو کے مرتب کرنے میں ہر ممکن مدد دوں گا ۔

جناب تنویر علوی صاحب نے ایک مقالہ پڑھا جس میں آپ نے خبر رسانی اور اس کی اہمیت اور صابری صاحب کی تاریخ صحافت اردو پر روشنی ڈالی ۔ اس کے بعد مولانا امداد صابری صاحب نے سنہ ۱۸۵۷ء تک جنگ آزادی تک کے چند حریت پسند اخبارات کے زیر عنوان ایک تحقیقی مقالہ پڑھا ۔ جلسہ گاہ کے باہر اردو کے ۱۲۵ سوا سو کے قریب قدیم اخبار سنہ ۱۸۲۵ء سے لیکر سنہ ۱۹۰۰ء تک کی نمائش ہوئی جسکا اہتمام مولانا امداد صابری صاحب نے کیا تھا جن کے پاس یہ بیش بہا خزانہ ہے ۔

عربی زبان کی قدیم ترین لغت

برطانوی عجائب خانے کی طبع شدہ مشرقی کتابوں کے محکمہ نے عربی زبان کی ایک قدیم لغت [illegible]یدی ہے ۔ جسے اسمعیل بن عباد نے مرتب کیا تھا اس کا نام "الصاحب" ہے اور یہ اپنی نوعیت کی واحد لغت ہے اس کا مصنف سنہ ۹۵۵ء میں فوت ہوا تھا ۔ وہ شاعر، مدبر اور ماہر لسانیات تھا اس لغت کی نقل تبریز کے محمد ابن محمد نے سنہ ۱۳۵۹ء میں کی تھی اس لغت کے سرورق اور دوسرے ابواب کے صفحات کو رنگوں سے مزین کیا گیا ہے ۔ عجائب خانے کے ایک ترجمان نے کہا کہ یہ لغت بڑی اچھی حالت میں ہے ترجمان نے یہ نہیں بتایا کہ عجائب خانے نے اس کی کیا قیمت ادا کی ہے ۔ لیکن یہ معلوم ہوا ہے کہ اب تک یہ کتاب ایران میں تھی ۔

ناول کی تاریخ وتنقید

"ناول کی تاریخ وتنقید" کا ایک ترمیم شدہ واضافہ شدہ ایڈیشن شائع ہورہا ہے چونکہ یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں لکھی گئی تھی اس لئے اس نئے ایڈیشن میں گذشتہ بیس برس کے اردو ناولوں اور ان کے لکھنے والوں کا جائزہ لینا ضروری ہے ۔ ناشرین اور مصنفین سے التماس کی گئی ہے کہ وہ اس مدت میں شائع شدہ اپنے نئے ناولوں کی ایک ایک جلد یا کم از کم اپنے مطبوعہ ناولوں کی ایک مکمل فہرست حسب ذیل پتہ پر ارسال فرمائیں گے تاکہ ان کا اس باب میں ذکر کیا جاسکے ۔

علی عباس حسینی
۱۰۵ ۔ غوث گنج ، وزیر گنج ، لکھنؤ

پیکنگ ریڈیو سے اردو پروگرام

ہمیں فخر ہے کہ ہم پاک چین ثقافتی تعلقات بڑھانے کے لئے کوششیں کرتے ہیں یہ بات پیکنگ یونی ورسٹی کے اردو زبان کے گریجویٹوں نے کہی جو پیکنگ میں اردو زبان کے پریس کے لئے کام کر رہے ہیں ۔ انھوں نے اردو کی ادبی سیاسی اور دوسری کتابوں کا چینی زبان میں اور چینی کا اردو میں ترجمہ کیا ہے ان گریجویٹوں میں جو پیکنگ ریڈیو سے متعلق ہیں وہ پیکنگ ریڈیو سے پاکستان کے سننے والوں

کے لئے ایک اردو پروگرام شروع کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں اردو زبان کے طلباء کے دو گروپ پیکنگ یونی ورسٹی سے اردو زبان کا پانچ سالہ کورس مکمل کر چکے ہیں اور تیسرا گروپ اب دوسرے سال میں ہے۔ یونی ورسٹی کا مشرقی زبانوں کا شعبہ ایک درجن مشرقی زبانوں کی تعلیم دیتا ہے اس شعبہ نے ۱۹۵۴ء میں اردو زبان کی تعلیم شروع کی تھی۔ پہلے سال کے دوران تلفظ گرامر اور گانے، نظمیں اور کہانیاں پڑھائی جاتی ہیں۔ دوسرے سال کے دوران جدید ادبی رسائل پڑھائے جاتے ہیں۔ اور بقیہ تین برسوں کے دوران ترجمہ سکھایا جاتا ہے اور اعلیٰ ادبی تعلیم دی جاتی ہے۔

یوم غالب

بزم اردو ایبٹ آباد کے زیر اہتمام یوم غالب نہایت تزک و احتشام سے منایا گیا۔ اس ادبی محفل کی صدارت جناب نفیس الدین صاحب پرنسپل گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد نے کی، کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا بعد ازاں جناب پروفیسر صادق زاہد صاحب ناظم اعلیٰ بزم اردو نے ایک مختصر سے تعارف میں مرزا غالب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فرمایا "کہ آج کی دنیا میں غالب ایک شاعر کے روپ میں ایک "مفکر حیات، ایک مصور جذبات" ایک نقاد ادب، ایک نباض فطرت، ایک ماہر نفسیات، اور ایک حکیم مستقبل کی حیثیت سے شہرت عام و بقائے دوام حاصل کر چکے ہیں۔ اور یہی حقیقت میں غالب کی بلند عظمتی کا راز مضمر ہے۔

اس کے بعد جناب پروفیسر رشید مرزا صاحب نے اپنا مقالہ بعنوان "دعویٰ غالب" پیش کرتے ہوئے مرزا غالب کے اس دعویٰ کو تسلیم کیا کہ ؎

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعر نغز گوئے خوش گفتار

انہوں نے غالب کے اس دعویٰ کی صداقت میں اس دور کے حالات اور غالب کی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر مرزا غالب اردو غزل کو زلف یار میں الجھنے سے نہ بچاتے تو غزل آج تخیل اور انسانی جذبات و احساسات کی صداقت سے محروم رہ جاتی انہوں نے آگے چل کر یہ فرمایا اور ثابت کیا کہ میر روتے ہیں۔ انیس رلاتے ہیں، سودا قہقہہ لگاتے ہیں اور غالب مسکراتے ہیں۔

اس مقالے کے بعد جناب شبیر نیازی نے مرزا غالب کے حضور منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ پھر صلاح الدین صاحب نے غالب کی غزل وجد آفریں انداز میں سامعین کے سامنے پیش کی۔ جس کا مطلع ہے ؎

تسکین کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے
حوران خلد میں تیری صورت مگر ملے

بعد ازاں پروفیسر سید حسین شاہ صاحب فدا صدر بزم اردو نے غالب کے حضور ایک منظوم نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔

"آئین اکبری" کا نیا نسخہ

مغربی جرمنی کی لائبریریوں میں عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے بارے میں کافی قلمی نسخے ہیں۔ ان میں قابل ذکر ابو الفضل کی "آئین اکبری" ہے اس پر اکبر و جہانگیر کی تصویریں بھی ہیں۔ ایک تصویر بیربل کی بھی ہے۔

سودا پر تحقیق

ایک پاکستانی اسکالر لندن یونی ورسٹی میں ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رہنمائی میں رفیع الدین سودا کی کلیات پر کام کر رہے ہیں۔ اس کام میں انہیں مزید تین سال لگیں گے۔

ملکہ نورجہاں کی جائے پیدائش

صوبائی حکومت نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں ایک

انتہائی دلچسپ انکشاف کیا گیا ہے وہ یہ کہ شہنشاہ جہانگیر کی ملکہ نورجہاں کوئٹہ ڈویژن کے ضلع لورالائی کے قصبے ریٹاکاری میں پیدا ہوئی تھیں اس کتابچہ میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی ہے کہ مذکورہ مقام پر مشہور مغل ملکہ کے نام کی تختی لگا دی جائے تاکہ تحقیقاتی کام کرنے والوں کو سہولت رہے واضح رہے کہ تاریخ میں یہ درج ہے کہ نورجہاں کے والدین ایران سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ لینے کی غرض سے دہلی جا رہے تھے کہ راستے میں ملکہ نورجہاں پیدا ہوئیں اور وہ جگہ ایران کا کوئی حصہ بتائی جاتی ہے۔

فحش لٹریچر کا سدِ باب

مرکزی حکومت نے صوبائی حکومت کو ہدایت کی ہے کہ وہ ملک کے نوجوانوں کو اخلاقی انحطاط میں مبتلا کرنے والے فحش لٹریچر اور تصاویر کی اشاعت کی روک تھام کرے ایک مرکزی ذریعے بتایا کہ صوبائی حکومت اس سلسلہ میں پہلے پہلے ہی اقدام عمل میں لا چکی ہے۔ مرکزی محکمۂ اطلاعات اور تعلقات عامہ کی ایجنسیاں اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات اور بعض خبروں کی اخلاق سوز تصاویر کی اشاعت کو روکنے کیلئے سرگرمی سے مصروف ہیں۔

غالب کی یاد

انجمن اردوئے معلیٰ شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ۲۲ مارچ ۱۹۶۵ء کو گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی اسٹاف لاؤنج فیکلٹی آف آرٹس میں غالب کی یاد منائی جلسہ کی صدارت پروفیسر آل احمد سرور صدر شعبہ اردو نے کی۔ سرور صاحب نے صدارتی تقریر میں غالب کی گرمیٔ نشاطِ تصور، کا ذکر کیا اور اس پہلو سے غالب کے مطالعہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ سرور صاحب کی تقریر کے بعد ڈاکٹر منیب الرحمٰن صاحب نے غالب پر اقبال کی نظم، اور راہی معصوم رضا صاحب نے غالب پر ایک مختصر مقالہ پڑھا۔ جناب مجتبیٰ علوی نے غالب کی دو غزلیں ترنم سے پڑھیں۔ اور موسیقار بلدیو مرزا نے دو غزلیں گائیں۔ ڈاکٹر منیب الرحمٰن صاحب نے غالب کے چیدہ چیدہ اشعار اور جناب خواجہ مسعود علی ذوقی صاحب نے غالب کے منتخب خطوط ڈرامائی لب و لہجہ میں پڑھکر سنائے۔

غالب کی یاد کے سلسلے میں سب سے انوکھی اور دلچسپ وہ تنقیدی آراء تھیں جو غالب کی ایک غزل ع

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی

پر علی گڑھ کے دو صاحبِ ذوق حضرات نے دی تھیں آراء دینے والوں کے نام پوشیدہ رکھے گئے تھے۔ غالب کی غزل اور اس پر تنقیدی آراء جناب وحید اختر صاحب نے پڑھ کر سنائیں۔

ازبک زبان میں ٹیگور کی تخلیقات

ازبکستان کے کتاب گھروں میں ہندوستانی ادب کے شاہکار رابندرناتھ ٹیگور کی منتخب تصانیف کی چھٹی جلد چھپ چکی ہے۔ گذشتہ جلدوں میں ازبک عوام کو ٹیگور کے مشہور ناولوں، افسانوں اور نظموں سے روشناس کرایا گیا تھا اور چھٹی جلد میں ان کے ڈرامے شائع ہوئے ہیں ٹیگور کا نام ازبکستان میں بہت مقبول ہے۔ ان کی پہلی کتاب ازبکستانی زبان میں ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی اور چند مہینے کے اندر اندر سارا ایڈیشن فروخت ہو گیا تھا۔ ایک سال بعد تاشقند اشاعت گھر نے ازبک زبان میں ٹیگور کی منتخب تصانیف اہتمام سے پیش کیں۔ ہر کتاب کی تعداد اشاعت ۱۵ ہزار تھی۔ تاشقند اشاعت گھر نے غیر ملکی ادب کے شعبہ کے چیئرمین اعظم میر حمیدوف نے (نووستی) اے۔ پی۔ این کے نامہ نگار کو بتایا، ہم اس سال یہ ایڈیشن ختم کرلیں گے۔ ساتویں اور آٹھویں جلدیں زیر طبع ہیں۔ ان میں رابندرناتھ ٹیگور کی نظمیں، مقالات اور مشاہدات اور خطوط شامل ہیں۔

gd. S. No. 2410 Monthly Ham Qalam. April 1965

انٹرنیشنل پریس، کراچی